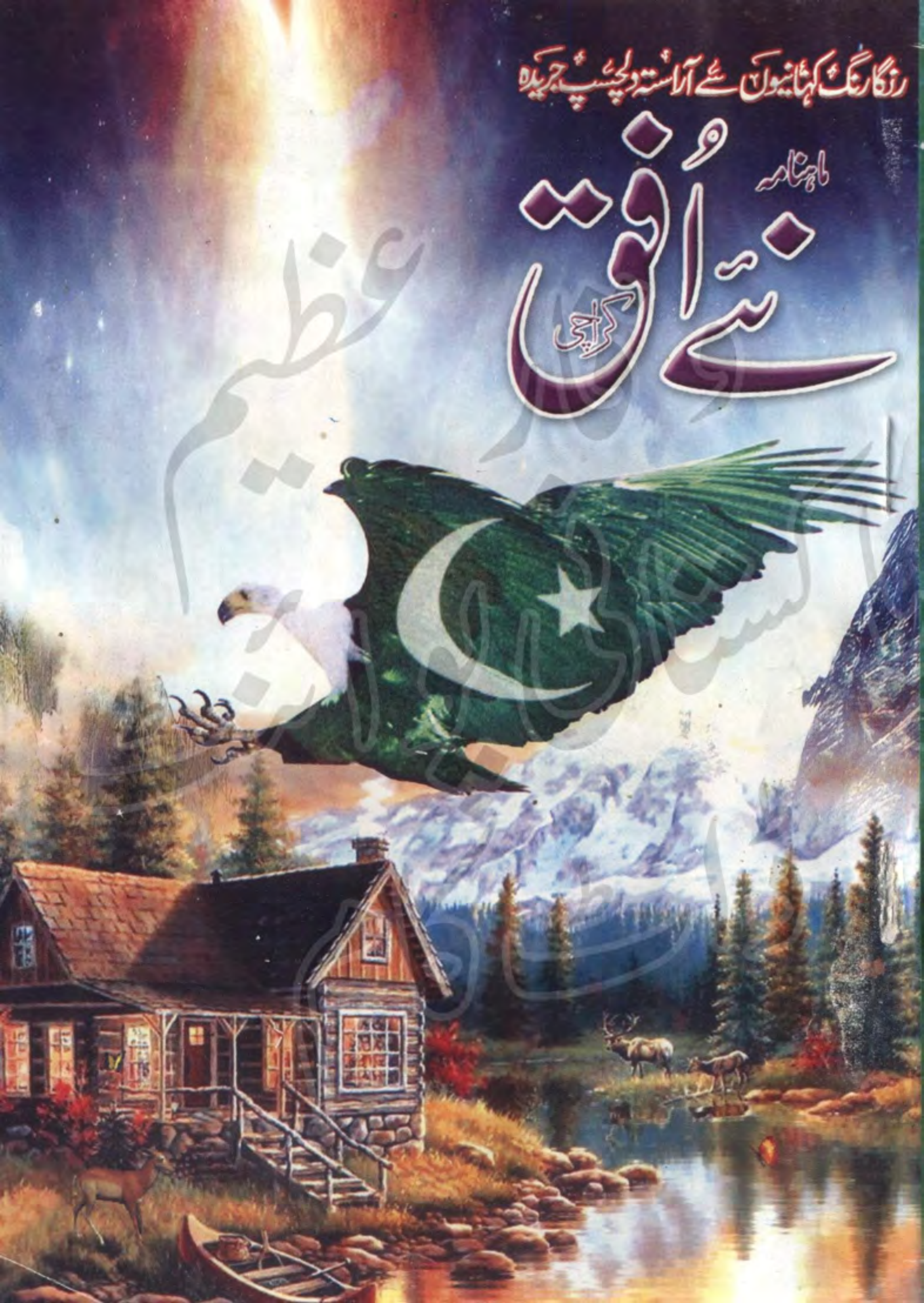

رنگارنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے افق
کراچی

ابتدائیہ

عنوان	مصنف	صفحہ
دستک	مشتاق احمد قریشی	8
گفتگو	عمران احمد	10
اقرأ	طاہر قریشی	19

سچی کہانیاں

عنوان	مصنف	صفحہ
رادھیکا	اسعد علی	117
مکافات عمل	بشیر احمد بھٹی	133
کفارہ	محمد سلیم اختر	137
احساس	خلیل جبار	187
انتقام	ریاض بٹ	197

ناول

عنوان	مصنف	صفحہ
درندہ	خورشید پیرزادہ	21

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

مغرب سے انتخاب

عنوان	مصنف	صفحہ
جدائی	شکیل صدیقی	69
احمق	حسن اختر پریم	73

مستقل سلسلے

عنوان	مصنف	صفحہ
گردش	شہناز بانو	77
قلندر ذات	امجد جاوید	145
جگت سنگھ	شمیم نوید	219
روحانی مسائل	حافظ شبیر احمد	207
خوشبوئے سخن	عمر اسرار	211
ذوق آگہی	عفان احمد	215

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبرز 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 یکجا از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل Info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

اب کے مارے تو جانو......؟

برف خانے میں پہلے چمار ہوا کرتے تھے۔ان کی کسی غلطی پر یا کام نہ کرنے پر یا بلا جواز ہی برف خانے کے مالک یا برف کے سوداگر انہیں جوتے سے مارا کرتے تھے وہ چونکہ کمی کمینوں میں شمار ہوتے تھے۔اپنے سے اعلیٰ شخصیات پر وہ کوئی جوابی کارروائی تو نہیں کر سکتے تھے لیکن اپنے غصے کا اظہار یہ کہہ کر کرلیا کرتے تھے کہ اب کے مارے تو جانوں یعنی اب کے تو میں نے تیری مار کو برداشت کرلیا لیکن اگر پھر دوبارہ مجھے مارا تو میں بھی جوابی کارروائی کر سکتا ہوں۔یعنی اگر میں نے جواباً تجھ پر ہاتھ اٹھایا تو جو تیری بے عزتی ہوگی وہ اس سے کہیں زیادہ ہوگی جو تو نے میری کی ہے۔جوتے سے مار مار کر۔

پاکستانی حکمرانوں کا بھی کچھ ایسا ہی عالم ہے کہ امریکہ سے پٹتے جاتے ہیں اور پیچھے ہٹتے جاتے ہیں۔امریکہ بہادر جو اور جیسا جی میں آتا ہے کہتا کرتا چلا جاتا ہے۔کوئی اسے جواب دینے والا ایسی ہمت ہی نہیں کر سکتا کہ امریکیوں کو منہ توڑ جواب دے سکے اس بے چارے حکمران کو اپنی کرسی جو عزیز ہوتی ہے۔ہمارے حکمرانوں کو تو یہ خوف ہی مارے ڈالتا ہے کہ کہیں کوئی امریکی صاحب اقتدار کسی طرح سے ناراض نہ ہو جائے۔وہ چاہے کچھ ہی کہتے اور کرتے رہیں ہمارے حکمرانوں کے سر تسلیم خم ہی رہتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ برف خانے کے چمار کی طرح ٹھنڈی بڑکیں ہی مار کر گردن جھکا کر اپنے عوام اپنی قوم کو بے وقوف بنانے اور یہ دکھانے کے لیے کہ ہم خاموش نہیں رہے۔ہم نے امریکیوں کا نہیں اپنا ہی منہ توڑ جواب دیا ہے۔

سو جوتے سو پیاز کے محاورے کی طرح ہمارے حکمران چاہے وہ مارشل لائی حکمران ہوں یا جمہوری حکمران سب کے سب امریکی حمام میں ننگے ہی نظر آتے ہیں۔کیونکہ چاہے عوامی نمائندے ہوں یا عسکری نمائندے وہ حکمرانی و اقتدار میں آتے تو امریکی آشیرواد سے ہی ہیں اس لیے وہ امریکہ کی اطاعت وفرمانبرداری میں بچھے جاتے ہیں۔قوم کا حشر چاہے جو کچھ بھی ہوتا رہے ان کی کرسی اقتدار پر کسی طرح کی کوئی آنچ نہ آئے پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ ہر نیا آنے والا اپنے پیش رو حکمرانوں سے کچھ نہ کچھ سبق حاصل کر کے ہی آتا ہے وہ یہ دیکھ اور سمجھ لیتا ہے کہ میرے آنے اور مجھ سے پہلے جانے والے کو کیوں ہٹایا گیا ہے۔وہ وہیں سے اسٹارٹ لیتا ہے جہاں سے اس کے پیش رو نے اس کے لیے کرسی چھوڑی تھی۔وہ تمام احتیاطیں اور ہدایات جو اسے ملتیں ہیں ان پر وہ اپنے پیش رو سے زیادہ عمل درآمد کا نہ صرف عہد کرتا ہے بلکہ اطاعت وفرمانبرداری کے میدان میں وہ اپنے سابقہ ساتھیوں یا حریفوں سے کہیں زیادہ سر تسلیم خم رکھتا ہے اور اپنے مائی باپ کے احکام پر آنکھیں بند کر کے آتش نمرود (امریکہ) میں کود پڑتا ہے۔

امریکہ، اسرائیل اور بھارت کے ساتھ ساتھ یورپی دنیا اور خود افغانستان کے حکمران جو امریکی غلامی میں نہائے ہوئے ہیں یہ کسی طرح نہیں چاہتے کہ پاکستان میں امن وامان قائم ہو اور پاکستان کو کسی بھی طرح کا سکھ چین نصیب ہو۔پاکستان چونکہ ایک اسلامی مملکت ہے اور دوسرے یہ کہ ان تمام حریفوں کی بدنصیبی اور مسلمانانِ پاکستان کی خوش نصیبی سے پاکستان ایک جوہری مملکت بھی بن چکا ہے۔پاکستان کی جوہری قوت دشمنانِ اسلام کو ایک آنکھ نہیں بھا رہی۔پاکستان کی جوہری قوت کا کانٹا تمام غیر مسلم قوتوں خصوصاً امریکہ بھارت اسرائیل کے حلق میں اٹک کر رہ گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ امریکہ پاکستان سے دوستی اور سرپرستی کی آڑ میں وہ ہیبت ناک کھیل کھیل رہا ہے کہ پاکستانی حکمرانوں کو کچھ بجھائی نہیں دے رہا ان کی آنکھیں امریکہ نے اقتدار کی چمک سے خیرہ کر رکھی ہیں ہمارے حکمران یہ بات خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ امریکہ بہادر کو ناراض کر کے وہ ایک دن تو کیا ایک گھنٹے بھی اقتدار میں نہیں رہ سکتے شاید یہی وجہ ہے کہ حکمرانوں کے چوہے امریکی بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند رکھتے ہیں۔

ہمارے حکمرانوں کو یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آتی چاہے وہ مارشل لائی حکمران ہوں جن پر آمریت کی تہمت لگتی ہے یا جمہوری حکمران ہوں کہ پاکستان ایک خودمختار اور آزاد ملک ہے۔اس کے عوام کے پاس بھی دل ودماغ ہے وہ اچھے برے کی تمیز کر سکتے ہیں وہ اچھے کو اچھا اور برے کو برا ہی سمجھتے ہیں ان کی خاموشی ان کے سر تسلیم خم کی نہیں بلکہ کسی طوفان بلکہ بڑے طوفان کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی ہے۔لیکن ہمارے حکمران جن کی رگوں میں سرخ خون کی جگہ امریکی سازشوں کا نمک دوڑ رہا ہوتا ہے وہ اپنے ملک وقوم کے مفادات خواہشات کی جگہ امریکی مفادات وخواہشات کا نہ صرف احترام کرتے ہیں بلکہ ان کے ہی اطاعت گزار نمک خوار بن کر پاکستان پر راج کرتے ہیں اور امریکی مفادات کا اپنے ملک وقوم سے زیاہ خیال اور تحفظ کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ امریکہ جب اور جیسا بھی چاہتا ہے وطن عزیز پاکستان سے سلوک کرتا ہے افغانستان وعراق تو اس کے مقبوضہ ممالک ہیں لیکن امریکی حکام پاکستان کو بھی اپنا ہی مقبوضہ علاقہ سمجھتے ہیں اور پاکستانی قوم کو اس لیے بھی دبا کر رکھنا چاہتے ہیں کہ اس امریکی نافرمان قوم نے تمام تر دباؤ اور مخالفتوں کے باوجود نہ امریکی خواہشات واحکامات کو نظر انداز کرتے ہوئے جوہری قوت حاصل ہی نہیں کی برملا ایٹمی دھماکے کر کے اپنی جوہری قوت کا اظہار بھی کر دیا ہے یعنی پاکستانی قوم نے سانپ کے منہ میں چھچھوندر بھی پھنسا دی ہے جو نہ اس سے اگلتے بن رہی ہے نہ ہی نگلتے بن رہی ہے۔امریکہ نہ تو افغانستان وعراق کی مانند پاکستان پر براہِ راست حملہ آور ہونے کی ہمت کر رہا ہے نہ ہی پاکستان کو ایک آزاد خود مختار مملکت تسلیم کر رہا ہے پاکستان کو اپنا مقبوضہ بنائے رکھنے کے لیے پاکستان کو اپنی دہشت گردی کا شکار بنا رکھا ہے اور اس دہشت گردی کا تمام الزام خود پاکستان اور پاکستان کے علاقوں میں رہنے بسنے والے آزاد قبائل کو بنا رکھا ہے اور نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ کی آڑ میں خود اپنے سوچے سمجھے منصوبوں، سازشوں کے تحت پاکستان کو اپنی دہشت گردی کے نشانے پر رکھا ہوا ہے۔پاکستان میں اب تک جتنے بھی دہشت گردی کے واقعات رونما ہو چکے ہیں ان کو باریک بینی سے غور وفکر کے ساتھ دیکھا سمجھا جائے تو اس کے پس پشت امریکی ذہن ہی کارفرما نظر آئے گا۔کیونکہ تمام کلیسائی قوتوں کو یہ خوف ہمیشہ سے مسلمانوں سے رہا ہے کہ مسلمانوں کو اگر مہلت دے دی جائے تو ان کی فطرت ہی نہیں کہ وہ خاموش بیٹھ جائیں۔وہ جب کچھ نہیں کرتے تو جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔شہادت سے سرشار ہو کر میدان میں کود پڑتے ہیں۔صلیبی جنگوں کا خوف ان کے لاشعور سے نکل ہی نہیں پا رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ کلیسا تمام مسلم دنیا کو اپنا زیر نگیں رکھنے اور مسلمانوں کا سر کچلنے کے لیے اربوں ڈالر سالانہ خرچ کر رہا ہے۔کہیں اس طرح جیسے وہ اپنے کتوں کے آگے ہڈی ڈال کر انہیں دم ہلائے رکھنے پر مجبور رکھتے ہیں تو کہیں مسلم ممالک میں بدامنی اور دہشت گردی کے ذریعہ امن وامان کی خراب صورت حال پیدا کر کے علم بغاوت بلند کرا کے انہیں خود اپنے مسائل میں الجھا کر بے دَم رکھتے ہیں۔اللہ تمام اہلِ ایمان مسلمانانِ عالم کو ان غیر مسلم قوتوں کی سازشوں سے محفوظ فرمائے اور وطنِ عزیز پاکستان کی حفاظت وبلندی فرمائے۔آمین

گفتگو

عمران احمد

> ”حضرت صہیبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن بندے کا معاملہ بھی عجیب ہے ہر معاملہ اور ہر حال میں اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اگر اسے خوشی اور راحت پہنچے تو وہ اپنے ربّ کا شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اور اگر اسے کوئی دکھ اور رنج پہنچتا ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے اور یہ صبر بھی اس کے لیے خیر ہی ہے۔“ (مسلم)

عزیزانِ محترم...... سلامت باشد۔

ستمبر کا شمارہ حاظر مطالعہ ہے۔

رمضان رخصت ہوئے عید الفطر کی چھٹیاں اور خوشیاں تمام ہوئیں۔ تمام چیزیں اپنی روایت کے مطابق اپنے ڈھب پر آگئیں۔ ویسے کوئی چیز اپنی روایت سے ہٹی بھی نہیں تھی۔ مہنگائی جیسی رمضان سے قبل تھی رمضان اور عید پر بھی برقرار رہی۔ دہشت گردی جیسی پہلے تھی ویسی اب بھی ہے ہاں اس مرتبہ رمضان اور عید پر مساجد میں نمازیوں پر حملوں میں ضرور اضافہ ہوا نجانے یہ کون سے عناصر ہیں جو حالت نماز میں کلمہ گو مسلمانوں کو قتل کرنا کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔ جبکہ کہا یہ جاتا ہے کہ رمضان المبارک میں شیطان ملعون کو قید کر دیا جاتا ہے پھر یہ کون شیطان ہے جو ہمارے ملک میں ناچتا پھرتا ہے یا اس کا مطالب ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی جگہ کسی نہ کسی صورت مجسم شیطان (اللہ معاف کرے) ہے۔ اگر رکشہ ٹیکسی ڈرائیور ہے تو وہ بھی رمضان اور عید کے نام پر زائد کرایہ وصول کرتا ہے۔ سبزی فروٹ اور گوشت فروش ہے تو وہ بھی ماہ مقدس کے نام پر اپنے بھائیوں کی جیبیں ہلکی کرتا رہا۔ سرکاری اور نجی اداروں کے ملازمین بھی روزہ کی آڑ میں کام چوری کرتے نظر آئے۔ غرض زندگی کے ہر شعبہ میں ہم مسلمانوں نے حصہ بقدر جثہ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کی کوشش کی۔ اگر ہم اپنی اپنی زندگی اور روزمرہ کے معاملات کا تجزیہ کریں تو محسوس ہوگا کہ ہمیں کسی دشمن کی ضرورت نہیں۔ ہم خود اپنے دشمن ہیں۔ شیطان ہمارے اندر پل رہا ہے ہمیں اگر اس ملک اس شہر اس معاشرے کو سدھارنا ہے اگر اپنے حالات کو تبدیل کرنا ہے تو اپنے اندر کے شیطان کو مارنا ہوگا۔ اسے شکست دینا ہوگی۔ فرصت کے لمحوں میں چند گھڑیاں کشید کر کے اس پہلو پر بھی ضرور سوچیے گا۔

محمد سلیم اختر...... راولپنڈی۔ محترم عمران بھائی! السلام علیکم! نئے افق کے تمام لکھاری اور قارئین کے ساتھ پاکستان کے امن، سکھ، سکون اور سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ حاضری دے رہا ہوں۔ آپ سب کو عید کی مبارک باد بھی دے رہا ہوں جبکہ ستمبر کا شمارہ تو عید کے بعد ہی آئے گا۔ بہرحال تمام دوستوں بہنوں اور قارئین کو عید کی مبارک باد قبول ہو آمین۔ اگست کا شمارہ سامنے ہے۔ محترم قریشی صاحب اور آپ کی باتیں ہمیشہ غور طلب ہوتی ہیں پروردگار آپ کی زبان اور قلم میں مزید قوت اور جدت دے، آمین۔ دستک اور گفتگو نئے افق کا خاص حصہ کہلاتا ہے۔ بہن شہناز بانو یاد رکھنے کا شکریہ۔ مگر یہ کیا گردش ختم کرنے جا رہی ہو۔ بہرحال آپ بہتر جانتی ہیں۔ مدرسہ کا اجراء بھی اچھا سلسلہ ہے۔ مگر نئے افق سے رابطہ نہ توڑیے گا۔ آپ کے مدرسہ کی ترقی اور کامیابی کے لیے دعا گو ہوں ساتھ ہی آپ کی صحت کے لیے بھی۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ بہن عالیہ انعام الٰہی کا خط پرچہ کی جان ہوتا ہے۔ خوب تبصرہ کرتی

ہیں۔ گزشتہ ماہ آپ کو یاد کیا تھا۔ شکریہ کے ساتھ۔ مگر آپ شاید بھول گئیں۔ بہرحال ڈھیروں پرخلوص دعائیں آپ کی نظر، جیتی رہیے۔ ریاض بٹ صاحب کی خدمت میں بھی سلام اور دعائیں اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ سید عبداللہ شاہد آپ نئے افق کا اثاثہ ہیں آپ کی ہر تحریر خوب ہوتی ہے۔ فقیر محمد بخش صابر لنگاہ آپ کی محبت اور چاہت مجھے وصول ہوگئی۔ میری ماں جی کے لیے دعاؤں کا شکریہ۔ محمد اسلم جاوید آپ تو کہانیاں بھی لکھتے ہیں تو پھر صرف خط پر اکتفا کیوں؟ محترم ریاض حسین قمر آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حاضر ہوں۔ میں شاعر تو نہیں مگر آپ کی شاعری متاثر کرتی ہے۔ عزت افزائی کے لیے ممنون ہوں۔ اللہ آپ کو عزت دے۔ محمد فاروق ارشد صاحب کا خط حقائق پر مبنی اور توجہ طلب ہے۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی آپ تو میرے شہر کے ہیں کبھی ملاقات کریں نا۔ اللہ دتہ عابد، شجاع جعفری، بہن شہنی ارشاد کو آداب۔ بہن ناز سلوش ذشے تمہیں نئی زندگی اور نیا گھر مبارک ہو۔ خدا کرے تم سدا سکھی رہو۔ اس ماہ چاروں سچی کہانیاں بہت ہی متاثر کن رہیں۔ آلشبہ مخدوم، شہنی ارشاد، خلیل جبار اور ریاض بٹ کو مبارک باد۔ ”درندہ“ اپنی جگہ بنا لے گی اور بہترین تحریر کہلائے گی۔ گردش پر تبصرہ اب اس کے اختتام پر ہوگا۔ راحیلہ تاج اور شکیل صدیقی بھی اچھی تحریر لائے ہیں۔ اب بات ہو جائے ”جگت سنگھ“ یہ سلسلہ وار کہانی قارئین کو برسوں یاد رہے گی۔ شمیم نوید (مرحوم) ایک منجھے ہوئے لکھاری اور ایڈیٹر بھی تھے۔ انہوں نے سیکڑوں کہانیاں لکھی ہیں اور وہ سب کی سب مقبول ہوئیں۔ شمیم نوید میرے استاد بھی تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے آپ نے ان کی تحریر کو شامل کر کے احسن قدم اٹھایا ہے۔ میں ان دنوں اپنی کہانیوں کے مجموعے کی اشاعت کے سلسلہ میں مصروف ہوں۔ پھر بھی نئے افق کے لیے اگلے ماہ پراسرار کہانی ارسال کروں گا۔ عمران بھائی آپ نے کہانی کے ساتھ اسکیچ لگانا بند کر دیا ہے برائے کرم اسکیچ ضرور لگائیں اس کے ساتھ کہانی کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا ہے بھلے اس کے بدلے پرچہ کی قیمت بڑھا دیں۔

شجاع جعفری...... تلہ گنگ۔ السلام علیکم! امید ہے کہ آپ اور آپ کی ساری ٹیم اور قارئین نئے افق بخیر و عافیت ہوں گے۔ 25 تاریخ کو صبح صبح جا کر نئے افق خریدا اور رستے ہی میں پڑھنا شروع کر دیا۔ سرورق ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھا۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب کو پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ اس کے بعد اقراؑ طاہر قریشی کا انتخاب اپنی مثال آپ ہے۔ احادیث مبارکہ کو پڑھ کر اللہ سے دعا کی کہ ہمیں حضور کے اسوہ حسنہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ گفتگو میں جو حدیث شامل کی گئی وہ اچھی تھی۔ عمران صاحب کو پڑھا کیا ہمارے حکمران مسلمان ہیں؟ اس کے بعد آنٹی شہناز بانو سے ملاقات ہوئی۔ آنٹی اس بار تبصرہ چھوٹا ہے۔ اللہ آپ کو صحت اور سلامتی عطا فرمائے مجھ غریب کو یاد کرنے کا شکریہ۔ اس کے بعد عالیہ انعام آپی جن کے بارے میں سنتے آئے ہیں آج پہلی دفعہ تبصرہ پڑھ لیا۔ آپی ہماری طرف سے سلام۔ ریاض بٹ صاحب کیا حال ہیں۔ آپ کا تبصرہ بہت ہی شاندار تھا۔ میری دعا ہے کہ آپ خوش و خرم رہیں۔ سید عبداللہ شاہد صاحب سلام ہماری طرف سے آپ کا گیت بے حد پسند آیا۔ اس کے بعد فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انکل اس بار آپ کی تحریریں نہیں تھیں۔ تبصرہ بہت اچھا تھا اللہ آپ کو خوش رکھے اور لمبی زندگی عطا فرمائے۔ محمد اسلم جاوید سے 2 منٹ کی ملاقات ہوئی اس کے بعد ریاض حسین قمر، منگلا ڈیم سے تشریف لائے۔ سلام جی امید ہے خیریت سے ہوں گے۔ آپ کا تبصرہ بہت پسند آیا اور غزل بہت پسند آئی۔ آپ نے پاکستان کے حالات کی بات کی یہاں امن و امان تب قائم ہوگا جب ہمارے حکمرانوں کی نیت ٹھیک ہوگی جب یہ ڈالر کے چکروں سے نکل آئیں گے۔ اس کے بعد عمر فاروق ارشد سے ملاقات ہوئی۔ محترم بہت ہی غصے میں تھے ایک

طرف تو تنقید کرنے کو غلط کہہ رہے تھے دوسری طرف خود محبانِ وطن پر تنقید شروع کردی۔ آپ نے بھارت اور اسرائیل کے متعلق لکھا کہ ان کا چہرہ بے نقاب آپ خود کریں تو ورنہ ہمارے حکمران ڈالر اوڑھ کر سو رہے ہیں۔ ابن مقبول صدیقی صاحب کا تبصرہ اچھا تھا۔ انجم فاروق سے ملاقات ہوئی اچھا لگی۔ اللہ دتہ عابد صاحب سلام قبول کریں۔ درندہ (خورشید پیرزادہ) اجازت نامہ (راحیلہ تاج) پیمانہ نفرت (شکیل صدیقی) گردش (شہناز بانو) ذات کا قلندر (امجد جاوید) کٹھن رات (شہنی ارشاد) ہیروں کا ہار (ریاض بٹ) کی اسٹوریز بہت اچھی تھیں۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ خوش بو سخن میں تمام غزلیں، نظمیں اچھی تھیں۔ بالخصوص ریحانہ سیدہ، سید عبداللہ شاہد، ریاض حسین قمر، ظریف احسن، روشانے، ناہید غفور، راشد ترین کی شاعری پسند آئی۔ ذوق آگہی میں تمام انتخاب اچھے تھے۔ آخر میں آپ سب کے لیے سلام اور عید مبارک جب یہ تبصرہ شائع ہوگا عید گزر چکی ہوگی۔ اس لیے نئے افق کے تمام قارئین اور اسٹاف کو عید اور جشن آزادی مبارک۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کے دشمنوں کو نیست و نابود فرمائے۔ آمین

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! ماہ اگست کا شمارہ 25 جولائی کو منتظر نگاہوں کے سامنے جلوہ افروز ہوا اس بار سرورق منفرد اور دیدہ زیب ہے اور پرچے کے نام اور مزاج کے عین مطابق ہے۔ فہرست میں میری کہانی موجود ہے۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں جن سے شکریہ ادا کرسکوں۔ بہرحال عنایت ہے آپ لوگوں کی عمران بھائی گفتگو کے آغاز میں جو کچھ آپ کے قلم نے لکھا موتیوں میں تولنے کے قابل ہے لیکن اس پر عمل کون کرے گا؟ میری ناقص عقل کے مطابق ہم خود ہی اپنی تباہی کے ذمہ دار ہیں۔ یعنی ہم مسلمان، آپ اور قارئین کا کیا خیال ہے۔ بہرطور آگے بڑھتے ہیں۔ پہلا خط بہن شہناز بانو کا ہے جو حسب معمول محبتوں کے پھول نچھاور کررہی ہیں۔ آپ نے جن یادداشتوں کو تازہ کیا ہے اس کے لیے شکریہ۔ میں نے لکھنے کا آغاز روزنامہ جنگ سے کیا تھا جس میں بچوں کی کہانیاں لکھتا تھا۔ شروع سے مجھے اردگرد بکھری کہانیاں لکھنے کا شوق تھا۔ اس لیے وہاں بھی جنوں اور پریوں کی کہانیاں نہیں لکھتا تھا۔ بہرحال درمیانی عرصے کا ذکر پھر کبھی کروں گا۔ نئے افق میں لکھنا اس لیے شروع کیا کہ یہ پرچہ مرحوم ابن صفی نے نکالا تھا۔ ان سے عقیدت اور محبت کا اظہار میں اپنے خطوط میں کرچکا ہوں۔ عالیہ انعام بہن آپ کا خط خوب صورت لفظوں کا ایک انمول گلدستہ ہے۔ لگتا ہے آپ نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ خاص کر یہ فقرہ تو ذہن میں نقش ہوکر رہ گیا ہے۔ پرواز بھرتے رقص کرتے ہوئے خواہشوں کے طوطے زندگی کا احساس بن جاتے ہیں۔ میری کہانی تماش بین پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ سید عبداللہ شاہد بھائی یاد کرنے کا شکریہ۔ میری کہانی تماش بین کو آپ نے عمدہ کہا یہ آپ کے اعلیٰ ذوق کی غمازی ہے۔ جس نکتے کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے۔ وہ سر آنکھوں پر لیکن اگر میں اس کی وضاحت کردوں تو بہتر رہے گا۔ عبداللہ بھائی عام کہانی اور تفتیشی کہانی میں فرق ہوتا ہے۔ اس میں اگر سسپنس برقرار نہ رکھا جائے تو نتیجہ ظاہر ہے۔ دراصل جگنو نگینہ کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قتل کرنے تو گیا نہیں تھا اور جب اس سے قتل ہوگیا تو اس نے مجبوری کے تحت انہیں راز دار بنالیا اور ان سے ڈرامہ کروایا۔ وہ نشے کے عادی تھے اور جگنو انہیں منشیات دیتا تھا اور علاوہ ازیں خالد صاحب نے آخر میں کہہ دیا تھا کہ انہیں اکو اور شیدے کی باتوں پر اعتبار نہیں آیا تھا۔ امید ہے آپ آئندہ بھی میری رہنمائی کرتے رہیں گے۔ بھائی فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا کہ اٹھارہ بیس گھنٹے کی لوڈشیڈنگ میں انسان کچھ نہیں کرسکتا۔ چلو میرے یاد کروانے پر آپ بھی جوان ہوگئے خدا آپ کو ہمیشہ خوش و خرم اور صحت مند رکھے بہرحال مجھے اچھے لفظوں سے یاد کرنے پر بندہ ناچیز مشکور ہے۔ محمد اسلم جاوید بھائی اتنا مختصر تبصرہ ریاض حسین قمر

بھائی اچھے کلام کو اچھا کہنا فرض بنتا ہے آپ اپنا کام کراتے جائیں رہی بات نگینوی صاحب کی تو یہ بات آپ ڈر ڈائجسٹ والوں کو لکھیں تاکہ وہ وہاں سے بھی بلیک لسٹ ہوجائیں لیکن اپنی غزل (جو نئے افق میں شائع ہوئی) اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ساتھ لگانا نہ بھولیے تاکہ مجرم بمع ثبوت پکڑا جائے جس طرح میری تفتیشی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ میری کہانی تماش بین کو شاہکار کہانی سمجھنے کا بے حد شکریہ۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب میری کہانی آپ کے معیار پر پوری اتری اور آپ کو میری کہانیوں کا انتظار رہتا ہے جس کے لیے مہربانی اور نیک تمنائیں قبول کریں۔ اللہ دتہ عابد اور شجاع جعفری گو آپ نے مختصر لکھا لیکن خوب لکھا۔ عمران بھائی اس بار معذرت مصروفیات کے باعث باقی رسالہ ابھی پڑھ نہیں سکا۔ اس لیے کہانیوں پر تبصرہ آئندہ ماہ اب اجازت دیں۔ یار زندہ صحبت باقی۔ والسلام

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ...... خانیوال۔ محترمی و مکرمی جناب بزرگوار مشتاق احمد قریشی صاحب، عمران احمد قریشی صاحب، ماہنامہ نئے افق وار اکین نئے افق مع قارئین، بہن بھائیوں خداوند کریم آپ سب کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے کامیاب و کامران رہو اور عیدالفطر کی دلی طور پر فقیر کی طرف سے مبارک باد قبول کرو۔ دیگر احوال یہ ہے کہ ایک سال بابت ماہ ستمبر 2013ء تا اگست 2014ء کے لیے خریداری فیس مبلغ 500 روپے میں نے بذریعہ رجسٹری آپ کے ادارے کو ارسال کردی ہے لہٰذا آئندہ سال کے لیے بشرط زندگی ماہنامہ نئے افق کی ممبر شپ اور خریداری میں آپ کا ساتھی رہا جواب سے نوازیے گا۔ سرورق کے لیے مصور صاحب کو مبارک باد۔ دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے بھرپور انداز میں سبق دیا۔ گفتگو میں عمران احمد صاحب نے آغاز سے حدیث نبوی کے پھول برسائے اور بھرپور انداز میں اعلامیہ پیش کیا جو کہ اپنے اندر ایک بھرپور سبق لیے ہوئے تھا۔ صدارتی کرسی حاصل کی محترمہ شہناز بانو صاحبہ نے اور اپنی باتوں سے محفل کو سرشار کردیا اور دل خوش کردیا۔ بہنیں بھائیوں کے لیے عزت کا مقام اور بھائی ان کے سر کے نگہبان ہوتے ہیں فقیر کی دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ سعد علی، اسد علی برادرم شہاب علی کو سلام محبت اور تمام اہلخانہ کو عید مبارک اور دعاؤں کے بعد، بہن گردش کے اختتام کے بعد آگے کے لیے بھی کوئی بھرپور سلسلہ جلد ہی سامنے لائیں شکریہ فقیر صابر لنگاہ صاحبزادی عالیہ انعام الٰہی بیٹی خداوند پاک آپ کو سدا خوشیاں عطا فرمائے بھرپور انداز میں آپ نے تبصرہ پیش کیا جسے پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔ فقیر کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں کبھی کبھار آپ بھی میرے لیے دعا کردیجیے۔ محترم سید عبداللہ شاہد صاحب اللہ پاک آپ کو خوش رکھے بہت اچھے جارہے ہو جس سے دل خوش ہوجاتا ہے فقیر کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں آپ نے اپنے مراسلہ میں فقیر کو یاد کیا جس کا شکریہ دعا گو ہوں۔ برادرم عزیز ریاض بٹ صاحب آپ بہت خوب گفتگو میں حصہ لے رہے ہیں داستان ہیروں کا ہار بھی بہت پیاری داستان تھی۔ بہت پسند آئی۔ دلی سلام و عید مبارک اور بہت بہت دعائیں بابا لوگ آپ کے۔ محترمی ریاض حسین قمر، جناب ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، برخوردار انجم فاروق ساحلی صاحب، محترم اللہ دتہ عابد اور عزیزی شجاع جعفری صاحب آپ سب دوستوں عزیزوں نے محفل گفتگو میں شامل ہوکر اپنی رنگ برنگی باتوں سے فقیر کا دل خوش کردیا اور فقیر کو اپنی محبت میں شامل کر کے یاد کر کے تندرست و توانا کر کے توانائی بخشی جس کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میرا اسلام محبت دعائیں اور عید مبارک کا پیغام آپ کے نام ہے قبول فرمائیں شکریہ۔ عزیزہ بیٹی ناز سلوش ذشے کو شادی مبارک ہو اور کامیاب ازدواجی زندگی گزارنے کی صدق دل سے دعا۔ حنا ناز آف لیہ، این شاہین، ماہ لقا، طاہرہ جبیں تارا، محمد سرور شاذ، دلشاد حسین، آشر عظیم، حاجی سلیم احمد، حاجی نور الٰہی، ناصر احمد خان ڈاہا، شہنی

ارشاد صاحبہ وغیرہ وغیرہ کو دلی سلام ودعا اور عید مبارک کا پیغام۔ شہناز بانو کی گردش، امجد جاوید کی قلندر ذات، شمیم نوید کی جگت سنگھ، شہنی ارشاد کی کٹھن رات اور ریاض بٹ کی ہیروں کا ہار کا مطالعہ کیا۔ جن میں سبق، تیزی اور میلان کی برقراری جرم وقانون کو اس طرح پیش کیا گیا کہ راہ سبق ہو سکے۔ ایسی ہی تحریروں کا انتظار کیا جاتا ہے۔ باقی کا ماہنامہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ اس کم کو زیادہ جانیں کے بعد دعائیں اور عید مبارک کے ساتھ ہی والسلام۔

عبدالحکیم ساجد...... منچن آباد۔ سلامت باشد! قوی امید ہے کہ تمام اسٹاف بمع قارئین بخیریت سے ہوں گے اور ماہ رمضان کی رحمتیں، برکتیں سمیٹ کر عید کی خوشیاں منا رہے ہوں گے۔ میری طرف سے قارئین اور اسٹاف کو عید کی خوشیاں مبارک۔ بالخصوص جناب مشتاق احمد قریشی و عزیز من عمران احمد صاحب کو بہت بہت سلام ودعا۔ ناز سلوش ذشے میری طرف سے بھی پیارے بھیا مبارک۔ بے حد معذرت کے ساتھ کہ میں اتنے عرصے تک محفل افق کی کرنوں سے دور رہا لیکن پھر بھی بنا حاضری دیے اپنے جریدے سے جڑا رہا۔ تمام ساتھیوں سے باخبر رہا اور غائبانہ دعائیں سمیٹتا رہا لیکن آپ سب کی محبت ایک دفعہ پھر واپس لے آئی کرسی صدارت پر آپا شہناز بانو براجمان تھیں۔ بہت خوشی ہوئی جی آپ کی ''گردش'' نے تلخ حقیقتوں سے پردہ اٹھایا اور کچھ رومانوی باتوں سے دل کو زندہ رکھا لیکن آپ کی قسط بہت کم لگتی اس کے علاوہ سرمئی اور حسام والے سین کو تھوڑا طول دیا جاتا رہا۔ امید ہے کہ آپ محسوس نہیں کریں گی خداوند آپ کو اچھی صحت عطا فرمائے، آمین تاکہ ہمیں آپ کے قلم سے کچھ اور بھی پڑھنے کو ملے تمام کے محبت نامے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ سید عبداللہ شاہد بھائی کیا حال ہے اس دفعہ آپ کا تبصرہ طوالت پزیر نہیں تھا کیا وجہ ہے؟ پیارے انکل و بزرگوار فقیر محمد بخش صابر لنگاہ جی آپ کی طبیعت اب کیسی ہے خداوند کریم آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ میرے لیے دعا کیجیے گا۔ اللہ دتہ عابد کو محفل افق میں دیکھ کر بہت کچھ خوشی ہوئی۔ جی جناب آپ نے یاد کیا اور ہم حاضر۔ اس دفعہ کچھ نئے لوگوں سے بھی شناسائی ہوئی جن میں شجاع جعفری، عمر فاروق ارشد جی شامل ہیں اور اس دفعہ امجد جاوید جی آپ حاضر نہیں ہوئے۔ آپ کی قلندر ذات مجھے بہت اچھی لگی ایک ہی ناول میں دو کہانیاں اور مجھے لگتا ہے دونوں ایک دوسرے سے ملتی بھی ہیں اور آخر میں شاید ان کی کچھ کڑیاں جڑ جائیں۔ جسپال اور ہرپریت (جسی اور پریتی) والا سین مجھے زیادہ اچھا لگا اور ہمارے علم میں کچھ اضافہ ہوا کہ یہ آپ نے تحریک خالصتان کے پس منظر میں لکھی ہے اور اگر کچھ غلط کہہ جاؤں تو معاف کردیجیے گا۔ جناب اے حمید کی ایڈونچرس داستان اپنے اختتام کو پہنچی اور مان گئے کہ ان کے قلم میں کتنا زور ہے۔ اس کی جگہ آپ نے ''جگت سنگھ'' لگائی جو کہ ایک جاٹ دشمنی پر مبنی ہے جو کہ شمیم نوید صاحب کی کاوش بہترین ثابت ہوگی۔ ریاض بٹ صاحب اس دفعہ ''ہیروں کا ہار'' میں کچھ مزہ نہیں آیا۔ کیس جلد ہی حل ہوگیا اور سنائیں آپ کیسے ہیں؟ شہنی ارشاد جی آپ نے کہانی کو بہت اچھی طرح ترتیب دیا۔ جس میں ملک کی ایک رسم بھی بتائی اور مذہبی حوالے سے ایک اچھا سبق آموز پیغام دیا مبارک ہو۔ دستک، اقرا، حدیث نبوی کے حوالے سے کہنے کے لیے میرے پاس الفاظ کم پڑ رہے ہیں۔ آگے آپ دانش ور ہیں۔ خوشبوئے سخن اور ذوق آگہی دونوں بھائیوں کو مبارک کہ آپ نے دونوں سلسلوں کو بہت اچھی طرح ترتیب دے کر پیش کر رہے ہو اور آپ سب ٹھیک ہونا۔ تمام شعرا کا کلام خوب تھا۔ جن میں ظریف احسن، ریحانہ سعیدہ، وسیم اختر، سمیع جمال اور حکیم خان حکیم کی شاعری پسند آئی۔ ذوق آگہی کے سب شہ پارے موتیوں سے پروئے گئے تھے جن میں نعیم بھائی چکوال، ریاض بٹ صاحب، احمد ابدالی، فاروق احمد، یعقوب حماس، ثوبیہ جی اور دیگر لوگ شامل ہیں۔ عمران بھائی اجازت چاہتا ہوں زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ جناب عمران صاحب دی گریٹ سلام شوق امید واثق ہے کہ آپ مع اپنے مخلص اور محنتی عملہ کے باخیریت ہوں گے۔ آپ اس ہوشربا گرانی میں جس طرح نئے افق کو بنا سنوار کے اتنی کم قیمت میں ہمیں مہیا فرما رہے ہیں یہ بہت بڑی بات ہے۔ ورنہ اس دور میں تو بعض غیر معیاری جرائد کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہوتی ہیں۔ رب ذوالجلال آپ کو اس میں استقامت عطا فرمائے آمین۔ اگست کا شمارہ منفرد ٹائٹل لیے عید مبارک کی نوید سناتا ہوا بک اسٹال پر جلوہ افروز تھا۔ دیکھتے ہی دل باغ باغ ہوگیا۔ دستک میں محترم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے ٹریفک جام کیوں ہوتا ہے کہ زیر عنوان کراچی کے ٹریفک کے بارے میں سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔ ٹریفک کا مسئلہ صرف کراچی کا نہیں ہے بلکہ وطن عزیز کے ہر بڑے شہر کا مسئلہ ہے۔ بلکہ اب تو قصبوں میں بھی ٹریفک جام نظر آتا ہے یہ سب ارباب اختیار کی بے توجہی کا شاخسانہ ہے اقرا میں طاہر احمد قریشی نے اس بار احادیث کی روشنی میں اخلاص اور ریاکاری میں فرق واضح کیا ہے خداوند کریم انہیں اجر عظیم عطا فرمائے، آمین۔ روحانی علاج میں محترم حافظ شبیر احمد صاحب نے لوگوں کے مسائل کا حل بتا کر بہت سوں کا بھلا کیا ہے۔ ذوق آگہی میں تمام انتخاب بہت اچھا تھا۔ مگر جناب ریاض بٹ صاحب کا انسانی جسم کی کابینہ ایک منفرد آئٹم تھا۔ خوشبوئے سخن میں سارا کلام معیاری تھا۔ مگر ثمن عبدالرحمٰن، محمد اسلم جاوید، قدیر رانا، نیر رضوی، سمیع جمال، حکیم خان حکیم کی غزلیں اور ریحانہ سعیدہ، ظریف احسن، وسیم اختر، عقیلہ بتول کی نظمیں لاجواب تھیں۔ جناب عبداللہ شاہد کا واحد آئٹم گیت بھی بہت معیاری تھا۔ خدا تعالیٰ ہمارے اس خوب صورت حسن کو اور نکھارے آمین۔ گفتگو کے آغاز میں آپ نے بہت پیاری حدیث بیان فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے، آمین اور قارئین کے خطوط سے پہلے آپ نے جو صورت حال بیان فرمائی ہے وہ حرف بہ حرف حق وصداقت پر مبنی ہے۔ کاش ہم اپنے قول وفعل سے اپنا مسلمان ہونا ثابت کرسکیں۔ گفتگو میں کرسی صدارت پر براجمان آپی شہناز بانو بہترین تبصرے کے ساتھ تشریف لائی ہیں۔ انہوں نے بہت نیک کام کا آغاز کیا ہے۔ یعنی قرآنی درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ خداوند کریم انہیں اس میں استقامت بخشے۔ افراتفری کے دور میں یہ وقت کی اہم ضرورت بھی ہے خدا کرے ان کی یہ مخلصانہ کوشش بارآور ہو آمین۔ آپی میری دلی دعا ہے کہ رب قدوسی آپ کو ہر طرح کی روحانی اور جسمانی تکالیف سے محفوظ رکھے آمین۔ آپ نے ناز سلوش ذشے کے پیا دیس سدھارنے کی خوشخبری بھی سنائی ہے۔ اللہ کریم اسے اپنی حفظ وامان میں رکھے اور سسرال میں اسے ڈھیروں خوشیاں عطا فرمائے آمین۔ عالیہ انعام الٰہی نے جس انداز میں ٹائٹل کی منظر کشی کی ہے لائق ستائش ہے باقی پرچے میں شائع ہونے والی تحریروں پر ان کا تبصرہ بڑا جاندار تھا۔ ان کا خط طویل ہونے کے باوجود خوب صورت اور اچھے انداز تحریر کا نمونہ تھا۔ محترم ریاض بٹ صاحب تبصرہ ان کی کہانیوں کی طرح جاندار تھا۔ اس بار بھی وہ ''ہیروں کا ہار'' کی صورت میں ایک اچھی سچ بیانی لائے ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ جناب سید عبداللہ شاہد نے اچھی گفتگو کی مگر اپنے بھرپور تبصرے سے ہمیں محروم رکھا شاید وقت کی کمی تھی۔ سید عبداللہ شاہد باقاعدگی سے آتے رہا کریں آپ کے آنے سے بہت رونق رہتی ہے۔ بزرگوار محمد بخش صابر لنگاہ صاحب نے اپنی خرابی صحت کے باوجود گفتگو میں بھرپور شمولیت فرمائی۔ رب ذوالجلال انہیں مکمل صحت یابی عطا فرمائے آمین۔ محمد اسلم جاوید صاحب مختصر تبصرے کے ساتھ تشریف لائے آپ کی شاعری اچھی ہے اور مختلف جرائد میں جگہ باقی ہے۔ آپ بنیادی طور پر شاعر ہیں آپ کو چاہیے کہ خوش بوئے سخن کا تنقیدی طور پر مطالعہ کیا کریں اور اس پر گفتگو میں تبصرہ کیا کریں۔ فورٹ عباس

سے محترم بھائی عمر فاروق ارشد صاحب تشریف لائے ہیں۔ پیارے بھائی نے میرے اور عصمت اقبال عین کے بارے میں اپنے نیک خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ بھائی مجھ ناچیز سے شاید پروفیسر صاحب کے بارے میں نادانستہ گستاخی ہوگئی۔ اگر مجھے پتا چل ہی گیا تھا کہ وہ ادبی سارق ہیں تو مجھے بڑے ادب سے عرض کرنا چاہیے تھا کہ محترم ومکرم جناب الحاج صوفی واجد نگینوی صاحب آپ کی طبع نازک پر گراں نہ گزرے تو عرض کروں کہ آپ لوگوں کا کلام چرا کر اپنے نام سے چھپواتے ہیں پلیز آپ ایسا نہ کیجیے گا۔ اچھی بات نہیں ہے۔ آپ نے برا تو محسوس نہیں کیا؟ اب مسکرا بھی دیجیے نا تا کہ مجھے پتا چلے کہ آپ نے میری بات کا برا نہیں مانا۔ مگر میں نادانی میں نہ جانے کیا لکھ گیا۔ اب میرے پیارے بھائی ہی فرمائیں۔ اس کا ازالہ کیسے ہوسکتا ہے کیا یہ ناچیز پچاس روپے کے اسٹامپ پیپر پر معافی نامہ لکھ کر موصوف کو ارسال کردے اور اگر وہ نہ مانے تو اپنا غیر مطبوعہ سارا کلام اس کے نام کردوں کہ وہ کلیات واجد کے نام سے چھپوا سکے اور عزت اور شہرت کمائے خیر۔ جناب ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب نے اختصار نویسی اپنالی ہے بھائی حسب سابق تبصرے میں ذرا طوالت پیدا کریں۔ شجاع جعفری صاحب یاد فرمائی کا شکریہ۔ میں خط تو باقاعدگی کے ساتھ لکھتا ہوں مگر کبھی کبھی ہمارے مہربان ڈاک والے کرم فرما جاتے ہیں غزل پسند فرمانے کا بے حد شکر گزار ہوں۔

عمر فاروق...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ زہے قسمت اس بار اگست کا شمارہ وقت پر ہی مل گیا۔ گویا نئے افق کو ہمارے جذبات کا کچھ کچھ اندازہ ہوتا جارہا ہے۔ ہم نے بھی لپک کر بلکہ جھپٹ کر اس کو گود میں لے لیا۔ ٹائٹل عجیب سی ویرانی اور اداسی کا منظر پیش کررہا تھا۔ ہمارے خیال میں رمضان اور عید کی مناسبت سے سرورق ہونا چاہیے تھا۔ بہر حال نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا ہے کیوں عمران بھائی؟ تحریروں کا پوسٹ مارٹم کرنے پر معلوم ہوا کہ ہماری کہانی کو عمران بھائی نے پوری مہارت اور چابکدستی سے کھڈے لائن لگا دیا ہے اس بار کچھ نئے نام شامل محفل تھے اور اس وجہ سے تحریروں میں بھی نیا پن جھلک رہا تھا۔ یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ سب سے بہترین کہانی امجد جاوید صاحب کی جارہی ہے۔ اسٹوری کا تانا بانا ہی کچھ اس طرح بنا گیا ہے کہ کہیں کوئی لچک یا جھول محسوس نہیں ہوتا بھیا جی لکھتے رہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ' گردش کے بارے میں مسرت انگیز خبر یہ سننے کو ملی کہ اگلی دفعہ ختم ہورہی ہے۔ شکر ہے مولا تیرا اس کی جگہ کوئی اور سلسلہ نہ شروع کریں بلکہ مختصر کہانیاں ہی دیا کریں۔ ابتدائی صفحات کا ناول بس درمیانی سطح کا تھا۔ متاثر نہیں کرسکا لیکن رائٹر نے کوشش زبردست کی تھی اور کہانی کا اختتامیہ جاندار تھا۔ آخری صفحات پر ناول دیکھ کر دماغ گرم ہوگیا۔ یہ ہمارے رائٹرز کو سکھوں کے علاوہ کیا اور کوئی موضوع نہیں ملتا؟ خدا کی پناہ عنوان ہی موڈ خراب کرنے کے لیے کافی ہے۔ "جگت سنگھ" میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ محترم شمیم نوید صاحب آپ ہمیں سکھ برادری کا کلچر اور ثقافت بتا کر کیا باور کروانا چاہ رہے ہیں؟ کیا ہمارے معاشرے میں کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر کہانی لکھی جاسکے۔ ہزاروں مسائل ہیں' موضوعات ہیں' داستانیں بکھری پڑی ہیں ہماری تہذیب وتمدن کے اندر' کیا وہاں سے کوئی کہانی تخلیق نہیں کی جاسکتی؟ میں پرزور انداز میں یہ بات کہوں گا کہ نئے افق کے صفحات پر اس کی کوئی گنجائش نہیں اور اسے فوری طور پر ختم کیا جائے۔ وطن عزیز میں بے روزگاری' مہنگائی' دہشت گردی' بدامنی' ناانصافی اور رشوت خوری جیسے عفریت موجود ہیں۔ کیا ہمارے قلم ان کے خلاف نہیں لکھ سکتے' ہم کیوں غیر ضروری اور فضول قسم کے اوٹ پٹانگ موضوعات پر اپنا زور صرف کرتے ہیں؟ شہنی ارشاد نے جس موضوع پر لکھا وہ ایک نہایت عمدہ کاوش ہے کیا ان رائٹرز کو ایسے موضوعات نظر نہیں آتے جو غیروں کی آغوش میں آئیڈیل تلاش کرتے ہیں۔ شہنی بہنا میں تم کو مبارک باد دیتا ہوں کہ تم نے ہمارے معاشرتی ناسور

کو اجاگر کیا حاضری دیتی رہا کرو۔ باقی کہانیوں میں خلیل جبار کی ضرورت' شروع میں تو اچھی خاصی تھی لیکن آخر پر انہوں نے اپنے منہ میاں مٹھو بن کر سارا مزہ کرکرا کردیا۔ مغرب سے دونوں ہی انتخاب بہترین تھے۔ ریاض بٹ صاحب آپ کی تفتیشی کہانی بہت ہی پیاری ہوتی ہے لیکن معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ کہانیوں کی اتنی بھرمار اور تسلسل آپ کے معیار کو بگاڑ رہا ہے۔ ذرا غور فرمایئے گا میرے بڑے بھائی جی۔ گفتگو کی محفل میں شہناز صاحبہ نے بتایا کہ انہوں نے قرآنی تعلیم وتدریس کا ادارہ شروع کیا ہے اللہ رب العزت آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ عالیہ انعام الٰہی لفاظی اچھی کر لیتی ہیں آپ' ویسے تبصرہ خاصا پاورفل تھا۔ لگتا ہے دیلی بیٹھ کر لکھا ہے۔ ریاض حسین قمر صاحب اب ڈاکٹر واجد کی جان چھوڑ بھی دو' وہ واقعی بڑا جعلی فنکار بندہ ہے۔ سزا پانے کے بعد بھی شاید عقل ٹھکانے نہیں آئی اس لیے چربہ سازی کی دکان ابھی بھی لگائے بیٹھا ہے رب سے دعا ہی کرسکتے ہیں کہ اسے ہدایت نصیب ہو۔ انجم فاروق آپ اپنی کہانی پہلے نمبر پر لگنے کی خوشی میں جھوم رہے ہیں۔ ہماری نظر میں تو آپ کی وہ کہانی ردی کی ٹوکری کا حق تھا باقی عمران بھائی بہتر جانتے ہیں خیر' دوسرے دوستوں کے تبصرے نارمل تھے۔ سب ہی محنت سے لکھتے ہیں ہماری تنقید کا مطلب کسی سے ذاتی رنجش نہیں بلکہ اپنے ساتھیوں کی اصلاح ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر شمارہ عمدہ کہلانے کے قابل ہے۔ اقرا میں اس بار کی حدیث الحمد للہ ہمیں معلوم تھی لیکن دوبارہ پڑھ کر اچھا لگا کیونکہ گلشن احادیث کی جتنی بھی سیر کی جائے دل نہیں بھرتا۔ علاوہ ازیں غزلوں میں سے عقیلہ بتول نے اپنے جذبات بیان فرمائے میں ان کے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن غزل میں ناپختگی واضح تھی اور ایک انتہائی اہم بات' ذوق آگہی میں آزاد کشمیر سے ثوبیہ جہانگیر کی تحریر نظروں سے گزری تو ہمیں ایک شاک سا لگا محترمہ ہم نے تو آپ کی وفات کی خبر سنی تھی بچوں کے رسالے "روضتہ الاطفال" کے ذریعے اور اس بات کو تقریباً تین سال گزر چکے ہیں لیکن آپ؟ خدارا اس کنفیوژن کو دور کردیجیے گا بہنا' اللہ تعالیٰ ہمارے میگزین کو ترقی عطا فرمائے۔ اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو آمین ثم آمین۔

عبد المالك كيف...... صادق آباد۔ نئے افق شمارہ اگست 2013ء اپنی خوب صورت تحریروں سے سجا 28 تاریخ کو ملا بلکہ اسے جا پکڑا' اگر ایک دن اور ہوتا تو کہاں ملنے والا تھا۔ عید مبارک سے مزین ٹائٹل اس کی تروتازگی میں اضافہ کررہا تھا' دنیا داری' عید کے دن میں بہت سارے کام کاج موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ تبصر کا دکھ ہورہا تھا کہ اس ماہ بھی شامل نہ ہو پائیں مگر ایک دکھ کے ساتھ خط لکھ رہا ہوں شامل ہونا نصیب کی بات ہوگی۔ قارئین اور رائٹرز حضرات' شاعر' کہانی کار' ناول نگار' ہماری رائٹرز بہنیں کیسے مزاج ہیں سب کے؟ اللہ تعالیٰ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے' آمین۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب نے کراچی کی بڑھتی ہوئی آبادی پر بہت ہی باریک بینی سے مشاہدہ کیا۔ واقعی کراچی جا کے ایسا ہی لگتا ہے کہ جیسے انسانوں کا سمندر بڑھتا ہی جارہا ہے' انسانی آبادی کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے اور وسائل محدود سے محدود ہوتے جارہے ہیں۔ خیر ہمیں کیا ہم تو الحمد للہ کھلے ماحول (گاؤں) میں ہیں۔ تبصروں میں ماشاء اللہ شہناز بانو کا پہلا خط' اللہ تعالیٰ آپ کے مدرسے کو وسعت دے اور اس نیکی کے کام کے لیے ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں اور آپ کے تبصرے سے پتا چلا کہ ناز سلوش ذشے اپنی خوب صورت نئی زندگی میں داخل ہوگئی ہیں' بھئی نازش اس خوشی کے موقع پر بھائی کی طرف سے بغیر تحفے کے آپ کو اور دلہا بھائی کو مبارک باد' اب منہ میٹھا کراؤ۔ چل چل رہن دے تکلف نہ کر مگر ہمارے پیارے نئے افق میں لکھتی رہنا اگر دلہا بھائی اجازت دیں تو اور یہ شہنی جی کدھر ہیں؟ دلہا بھائی ہاتھ نہیں آرہے کیا...... آپ کو بھی شادی مبارک' اگر کرلی ہے تو ورنہ

ایڈوانس میں قبول کرنی پڑے گی کیونکہ الفاظ تو منہ سے تشریف لا چکے ہیں۔ دوسرا خط عالیہ انعام الٰہی کراچی سے اور ہمیشہ کی طرح بہت خوب صورت تاثر چھوڑ گیا' کہانیوں پر مکمل تبصرہ شاندار رہا' زور قلم اور زیادہ ہو۔ ریاض بٹ صاحب کیسے مزاج ہیں' آپ کی کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ سید عبداللہ شاہد سلام عرض' بھائی صاحب اس بار تبصرہ مختصر کیوں؟ بزرگوار فقیر محمد بخش لنگاہ' محترم انکل کیسے ہیں' اللہ پاک آپ کو صحت یابی عطا فرمائے۔ فقیر محمد بخش صابر لنگاہ کے محبت نامہ میں چھوٹی سی خبر تھی جس نے بہت دکھ پہنچایا' ہمارے دیرینہ ساتھی محمد ارشاد قریشی صاحب بہت ہی حساس آدمی تھے' بہت یاد کیا کرتے تھے۔ اپنی جاب روزنامہ اذکار کے دوران ساری ساری رات ایس ایم ایس بھیجتے تھے' کتنے دن ہوئے ان کے ایس ایم ایس وغیرہ نہیں آ رہے تھے کئی بار ایس ایم ایس ہم نے بھی کیے کہ جناب آپ کے ایس ایم ایس اب کیوں نہیں آ رہے کیا مسئلہ ہے مگر جواب ندارد ہم سمجھے ہماری کاہلی سستی ہے کہ جواب کم دیتے ہیں شاید اس لیے میسج یا رابطہ وغیرہ کم کیا ہے۔ اسی کاہلی کی وجہ سے توفیق نہ ہوئی کہ کال کر کے پتا کریں' یہ بھی سوچا کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے رابطہ نہیں کر رہے ہوں گے مگر...... وہ تو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور ہمیں پتا ہی نہ چلا (ان للہ وان الیہ راجعون) اللہ پاک کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ محمد اسلم جاوید' ریاض حسین قمر بھائی' عمر فاروق ارشاد' خوش آمدید' امید ہے کہ آئندہ بھی حاضری دیتے رہیں گے۔ آگے تبصرہ محترم ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب راولپنڈی کیوں جناب عبداللہ بھائی کی طرح آپ نے بھی مختصر تبصرہ کر کے جان چھڑالی۔ ساحلی بھائی لاہور نے کچھ اپنے تبصرے کو مختصر سے آہستہ آہستہ بڑا کر رہے ہیں' اچھی بات ہے۔ اگلے شمارے میں زبردست تبصرہ ہونا چاہیے' ارے کہیں یہ اللہ دتہ عابد تو نہیں' واہ اچھی ابتداء ہے سارے لوگ واپس آ کر نئے افق کی شان میں اضافہ کریں پلیز اور آخری یعنی بارواں خط شجاع جعفری صاحب تلہ گنگ سے شجاع جعفری اپنی حاضری یقینی بنائے ہوئے ہیں اور یہ محترمہ ہماری بہن عصمت اقبال کہاں رہ گئیں؟ طاہر احمد قریشی صاحب کا ترتیب دیا ہوا احادیث مبارکہ پر مبنی صفحہ اقراء پڑھا اس دنیا کے نقار خانے میں تو بہت کچھ دکھاوا ہی دکھاوا نظر آتا ہے اللہ معاف فرمائے اور عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ کہانیوں میں پہلے ''گردش'' کی تشنگی کو دور کیا یہ بھی پتا چلا کہ آخری قسط ہوگی اگلے ماہ۔ شہناز بانو دوسرا ناول کب شروع کر رہی ہیں؟ ''درندہ'' خورشید پیرزادہ کا خوب صورت تھا' سچی کہانیاں میں شہنی ارشاد کی ''کٹھن رات'' ریاض بٹ ''ہیروں کا ہار'' ''فریب'' آلشبہ مخدوم کی خوب رہیں۔ امجد جاوید ''قلندر ذات'' بہت زبردست جا رہی ہے جمالے کا کردار اور اچھا لگ رہا ہے۔ خوشبوئے سخن میں ریحانہ سعیدہ لاہور کی شاعری' سید عبداللہ شاہد کا گیت' ثمن عبدالرحمٰن کراچی' ریاض حسین قمر منگلا ڈیم' سمیع جمال' کراچی حکیم خان حکیم' راشد ترین' مظفر گڑھ کی شاعری نے متاثر کیا۔ ذوق آگہی میں خوب صورت موتیوں کی مالا پروئی گئی تھی۔ اقوال زریں' احادیث نبوی ﷺ سے مزین خوب صورت باتیں دل میں گھر کر جاتی ہیں۔ جن تحریروں نے متاثر کیا ان میں شجاع جعفری تلہ گنگ' ریاض بٹ حسن ابدال' زینب فرحان' رضوانہ خان' چکوال' فاروق احمد کراچی' ثوبیہ جہانگیر آزاد کشمیر' ایس اکبر خان بھکر اور آخر میں شمیم نوید کی جگت سنگھ اسٹارٹنگ بہت جاندار ثابت ہوئی' آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا' والسلام۔

❖

اقراٗ

ترتیب: طاہر قریشی

ایمان اور اس کی طاقت:

''حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے تھے کہ ''جو کوئی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت و بندگی کے لائق نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں تو اللہ نے اس شخص پر دوزخ کی آگ حرام کردی ہے۔'' (رواہ مسلم)

ہم اور آپ روزانہ پانچ وقت کی نماز میں کئی بار سورۂ فاتحہ پڑھتے ہیں جس میں بار بار اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگتے ہیں۔ ''اے اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔'' اور پھر سیدھے راستے کی تشریح بھی زبان پر لاتے ہیں۔ ''یعنی ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔''

معلوم ہوا کہ ہمیں صراط مستقیم کو تلاش کرنے کے لیے ان لوگوں کے بارے میں آگاہی حاصل کرنی ہوگی جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنا انعام فرمایا' یا جنہیں اللہ ربّ العزت نے انعام کا مستحق قرار دیا۔ چنانچہ اس وقت بات ایمان لانے والوں کے متعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کیا انعام مقرر فرمایا۔

مشکوٰۃ شریف میں کتاب الایمان کی پہلی حدیث جو ''حدیث جبرائیل'' کے نام سے محدثین کے نزدیک مشہور ہے۔ اس میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے سوال و جواب کے ذریعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دینی تعلیمات سے آگاہ کیا۔ ان سوالات میں ایک سوال حضرت جبرائیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت فرمایا۔ ''مجھے ایمان کے بارے میں بتایئے کہ ایمان کیا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''ایمان کہتے ہیں اللہ اور اس کے فرشتوں' اللہ کی نازل کردہ کتابوں اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر اور اچھی اور بری تقدیر کو صدق دل سے ماننا اگر ان میں سے ایک چیز کے بارے میں بھی ایمان نہ ہو تو وہ شخص مومن نہیں رہتا۔''

ایمان لانے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ ''یہی لوگ کامیاب ہیں۔'' کسی بھی انسان کے لیے آخرت میں کامیاب ہونے سے بڑا انعام اور کچھ نہیں ہوسکتا لیکن ایمان لانے والے کو دنیا میں بھی بہت سے انعامات میسر آ جاتے ہیں بلکہ ایمان کے پانچ اجزاء میں ہر چیز پر ایمان لانے سے الگ الگ فائدے نظر آتے ہیں۔

عقیدۂ توحید کو ہی لیجیے یعنی اللہ کو ایک ماننا اس بات کا ایمان انسان کو عزت نفس عطا کرتا ہے۔ انسان جب یہ یقین کر لیتا ہے کہ اس کا خالق اور مالک اللہ ہے' وہی طاقت کا سر چشمہ ہے اور وہی قادر مطلق ہے تو اس بات پر ایمان لانے کے بعد انسان صرف اللہ کے سامنے ہی جھکتا ہے اور اسی سے ڈرتا ہے۔ اب اس کی پیشانی انسانوں یا پتھر کی بے جان مورتیوں کے سامنے نہیں جھکتی۔

اللہ پر ایمان لانے کے بعد انسان کو عجز وانکساری جیسی دولت انعام میں ملتی ہے کہ یہ انسان پھر اس بات پر پختہ یقین رکھتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ دیا ہوا ہے سب اسی مالک حقیقی کا ہے' جو خدا دینے پر قادر ہے وہ چھین لینے پر بھی قادر ہے۔ لہٰذا بندے کے لیے تکبر اور غرور کرنے کی گنجائش نہ رہی' اس لیے یہ عجز وانکساری ہی سے کام لے گا تب اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے کو وسعت نظری کی دولت نصیب ہوتی ہے کیونکہ یہ انسان اس رحمان اور رحیم پر ایمان رکھتا ہے جو کائنات کی ہر چیز کا خالق ہے' سب کو اپنی رحمتوں سے نوازتا ہے چنانچہ اللہ پر ایمان رکھنے والے کی ہمدردی' محبت اور خدمت کا جذبہ پوری دنیا کے لیے عام ہوتا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے کے دل سے دوسروں کا خوف نکل جاتا ہے اور وہ بہادری اور استقامت کی خوبیوں والا بن جاتا ہے۔ چاہے بدر کی لڑائی ہو یا حنین وخندق کی۔ ہر مومن کا ایمان ہوتا ہے کہ تمام ظاہر اور پوشیدہ باتوں کو اللہ جانتا ہے' بندہ جانتا ہے کہ میں چھپ کر بھی گناہ نہیں کر سکتا۔ اب مومن کو تقویٰ اور پرہیزگاری اسی ایمان لانے کی بدولت نصیب ہوئی۔ معاشرہ اسی وقت صحیح معنوں میں انسانی معاشرہ بن سکتا ہے جب لوگوں کے اعمال درست ہوں' انسان کے تمام اعمال اس کے دل کے تابع ہوتے ہیں اگر دل میں ایمان کی روشنی موجود ہو تو عمل صالح ہوگا اگر کوئی شخص زبان سے تو ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے اعمال اچھے نہیں تو یہی سمجھا جائے گا کہ ایمان اس کے دل کی گہرائیوں میں پوری طرح رچا نہیں۔

نیک اعمال میں اگر کوئی رکاوٹ نظر آئے تو وہ اس وجہ سے بھی ہو سکتی ہے کہ آخرت پر اس شخص کا ایمان کمزور ہے کیونکہ آخرت پر ایمان لانے سے انسان کے دل میں نیکی پر جزا اور بدی کی سزا کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح جو شخص آخرت کی زندگی پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کی نظر اعمال کے صرف ان ہی نتائج پر نہیں ہوتی جو اس کی زندگی میں ظاہر ہوتے ہیں بلکہ وہ ان نتائج پر بھی نگاہ رکھتا ہے جو آخرت کی زندگی میں ظاہر ہوں گے۔ چنانچہ ایمان رکھنے والے شخص کے دل میں برائیوں سے نفرت ہوتی ہے اور وہ نیک کاموں کو اس طرح ضروری سمجھتا ہے جیسے کھانا پینا' یہ تمام خوبیاں دنیا میں انسان کو بطور انعام اس وقت ملتی ہیں جب یہ شخص ایمان لاتا ہے اور پھر ایمان لانے کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے اور ان تمام خوبیوں اور انعامات کی بدولت آخرت میں فلاح وکامیابی کا حقدار بن جاتا ہے اور یہی ہر انسان کی سب سے بڑی تمنا اور آرزو ہے۔

اللہ ربّ العزت ہمیں اپنے ایمان کو مضبوط بنانے کے ساتھ اس پر مرتب ہونے والے انعامات سے سرفراز فرمائے اور ہم سب کا خاتمہ ایمان پر فرمائے۔ (آمین)

بشکریہ: "درس حدیث" مولانا حافظ فضل الرحیم اشرفی
نائب مہتمم واستاذ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

درندہ

خورشید پیرزادہ

انسانی اقدار اگر تبدیل ہو جائیں تو معاشرہ ایک ایسے جنگل میں تبدیل ہو جاتا ہے جہاں بظاہر انسان رہتے ہیں لیکن ان کی خصلتیں درندوں سے بھی بدتر ہو جاتی ہیں۔ درندے اس وقت ہی کسی جانور کا شکار کرتے ہیں جب بھوک ان کی ہر حس پر غالب آجاتی ہے' ورنہ عام حالت میں وہ کسی پر حملہ نہیں کرتے لیکن جب انسان درندہ بن جاتا ہے تو بلاوجہ اپنے جیسے انسان کو بھنبھوڑنا اس کی فطرت بن جاتی ہے۔ کسی کو قتل کرنے کے لیے وہ کوئی جواز تلاش نہیں کرتا۔ جیسا کہ آج ہمارے پورے ملک خصوصاً کراچی کی گلیوں میں ہو رہا ہے۔ وہاں روزانہ تشدد زدہ بوری بند لاشیں ملتی ہیں۔ خودکش اور پلانٹڈ بم دھماکے ہوتے ہیں' جن میں درجنوں معصوم بچے' خواتین' بوڑھے اور جوان ہلاک ہو جاتے ہیں' نہ مارنے والے کو پتا ہوتا ہے کہ وہ کیوں مار رہا ہے' نہ مرنے والے کو کہ اسے کیوں قتل کیا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ انسان درندہ بن چکا ہے۔ درندگی خون بن کر اس کی رگوں میں دوڑ رہی ہے۔

نئے افق کے قارئین کے لیے خورشیدہ پیرزادہ کی دلچسپ تحریر

سطر سطر تجسس لفظ لفظ ہنگامے لئے ایک طویل ناول

"مگر کیسے' توڑنے کی کوشش کریں تو لوگ جاگ جائیں گے اور بغیر کسی وجہ سے ہم دھر لیے جائیں گے۔" راجو نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"تم بس دیکھتے جاؤ کہ میں اس تالے کو کیسے کھولتا ہوں۔ مراد نے یہ کہتے ہوئے اپنی جیب سے ایک نوکیلی سی چیز نکال کر چابی کی جگہ پر گھسائی۔ "لو کھل گیا تالا۔"

"ارے یہ کیسے ہوا؟" راجو حیرانی سے بولا۔

"وہ بعد میں بتاؤں گا پہلے بھولو کا ٹوائلٹ چیک کرتے ہیں۔"

دونوں نے اندر داخل ہو کر دروازہ بھیڑ لیا۔

"کہاں ہے ٹوائلٹ' ہاں وہ رہا۔" مراد نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دیا۔

ٹوائلٹ میں ابھی بھی وہ قمیص ویسے ہی ٹنگی ہوئی تھی۔

"اس کا مطلب ہے نغمہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی یہ خون کے ہی دھبے ہیں آخر کیا کیا ہے اس بھولو نے آؤ ذرا اب ٹی وی پر رکھے چاقو کا جائزہ بھی لے لیتے ہیں۔" مراد بولا۔

"چاقو ٹی وی پر نہیں ہے استاد۔"

"تمہیں کیسے پتا؟" مراد نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں نے اندر آتے ہی سب سے پہلے ٹی وی پر نظر ڈالی تھی۔" راجو نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

اسی وقت باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی' جسے سن کر مراد اور راجو ٹوائلٹ کے ایک کونے میں دبک کر کھڑے ہو گئے۔

انہیں باہر کمرے میں کسی کے چلنے کی آواز آ رہی تھی' مراد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر راجو کو خاموش رہنے کی ہدایت کی اور اشارے سے پستول مانگا اور راجو نے اپنے نیفے سے پستول نکال کر مراد کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"کون گھسا ہے میرے گھر میں بغیر میری اجازت کے، سامنے آؤ ورنہ پچھتاؤ گے۔" بھولو کی غصے بھری آواز سنائی دی۔

تب ہی بھولو نے اچانک ٹوائلٹ کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول لیا اور دروازہ کھلتے ہی مراد نے پستول بھولو کی طرف تان لیا۔

"ہلنا مت ورنہ بھیجہ اڑا دوں گا یہ چاقو نیچے پھینکو۔ بہت خون کر لیے تم نے اس سے، اب اور نہیں۔" مراد غرایا۔

"یہ کیا بکواس ہے ایک تو میرے گھر کا تالا توڑ کر گھستے ہو اوپر سے مجھے ہی قاتل بتاتے ہوئے۔" بھولو نے جیسے شکایتاً کہا۔

"کیا تم نغمہ کا پیچھا نہیں کر رہے تھے۔" راجو نے پوچھا۔

"میں کیا پاگل ہوں جو اس کا پیچھا کروں گا۔" بھولو بولا۔

"ہم جانتے ہیں کہ تم ہی وہ خونی قاتل ہو جس نے شہر میں دہشت پھیلا رکھی ہے۔" اس بار مراد نے کہا۔

"راجو تم بھی اپنے استاد کی طرح پاگل ہو گئے ہو کیا۔"

"اچھا میں پاگل ہو گیا ہوں، تو یہ بتاؤ کہ تمہاری اس قمیص پر خون کے دھبے کیا کر رہے ہیں اور تمہارے چاقو پر بھی خون کے نشان ہیں، نغمہ نے یہ سب دیکھ لیا تھا اور ہمیں ساری بتا دی تھی، اسی وجہ سے ہم یہاں آئے ہیں۔" راجو نے تفصیل سے اس کا جرم بتاتے ہوئے کہا۔

راجو کی یہ بات سنتے ہی بھولو زور زور سے ہنسنے لگا اور بولا۔ "تو اس نے بتایا ہے یہ سب، کیا اس نے یہ نہیں بتایا کہ میں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ بڑے نخرے دکھا رہی تھی۔"

"وہ بھی بتایا اور یہ بھی بتایا، تم ہنس کیوں رہے ہو؟" مراد غصے سے بولا۔

"ارے بھائی بات یہ ہے کہ آج میں نے اپنے ہاتھ سے مرغی ذبح کی تھی۔ میں بازار سے زندہ مرغی لایا تھا اور حلال کرتے وقت خون کے دھبے میری قمیص پر لگ گئے کیونکہ مرغی بہت زور زور سے اچھل رہی تھی، اور ویسے بھی میں مرغی کاٹنے میں ماہر تو ہوں نہیں، بڑی مشکل ہو گئی تھی مجھے، تم چاہو تو یہ قمیص لے جاؤ اور کسی لیبارٹری سے اس پر لگے دھبوں کا ٹیسٹ کروا لو، رہی بات چاقو کی تو اس کی وجہ بھی تم سمجھ ہی گئے ہو گے، اسی چاقو سے حلال کی تھی میں نے وہ مرغی، اب بتاؤ کچھ اور بھی سننا ہے۔" بھولو نے ہر چیز کی وضاحت کر دی تھی۔

مراد اور راجو ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

"تمہاری اس نغمہ کی وجہ سے ہم آج اچھے خاصے بے وقوف بن گئے کیوں راجو۔" مراد راجو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"اچھا تو اسی لیے وہ اتنی جلدی یہاں سے بھاگی تھی اب سمجھا۔" بھولو ہنستے ہوئے بولا۔

"تو کیا واقعی میں تم نغمہ کے پیچھے نہیں گئے تھے۔" راجو نے پھر پوچھا۔

بھولو نے اپنی جیب سے سگریٹ کا نیا پیکٹ نکالتے ہوئے کہا۔ "میں سگریٹ کا پیکٹ لینے گیا تھا۔ یقین نہ ہو تو پان والے سے پوچھ لو۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اب ساری بات صاف ہو گئی ہے۔" راجو نے کہا۔

"ویسے ایک بات تو بتاؤ۔"

"پوچھو؟" راجو نے کہا۔

"پولیس والا میں ہوں اور پولیس کی طرح تفتیش تم کرتے پھر رہے ہو۔" بھولو نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"سوری یار بھولو، وہ ہم نغمہ کی باتوں میں آ گئے تھے اب ہم چلتے ہیں۔ تم آرام کرو۔" راجو نے اس کے مزید سوالوں سے بچنے کے لیے کہا۔

"اور کوئی بات ہو تو بلا جھجک آ جانا۔" بھولو نے دریا دلی سے کہا۔

دونوں منہ لٹکائے واپس مراد کے کمرے کی طرف چل پڑے۔

"استاد کچھ بھی ہو۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ نغمہ کا پیچھا کرنے والا وہی درندہ تھا۔" راجو نے پریقین لہجے میں کہا۔

"کیا تم نے واقعی کھڑکی میں کسی کو دیکھا تھا۔" مراد کا لہجہ غیر یقینی کی کیفیت لیے ہوئے تھا۔

"کیا بات کرتے ہو استاد، بالکل دیکھا تھا۔ ہاں چہرہ صاف دکھائی نہیں دیا تھا۔ لیکن مجھے اور میڈم کو اس کی پرچھائیں صاف نظر آ رہی تھی۔"

"آج کی رات ہمیں چوکنا رہنا ہو گا، مجھے یقین ہے کہ وہ درندہ ضرور یہیں کہیں آس پاس ہے۔" مراد کو اپنی اس بات پر پورا یقین تھا۔

انہی باتوں میں مراد کا کمرہ آ گیا۔

"کیا ہوا۔ تم دونوں کے چہرے کیوں لٹکے ہوئے ہیں؟" وردا نے پوچھا۔

"کچھ نہیں...... کچھ بھی ہاتھ نہیں لگا، پتا نہیں کہاں غائب ہو گیا وہ۔" راجو نے جواب دیا۔

"تمہیں بھولو کے گھر جانا چاہئے تھا نا۔" نغمہ بولی۔

"وہیں سے تو آ رہے ہیں مرغی کا خون تھا اس کی قمیص اور چاقو پر، مرغی حلال کرتے وقت لگ گیا تھا۔" مراد نے بتایا۔

"کیا کہہ رہے ہو...... اس کا مطلب ہے میں نے بنا کسی وجہ کے اپنا مزا خراب کیا۔" نغمہ کے لہجے میں افسوس تھا۔

"بالکل، اگر تم یہاں نہ آتیں تو بھولو دوسری فرمائش۔" مراد نے ہنستے ہوئے کہا اور بات کے بیچ میں ہی راجو نے اسے اشارہ کیا۔

"استاد میڈم کے سامنے تو ایسی باتیں نہ کرو، پتا ہے نا انہیں اچھی نہیں لگتیں ایسی باتیں۔"

"میری مرضی تھی اس کی دوسری فرمائش پوری کرتی یا نہیں تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے۔" نغمہ نے راجو کو گھورا۔

"نغمہ پلیز۔" وردا اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر چلائی۔

"ٹھیک ہے میں چپ ہو جاتی ہوں۔ یہ لو اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی ہے میں نے۔" نغمہ ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔

مراد نے دھیمے لہجے میں نغمہ سے اپنی پہلی ملاقات کی باتیں شروع کر دیں۔ نغمہ بھی پہلے تو آہستہ آواز میں جواب دیتی رہی پھر اس کی آواز بلند ہونے لگی۔

"مجھے بھی بہت مزا آیا تھا۔"

اس کی یہ بات سن کر مراد نے گھبرا کر وردا کی طرف دیکھا اور نغمہ کو ڈانٹتے ہوئے بولا۔ "چپ کر، میں کچھ پوچھ رہا ہوں اور تم کچھ جواب دے رہی ہو۔"

"تم لوگ میرا مذاق اڑا رہے ہو، میں جا رہی ہوں۔" نغمہ خفگی سے بولی۔

تبھی انہیں دروازے کے باہر کچھ آہٹ سنائی دی۔

"شش...... لگتا ہے باہر کوئی ہے۔" راجو نے دھیرے سے کہا۔

مراد نے فوراً کمرے کی لائٹ بند کردی۔

"پستول کہاں ہے؟" مراد نے راجو سے پوچھا۔

"تمہیں ہی تو دیا تھا بھولو کے گھر پر، وہیں چھوڑ آئے کیا۔"

مراد نے اپنے کپڑے ٹٹولے۔ "اوہ...... یاد آیا وہ میں نے بھولو سے باتوں کے دوران بے خیالی میں ٹوائلٹ کے واش بیسن پر رکھ دیا تھا اٹھانا یاد نہیں رہا۔"

"گئی بھینس پانی میں اب خالی ہاتھ باہر نکلنا ٹھیک نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں ہاکی تو ہے نا اپنے پاس۔" مراد نے ایسے کہا جیسے اس کے پاس ہاکی نہیں راکٹ لانچر ہو۔

"سوچ لو مجھے باہر نکلنا ٹھیک نہیں لگ رہا باقی تمہاری مرضی۔" راجو بولا۔

"ڈرو مت جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" مراد نے کہا۔

"تو ٹھیک ہے کھولو دروازہ۔"

مراد نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور دائیں بائیں جھانک کر دیکھا۔ "یہاں تو کوئی نہیں ہے۔"

"استاد اندر آجاؤ، ہمارے سے کوئی کھیل کھیل رہا ہے، ہم اس کے کھیل میں نہیں پھنسیں گے، صبح دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔" راجو نے اسے سمجھایا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" یہ کہتے ہوئے مراد نے دروازہ بند کرلیا۔

"کیا ہوا...... کوئی دکھائی دیا کیا۔" وردا نے تشویش سے پوچھا۔

"نہیں، باہر کوئی نہیں ہے۔" مراد نے جواب دیا۔

"مجھے میرے گھر چھوڑ آؤ، میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں رک سکتی۔ ضرور وہ قاتل تم لوگوں کے پیچھے ہے۔" نغمہ نے ڈری ہوئی آواز میں کہا۔

"بھول گئیں اسے اس گھر کا راستہ بھی تم نے ہی دکھایا تھا۔" مراد نے کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتی مجھے میرے گھر جانا ہے بس۔" نغمہ نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

"نغمہ سمجھنے کی کوشش کرو اس وقت گھر سے باہر نکلنا ٹھیک نہیں ہے وہ قاتل باہر ہی گھوم رہا ہے تم آج یہیں رک جاؤ۔" راجو نے مشورہ دیا۔

"مگر سحرش گھر میں اکیلی ہے۔" نغمہ کی آواز میں وسوسہ تھا۔

"تو کیا ہوا وہ کل بھی تو اکیلی تھی تم یہیں سو جاؤ آج رات، میں بھی یہیں رک رہا ہوں۔" راجو بولا۔

"چل ٹھیک ہے تم کہتے ہو تو رک جاتی ہوں، مگر اپنے استاد کو سمجھا دینا میرے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرے۔" نغمہ نے مراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

حالانکہ وردا نے کل رات سے پلک تک نہیں جھپکائی تھی۔ مگر ڈر اور خوف کے ملے جلے جذبات نے جیسے اس کی نیند ہی چھین لی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ شاید آج رات آرام نصیب ہو جائے گا مگر آج رات بھی یہی کیفیت تھی۔

"اب یہ رات کیسے کٹے گی یہ تو کل سے بھی زیادہ بھیانک بن گئی ہے۔" وردا نے بڑبڑاتے ہوئے ذومعنی جملہ کہا۔

"بیت ہی جائے گی تم ڈرو مت میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔" نغمہ نے اسے تسلی دی۔

"تم ہو تب ہی تو کہہ رہی ہوں۔" وردا دھیرے سے بدبدائی۔

"کیا کہا تم نے؟" نغمہ کچھ سن نہیں پائی تھی۔

"کچھ نہیں، بس یہی کہ بستر ایک اور ہم چار۔" وردا نے پریشانی بتائی۔

"کوئی بات نہیں ہم دونوں بستر پر لیٹ جائیں گے اور یہ دونوں نیچے چٹائی پر۔" نغمہ نے حل پیش کردیا۔

"تمہارے ساتھ نہیں لیٹوں گی میں۔" وردا جلدی سے بول پڑی۔

"تو کیا ان دونوں کے ساتھ لیٹو گی۔" نغمہ کھلکھلا پڑی۔

"چپ کرو نغمہ، میڈم کو پریشان مت کرو۔" راجو نے اسے ڈانٹا۔

"بھئی میں تو سونے جا رہی ہوں۔ جسے میرے ساتھ سونا ہو آجائے۔" نغمہ نے کہا اور رضائی میں گھس گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ رضائی میں گھستے وقت اس نے مراد کو آنکھ ماردی تھی۔ اور مراد ہنس پڑا۔

مرتی کیا نہ کرتی وردا رضائی کا دوسرا کونا پکڑ کر اندر دبک گئی۔ رضائی ڈبل بیڈ والی تھی اس لیے دونوں آسانی سے اس میں سما گئیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"آرہی ہو کیا۔"

"ہاں آ تو رہی ہوں مگر تمہارے گھر کے باہر جو پولیس والے ہیں ان کا کیا؟"

"ان کی فکر مت کرو، وہ میری حفاظت کے لیے ہیں نا کہ مزا خراب کرنے کے لیے۔"

"کل رات تو مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تھے اور اب تمہیں بے چینی ہو رہی ہے۔"

کل جانا ضروری تھا تم نہیں سمجھو گی تڑپاؤ مت جلدی آجاؤ نا۔"

"کل کتنا اچھا موقع تھا، آج رات تو میرا شوہر بھی واپس آجائے گا، پہلی بار پوری رات تھی ہمارے پاس تم نے سب گڑبڑ کردی۔" لہجے میں شکایت تھی۔

"وہ رات کے دو بجے پہنچے گا۔ تب تک ہمارے پاس کافی وقت ہوگا۔"

"میں زیادہ دیر نہیں رکوں گی آخر مجھے اپنے شوہر کی بھی تو خدمت کرنی ہے۔"

"اب آ بھی جاؤ میری پیاری مینا ورنہ باتوں باتوں میں ہی دو بج جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے میں آرہی ہوں مگر دھیان رکھنا میری عزت کا سوال ہے۔ پولیس والے تو مجھے دیکھیں گے ہی گھر میں آتے ہوئے۔"

"میں نے کہا نا تم فکر مت کرو انہیں میں سنبھال لوں گا۔"

"ٹھیک ہے میں پندرہ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔"

"کیسے آؤ گی؟"

"شوہر کی ایف ایکس ہے نا۔"

"ٹھیک ہے جلدی آجاؤ۔" یہ کہہ کر سہیل نے فون بند کردیا۔

تھوڑا سوچنے کے بعد سہیل باہر آیا اور ایک سپاہی سے بولا۔ "دیکھو بھائی مجھ سے ملنے میرا کوئی گیسٹ آرہا ہے۔"

"کون آرہا ہے؟" سپاہی نے پوچھا۔

"بس ہے کوئی۔" سہیل نے جواب گول کردیا۔

"سب انسپکٹر صاحب کا حکم ہے کہ ان سے پوچھے بنا کوئی آپ سے نہیں مل سکتا۔" سپاہی نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"عجیب بات کر رہے ہو تم بھی، میں تو عینی شاہد بن کے پھنس گیا اسی لیے تو کوئی پولیس کے پھڈے میں نہیں پڑنا چاہتا۔" سہیل نے منہ بنا کر کہا۔

"کیوں انور تم کیا کہتے ہوئے وحید صاحب سے بات کروں کیا۔" سپاہی نے اپنے ساتھ سے مشورہ مانگا۔

"ابے چھوڑ نا یار، آنے دو اس کے گیسٹ کو تجھے کیا پرابلم ہے؟"

"مجھے کیوں پرابلم ہوگی کہیں وحید صاحب سے ڈانٹ نہ پڑ جائے۔" سپاہی کے دل میں وحید ملک کا ڈر بھی تھا۔

"تمہارا گیسٹ یہاں رکے گا تو نہیں نا۔" انور نے سہیل سے پوچھا۔

"ارے نہیں بھائی بس حال چال پوچھ کر چلا جائے گا۔" سہیل فوراً بولا۔

"پھر ٹھیک ہے۔ کوئی پرابلم نہیں ہے۔" انور نے کہا۔

اسی دوران گھر کے باہر ایک ایف ایکس کار آ کر رکی۔

"کیا یہی ہے تمہاری مہمان۔" سپاہی نے مینا کو دیکھ کر کہا۔

"ہاں۔" سہیل نے جواب دیا۔

"پہلے ہی بتا دیتے کہ گیسٹ کوئی خاتون ہے تو ہم اتنا کچھ پوچھتے ہی نہیں۔" انور نے ہنس کر کہا۔

سہیل نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"آؤ مینا میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" سہیل نے مینا سے کہا۔

مینا سہیل کے ساتھ اندر آ گئی اور اندر آتے ہی سہیل نے دروازہ بند کر لیا۔

"ان پولیس والوں کے سامنے میرا نام لینے کی کیا ضرورت تھی۔" مینا نے تھوڑا غصے سے کہا۔

"چھوڑ نا یہ سب۔" اچانک سہیل کے منہ سے نکل گیا۔

"بستر ویسے کا ویسا پڑا ہے جیسا میں چھوڑ کر گئی تھی۔"

"تم کس وقت گئی تھیں؟" سہیل نے پوچھا۔

"صبح چھ بجے تک تمہارا انتظار کیا تھک ہار کر جانا ہی پڑا۔" مینا نے بتایا۔

"فکر مت کرو ساری کسر پوری کر دوں گا۔" سہیل نے ہنستے ہوئے کہا۔

باہر انور اپنے ساتھی سپاہی سے کہہ رہا تھا۔ "اندر کا موسم کچھ گرم ہونے والا ہے اندر دیکھنے کی کوئی ترکیب کرو یار ٹائم ہی پاس ہو جائے گا ویسے بھی یہاں کھڑے کھڑے بور ہی ہونا ہے۔"

"میں خود یہی سوچ رہا ہوں مگر کوئی راؤنڈ پر آ گیا تو مصیبت ہو جائے گی۔"

"دیکھی جائے گی یار کسی کے ڈر سے کیا ہم یہاں کھڑے بور ہوتے رہیں۔" انور بولا۔

"ٹھیک ہے چل پھر کرتے ہیں کچھ۔"

اندر صوفے پر مینا اور سہیل برابر برابر بیٹھے تھے۔

"پولیس والے بڑی گندی نظر سے دیکھ رہے تھے مجھے۔" مینا نے کہا۔

"ارے ان کی کیا غلطی ہے تم چیز ہی ایسی ہو۔" سہیل ہنس کر بولا۔

"اچھا اس کا مطلب ہے کہ میں کسی بھی ایرے غیرے کو ایسے ہی گھورنے دوں۔"

"چھوڑو نا پولیس والوں کو ان کی تو نظر ہی گندی ہوتی ہے۔" سہیل کو ان باتوں سے کوفت ہو رہی تھی۔

"ویسے تمہاری بھی نظریں کم گندی نہیں ہیں ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔"

"تمہارے جوبن پر ٹکی ہیں میری نگاہیں کیا جوبن پایا ہے تم نے۔"

اور دونوں ایک دوسرے میں کھونے لگے۔ اس بات سے بے خبر کہ دونوں سپاہیوں نے اندر کا براہ راست پروگرام دیکھنے کا بندوبست کر لیا تھا۔

"ہم تو ابھی بھی اسے گھور رہے ہیں اس میں ہماری کیا غلطی ہے' کیوں بھائی؟" انور بولا۔

"بالکل۔" وہ ہنس پڑا۔

"زور سے مت ہنسو انہوں نے سن لیا تو مزا کرکرا ہو جائے گا۔" انور نے اسے ٹوکا۔

"سوری یار تمہاری بات پر ہنسی آ گئی۔"

"کاش تمہارا شوہر روزانہ ٹور پر جایا کرے ہمارے مزے ہو جائیں گے۔" اندر سہیل' مینا سے کہہ رہا تھا۔

باہر دونوں سپاہیوں کی رال ٹپک رہی تھی۔

"کیا خوبصورت ہے یار اور اس کی خوبصورتی نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے اسے اب حاصل کرنا ہی پڑے گا ورنہ ہر وقت دماغ میں اس کا سراپا گھومتا رہے گا۔" انور آنکھیں میچتا ہوا بولا۔

"مگر کیسے یہ مت بھولو کہ ہم یہاں ڈیوٹی پر ہیں۔"

"سوچنے میں کیا برائی ہے یار ملے نا ملے آگے اپنی قسمت۔"

"اسے پھنسانے کی کوئی ترکیب کرنی پڑے گی۔"

"ہاں یار۔ ایسا موقع بار بار کہاں ملتا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو چلو اب اندر طوفان تھم چکا ہے۔"

"ہاں چلو گیٹ پر چلتے ہیں کہیں صاحب راؤنڈ پر نہ آ جائے۔" دونوں وہاں سے ہٹ کر اپنی ڈیوٹی کی جگہ پر واپس آ کر کھڑے ہو گئے۔

"مجھے باہر کسی کی آہٹ محسوس ہوئی تھی۔" مینا بول رہی تھی۔

"مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیا۔"

"ہو سکتا ہے مجھے وہم ہوا ہو مگر پھر بھی تم چیک کر لینا۔" مینا نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" سہیل نے مختصر سا جواب دیا۔

"ایک بات اور پوچھنی تھی تم سے۔" مینا اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"وہ کیا؟"

"کیا تم نے سچ میں اس لڑکی کو خون کرتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" سہیل نے اسے گھورا۔

"نہیں' میرا مطلب ہے کہ وہ لڑکی دیکھنے میں قاتل بالکل بھی نہیں لگتی۔"

"تم کون سا دیکھنے میں بے وفا لگتی ہو۔ مگر تم اپنے شوہر سے بے وفائی کر رہی ہو۔" سہیل نے اس کا وار اسی پر پلٹ دیا۔

"ایسی بات نہیں ہے میرے شوہر کے علاوہ صرف تم ہی میری تنہائیوں کے ساتھی ہو ورنہ تو ایک دنیا گھومتی ہے میرے آگے پیچھے۔"

"وہ تو ہے' چل ناراض مت ہو میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

"ویسے رات کو کس کے ساتھ گئے تھے تم اور اس سیریل کلر تک کیسے پہنچ گئے۔" لگتا تھا مینا کے دل میں کئی سوال ابھر رہے تھے۔

"تم کیا کرو گی یہ سب جان کر؟"

"او کے اب میں جا رہی ہوں بہت دیر ہو رہی ہے۔" مینا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو صرف ساڑھے گیارہ ہی بجے ہیں' جا کر کیا کرو گی ایسا کرو اپنے شوہر کو فون کر دو کہ تم کسی کی شادی کا فنکشن اٹینڈ کر رہی ہو۔" سہیل نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"تو کیا رات کے دو بجے نکلوں یہاں سے' اس وقت سڑکیں بالکل سنسان ہوتی ہیں اور رہی بات شادی میں جانے کی تو وہ ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ابھی شام کو ہی بات ہوئی تھی میری ان سے' اچانک شادی کا بہانہ بنانا ٹھیک نہیں ہے۔" مینا نے اسے سمجھایا۔

"سڑکیں تو اس وقت بھی سنسان ہوں گی اس

سیریل کلر کا خوف جو چھایا ہوا ہے ہر طرف۔“

”کچھ بھی ہو مجھے جانا تو ہے ہی۔“

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔“ سہیل نے کہا۔

سہیل کو گڈ نائٹ کہہ کر مینا باہر کی طرف چلی اور سہیل واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

باہر آ کر مینا نے اپنی کار اسٹارٹ کی۔ لیکن کسی وجہ سے کار اسٹارٹ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

”میں کچھ مدد کروں کیا۔“ انور نے مینا کے پاس آتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں شکریہ یہ میری کار ہے اور مجھے پتا ہے کہ یہ کیسے اسٹارٹ ہوتی ہے۔“ مینا نے بے رخی سے جواب دیا۔

انور نے اپنا ایک ہاتھ مینا کے کندھے پر رکھ دیا۔ ”اندر تو بہت اچھی مہمانداری چل رہی تھی۔“

مینا نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”تو تم سب دیکھ رہے تھے، شرم نہیں آتی تمہیں۔“

”اس نے اکیلے نہیں دیکھا تھا۔ میں بھی تھا اس کے ساتھ، ہم تو دیوانے ہو گئے ہیں تمہارے۔“

”شٹ اپ، میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے اپنی یہ بکواس کہیں اور جا کر سناؤ۔“ مینا غصے سے بولی۔

مینا نے ایک بار پھر ٹرائی کی اور کار اسٹارٹ ہو گئی اور دوسرے ہی لمحے وہ وہاں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

”سوچ لینا اور ملنا ہو تو ہم یہیں ملیں گے۔“ انور نے اسے آواز لگائی اور دونوں ہنسنے لگے۔

اور اسی وقت ایک آہٹ سنائی دی۔

”یہ آواز کہاں سے آئی۔“ سپاہی مقصود نے کہا۔

”پتا نہیں ایسا لگتا ہے گھر کے اندر سے آئی ہے۔“ انور بولا۔

اور پھر لگاتار آوازیں آنے لگیں۔

”آواز گھر کے پیچھے سے آ رہی ہے۔“ مقصود نے کہا۔

”چلو چل کر دیکھتے ہیں کہ کیا گڑبڑ ہے۔“

وہ دونوں تیزی سے گھر کے پیچھے آ گئے۔ مگر وہاں پہنچتے ہی دونوں کے ہوش اڑ گئے۔

سہیل خون میں لت پت تھا اور کھڑکی کا شیشہ پیٹ میں گھسا ہوا تھا۔

”ایمبولینس بلاؤ جلدی اور ہاں ملک صاحب کو بھی فون کر دینا۔“ انور یہ کہہ کر گھر کے دروازے کی طرف بھاگا۔

دروازہ کھلا ہوا ہی تھا انور بھاگتا ہوا گھر کے اندر اس جگہ پہنچا جہاں سہیل کھڑکی پیٹ رہا تھا۔

”ایمبولینس آ رہی ہے۔“ مقصود بھی اس کے پیچھے پیچھے آ گیا۔

”اب کوئی فائدہ نہیں یہ مر چکا ہے۔“ انور نے کہا۔

”اپنی تو سمجھو نوکری گئی۔“ مقصود کے لہجے میں نوکری جانے کا اور انکوائری کا خوف نمایاں تھا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے کیا وہ لڑکی اسے مار کر گئی ہے۔“

”شش۔“ انور نے مقصود کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

”جس نے بھی اسے مارا ہے ابھی یہیں چھپا ہوا ہے۔ تم اس کمرے میں دیکھو میں واش روم کچن اور اسٹور کی تلاشی لیتا ہوں۔“ انور نے آہستہ آواز میں مقصود کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے کوئی بھی گڑبڑ ہو تو زور سے آواز دے دینا۔“

”او کے...... چوکنا رہنا۔“

انور واش روم کی طرف بڑھا اور مقصود دوسرے کمرے کی طرف۔

انور نے واش روم کا دروازہ کھول کر دیکھا لیکن وہ اپنے پیچھے کھڑے سائے کو نہیں دیکھ پایا۔

”کیا ڈھونڈ رہے ہو۔“ وہ سایہ بولا۔

انور تیزی سے مڑا اور اتنی ہی تیزی سے تیز دھار خنجر نے اس کے پیٹ کو چیر کر رکھ دیا۔

”مق......“ انور کے منہ سے صرف اتنا ہی نکل پایا کیونکہ اگلے ہی پل سائے نے اس کے منہ کو دبوچ کر اس کا گلا کاٹ دیا۔ انور منہ کے بل فرش پر گر پڑا۔ اس کی روح اس کے جسم سے پرواز کر چکی تھی۔

جب انور فرش پر گرا تو زور کی آواز آئی۔ مقصود اسے سن کر باہر آیا۔

”انور کہاں ہو تم...... یہاں تو کوئی نہیں ہے تمہیں کچھ ملا کیا۔“ مقصود نے پوچھا۔

جب کوئی جواب نہیں ملا تو مقصود واش روم کی طرف بڑھا۔ وہ سایہ مقصود کو آتا دیکھ کر دیوار سے چپک گیا۔

مقصود دوڑتا ہوا انور کے قریب آیا۔ ”انور...... انور۔“

بس اتنا ہی بول پایا تھا بیچارہ مقصود، کیونکہ اگلے ہی پل سائے نے اس کی گردن بھی چیر دی تھی۔ مقصود لڑکھڑا کر انور کے اوپر گر گیا نیچے گرتے ہوئے اس نے سائے کو دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔

”مجھے ڈھونڈ رہے تھے اب ہو گئی تسلی۔“ وہ سایہ ہنستا ہوا بولا۔

مگر مقصود اس کی بات کا جواب دینے سے پہلے ہی دم توڑ چکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

”استاد لائٹ بند کر دوں یا جلتی رہنے دوں۔“ راجو نے پوچھا۔

”ارے لائٹ بند کر دو۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے روشنی میں مجھے نیند نہیں آئے گی۔“ نغمہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے بند کر دیتا ہوں۔“

وردا نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا اور کروٹ لیے لیٹی رہی۔

”ویسے تمہاری نوکری کا کیا ہوا، یا پھر سب کام دھندے چھوڑ کر قاتل کے پیچھے پڑے ہو۔“ نغمہ نے پوچھا۔

”ارے بھولو سے میں نے کہا تو تھا کہ پتا کرے مگر اس نے ابھی تک کچھ بتایا ہی نہیں ہے۔“ راجو بولا۔

”بنا پیسے دیئے بھرتی نہیں ہوتی پولیس میں، اپنی امید چھوڑ ہی دو۔“ مراد نے اسے سمجھایا۔

”کیسی بات کرتے ہوئے استاد، لسٹ میں تو میرا نام تھا نا، جوائننگ ہی لیٹ ہو رہی ہے۔“

”چھ مہینے ہو گئے ہیں اس بات کو، سمجھنے کی کوشش کر تیرا نام غلطی سے آ گیا ہو گا لسٹ میں جب تم نے کوئی پیسہ ہی نہیں دیا تو تمہاری سلیکشن کیسے ہو گی بے سب نے پچاس پچاس ہزار روپے دیئے تھے لسٹ میں آنے کے لیے اور تم فری میں آ گئے ایسا ہوتا ہے کیا کبھی باقی سب کی جوائننگ ہو گئی اور صرف تمہاری اٹکی پڑی ہے۔“ مراد نے اسے حقیقت کا آئینہ دکھاتے ہوئے کہا۔

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر نہ جانے کیوں مجھے امید ہے کہ جس طرح لسٹ میں میرا نام آیا تھا ویسے ہی میری جوائننگ بھی ہو جائے گی اور ایک بار میں پولیس میں چلا گیا تو اس درندے کی خیر نہیں۔“ راجو نے ناامید ہوتے ہوئے بھی امید کا دامن ابھی نہیں چھوڑا تھا یا شاید یہ دامن ہی اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”میرا راجو خواب بہت دیکھتا ہے۔“ نغمہ نے بیچ میں دخل دیا۔

”تم سے محبت اس نے پہلے خواب میں ہی کی تھی پھر حقیقت میں بھی کر ہی لی۔“ مراد ہنس پڑا۔

"تم نے ہی سکھائی ہیں اسے الٹی سیدھی باتیں ورنہ پہلے تو میرا راجو بہت سیدھا بندہ تھا۔"

راجو نے مراد کو کہنی ماری۔ "کیا کرتے ہو استاد میڈم کا تو خیال کیا کرو، تم بھی نغمہ کی طرح کچھ بھی بول دیتے ہو اور اسے بھی موقع مل جاتا ہے کچھ نہ کچھ بولنے کا۔"

"کیا کروں یونہی زبان پھسل جاتی ہے جیسے کبھی کبھی تیری پھسل جاتی ہے ویسے تم یہ بتاؤ کہ تمہیں میڈم کی اتنی فکر کیوں رہتی ہے کہیں اس پر تیرا دل تو نہیں آ گیا۔" مراد نے آہستہ سے کہا۔

"ارے نہیں استاد...... میں تو بس۔"

"میڈم کا پیار ملنا مشکل ہے خواب دیکھنا چھوڑ دو۔" مراد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے جیسا تم سوچ رہے ہو، مجھے تو بس انسانیت کے ناتے ہمدردی ہے میڈم سے، یہ سچ ہے کہ میڈم بہت خوبصورت ہے مگر میں ان کے بارے میں کچھ غلط نہیں سوچتا۔" راجو نے اپنی صفائی دیتے ہوئے کہا۔

"کیوں بے ٹی وی پر میڈم کی تصویر دیکھ دیکھ کر تو تیرے دل میں ہلچل ہونے لگی تھی اور اب ایسی باتیں کر رہا ہے۔" مراد نے اسے چھیڑا۔

"اس وقت کی بات اور تھی تب تک میں میڈم سے ملا نہیں تھا نا مل کر ان کے بارے میں کچھ اور ہی احساس ہو رہا ہے۔"

"سالے کہیں تجھے ان سے پیار تو نہیں ہو گیا، شادی شدہ ہے وہ۔"

"میں ان کی عزت کرتا ہوں بس میرے دل میں ان کے بارے میں کوئی غلط خیال نہیں ہے، ہر لڑکی ایک جیسی نہیں ہوتی، سمجھا کرو استاد۔" راجو بڑی بڑی باتیں کر رہا تھا۔

"اچھا ایک بات بتا، سحرش کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے، یا پھر وہاں بھی تیرے نیک ارادے ہیں۔" شاید مراد اسے پوری طرح گھسنے کے چکر میں تھا۔

"سحرش کے بارے میں ارادے بالکل بھی نیک نہیں ہیں، مگر لگتا ہے وہ اپنا سب کچھ کہیں اور ہار چکی ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ وکی ہی اس کا سب کچھ ہے۔" راجو نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا۔

ادھر نغمہ بار بار کروٹیں بدل رہی تھی۔

"اُف، عجیب بستر ہے یہاں تو نیند ہی نہیں آ رہی ہے۔" نغمہ دھیرے سے بڑبڑائی۔

اچانک وہ وردا کے قریب ہو کر اس سے چپک گئی۔ "سو گئیں کیا۔"

"کیا ہے، دور ہٹو۔" وردا نے اسے ڈانٹا۔

"گھبراؤ مت میں ایسی لڑکی نہیں ہوں، مجھے تو صرف مردوں کا ساتھ اچھا لگتا ہے۔" نغمہ نے کہا۔

"پھر بھی مجھ سے دور رہو مجھے نیند آ رہی ہے کل رات سے جاگ رہی ہوں میں۔"

"مجھے تو بالکل بھی نیند نہیں آ رہی ہے اس بستر پر، تم کیسے سو رہی ہو؟" نغمہ نے بیزاری سے کہا۔

"آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ نیند آ جائے گا۔" وردا نے صلاح دی۔

"راجو بہت خیال کرنے لگا ہے تمہارا مجھے بہت فکر ہونے لگی ہے کہیں تم اسے مجھ سے چھین نہ لو۔" نغمہ نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"مجھے راجو سے کوئی دلچسپی نہیں ہے سمجھیں تم، کتنی بار بتاؤں ویسے تو تم ہر کسی کے ساتھ چل پڑتی ہو۔ پھر راجو کے ساتھ اتنا لگاؤ کیوں ہے تمہیں۔"

"تم ابھی نہیں سمجھو گی اس کے جیسا پریمی ملے گا نا تب ہی سمجھ پاؤ گی تم۔" نغمہ بولی۔

"مجھے سمجھنا بھی نہیں ہے۔" وردا ہونٹ سکیڑ کر

بولی۔

"جیسا راجو پیار جتاتا ہے ویسے کوئی اور نہیں جتا سکتا۔ خاص طور سے جن آدمیوں سے میں آج تک ملی ہوں وہ سب راجو کے آگے پھیکے ہیں۔" نغمہ اپنے محبوب کے بارے میں رطب اللسان تھی۔

"یہ سب بکواس ہے۔" وردا بڑبڑائی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں اس کا انداز ہی نرالا ہے پیار جتانے کا۔" یہ کہتے ہوئے نغمہ وردا کی پیٹھ سہلانے لگی۔

وردا نے نغمہ کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "مجھے چھونے کی کوشش مت کرو۔"

"کیوں کیا ہوا، کچھ کچھ ہوتا ہے کیا، مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم بھی بہت کچھ ثابت ہو سکتی ہو، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے مجھے ایسی الٹی سیدھی باتیں سوچنے کی فرصت نہیں ہے۔" وردا نے کہا۔

"یہ تم نہیں تمہاری کم علمی بول رہی ہے کیونکہ تم مردوں کے بارے میں زیادہ جانتی ہی کیا ہو۔" نغمہ نے اپنی علمیت کا رعب جمایا۔

"میں تمہارے علم کی ساری باتیں سن چکی ہوں۔"

"سچ بتاؤ۔ کیا تمہیں تمنا نہیں ہوتی کہ تمہارا بھی کوئی مرد دوست ہو۔"

"اب کیا اسٹامپ پیپر پر لکھوا کر دوں کہ نہیں نہیں نہیں۔" وردا نے جھلا کر کہا۔

"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ تمہاری اپنی زندگی ہے جیسے بھی جیو، ویسے تمہارا شوہر بہت بے وقوف تھا جو تم جیسی بیوی کی قدر نہیں کر سکا۔"

"اب دور ہو کر سو جاؤ میری نیند خراب مت کرو۔" وردا نے اسے دور ہٹاتے ہوئے کہا۔

"او کے میڈم، میں تو یونہی حال چال پوچھ رہی تھی...... گڈ نائٹ۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆

"اوہ...... میں اپنے گلے کی چین شاید سہیل کے گھر بھول آئی ہوں۔" مینا نے اپنے گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا۔

مینا اپنے گھر پہنچ چکی تھی اسے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے سہیل کے گھر سے آنے کے بعد وہاں کیسا خونی تماشہ کھیلا جا چکا تھا۔

"میں سہیل کو فون کر کے پوچھ لیتی ہوں۔"

یہ سوچ کر مینا نے سہیل کا نمبر ڈائل کیا لیکن دوسری طرف سے کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا اور اٹھاتا بھی کیسے اسے تو سیریل کلر دنیا سے ہی اٹھا چکا تھا۔

"کیا بات ہے، یہ سہیل فون کیوں نہیں اٹھا رہا۔" وہ بڑبڑائی پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب دینے لگی۔

"شاید سو گیا ہوگا میں بھی تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتی ہوں صبح بات کروں گی سہیل سے۔"

یہ سوچ کر وہ بستر پر ڈھیر ہو گئی۔

"سہیل کے ساتھ کب تک چلے گا یہ سب، کسی دن شوہر کو پتہ چل گیا تو، نہیں...... نہیں، ایسا نہیں ہوگا مگر جو بھی اب مجھے سہیل سے ہر ناتہ ختم کرنا ہوگا اس سے پہلے کہ میرے تن کی ہوس میری زندگی برباد کر دے مجھے یہ کہانی یہیں روک دینی چاہئے۔ مگر وہ جانتی تھی کہ یہ سب سوچنا آسان ہے اور کرنا مشکل چلو دیکھتے ہیں قسمت کہاں تک لے جاتی ہے نہ میں اس دن شادی میں جاتی اور نہ سہیل کے چکر میں پھنستی، کم بخت نے پہلی ہی ملاقات میں کیسے پٹا لیا تھا مجھے۔"

مینا سوچتے سوچتے خیالوں میں گم ہو رہی تھی۔

......☆☆☆......

اچانک دروازے پر دستک ہونے لگی اور مینا اپنے خیالوں سے باہر آئی اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔

"اس وقت کون آ سکتا ہے؟"
مینا نے دروازہ کھولا۔ "تم...... تم تو دو بجے آنے والے تھے۔"
"کیوں، مجھے دیکھ کر خوشی نہیں ہوئی کیا؟"
"یہ بات نہیں، میں تو بس حیران ہوں کہ تمہاری ٹرین تو دو بجے آنی تھی۔"
"اچھا چھوڑو یہ باتیں اور گرما گرم چائے پلاؤ۔ بہت تھکا ہوا ہوں۔"
"اچھا ہوا میں سہیل کے گھر سے جلدی آ گئی ورنہ پھنس جاتی آج۔" مینا کچن کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

"کہاں لے جا رہے ہو مجھے۔"
"آؤ نا میڈم آپ کو اچھا لگے گا۔"
"وہ درندہ یہیں کہیں آس پاس ہے۔" وردا نے ڈرتے ہوئے کہا۔
"اسے میں پکڑ لوں گا، تم فکر مت کرو اب میں پولیس میں ہوں وہ زیادہ دیر نہیں بچ پائے گا۔"
"مجھے لگتا ہے کہ یہ وردی تم کسی سے مانگ کر لائے ہو تم پولیس میں کیسے بھرتی ہو گئے؟"
"صرف آپ کی خاطر میڈم، صرف آپ کو اس مصیبت سے نکالنے کے لیے پولیس میں بھرتی ہوا ہوں۔"
"تم میری اتنی فکر کیوں کرتے ہو؟"
"پتہ نہیں شاید پیار ہو گیا ہے آپ سے۔"
"پیار اور تم۔ میں تمہارے سب ناٹک جانتی ہوں، تمہارے جھانسے میں نہیں آؤں گی۔"
"یہ کوئی ڈرامہ یا جھانسہ نہیں ہے وردا جی، میرے دل کی سچائی ہے۔ کہو تو اپنا دل چیر کر دکھا دوں۔"
"دکھاؤ چیر کے، میں بھی تو دیکھوں کہ کتنا گند چھپا ہے وہاں۔"
"جو آپ کی خوشی۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے چاقو نکالا اور اپنی قمیص کے بٹن کھول کر سینے پر چیرا لگانے لگا اور خون کی کچھ بوندیں اس کے سینے پر ابھر آئیں۔
"رکو...... یہ کیا کوئی مذاق ہے۔" وردا نے اسے روکتے ہوئے کہا۔
"وردا جی، میرے لیے تو یہ میری سچائی ہے، آپ شاید اسے مذاق سمجھ رہی ہیں۔"
"ایسے اپنا دل چیر دو گے تو اس قاتل کو کون پکڑے گا۔"
"میرا بھوت اسے پکڑ کر جہنم رسید کر دے گا۔"
"مگر تمہیں اچانک مجھ سے پیار کیسے ہو سکتا ہے۔"
"پیار تو پیار ہوتا ہے کبھی بھی، کہیں بھی کسی سے بھی ہو سکتا ہے۔"
"نغمہ کو پتہ چل گیا تو وہ مجھے نہیں چھوڑے گی، کئی بار جتا چکی ہے مجھے کہ میرے راجو سے دور رہنا۔"
"نغمہ کی فکر مت کرو اس کا اور میرا کوئی دل کا رشتہ نہیں ہے۔" راجو بولا۔
"جسم کا رشتہ تو ہے نا۔" وردا نے شرارت سے کہا۔
"ایسا رشتہ تو نغمہ کا کئی لوگوں سے ہے میرے ہونے یا نہ ہونے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تمہیں بھی مجھ سے پیار ہو گیا ہے نا۔"
"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" وردا نے منہ بنا کر کہا۔
"ایسی ہی بات ہے میڈم۔"
"تو کیا تم میری خاطر نغمہ کو چھوڑ دو گے؟"
"نغمہ کو عاشقوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ تم اس کی پروا کیوں کر رہی ہو آؤ ہم بھی تھوڑا پیار کر لیں۔" راجو نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
ایک بار وردا کی نظر راجو سے کیا ملی وہیں ٹک کر رہ

گئی۔
پھر وہ چونکتے ہوئے بولی۔ "دیکھو شاید نغمہ اسی طرف آ رہی ہے اس کے سامنے کوئی بات مت کرنا۔"
"وہ یہاں نہیں آئے گی بہت گہری نیند میں ہے۔"
وردا نے مڑ کر دیکھا۔ نغمہ سچ میں درخت کے نیچے بچھی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔
"ششش...... نغمہ کروٹ لے رہی ہے اور...... اور یہ اس کے پاس کون کھڑا ہے اور میرے خدا یہ تو وہی درندہ ہے...... راجو دیکھو وہی قاتل...... دیکھو وہ نغمہ کو مار دے گا۔"
"اس حرام خور کو ابھی آنا تھا ابھی میں نے محبت کی پہلی سیڑھی پر ہی قدم رکھا تھا۔" وردا کے بدن کی مہک راجو کو دنیا جہان سے بیگانہ کر رہی تھی۔
"ارے تم دیکھو تو وہ قاتل خنجر نکال رہا ہے۔" وردا کی سانس پھولنے لگی۔
اسی وقت نغمہ نے کروٹ لی اور وردا نے دیکھا کہ وہ نغمہ نہیں اس کی جگہ کوئی اور ہے۔"
"ارے یہ تو وہی عینی شاہد ہے جس نے میرے خلاف گواہی دی تھی۔"
مگر راجو کسی اور ہی دنیا میں گم تھا۔ تب ہی وردا نے دیکھا کہ قاتل نے تیز دھار خنجر سے سہیل پر حملے شروع کر دیئے۔
"نہیں۔" وردا زور سے چلائی اور چیختے ہوئے بستر پر اٹھ بیٹھی۔
"کک...... کیا ہوا تمہیں۔" پاس ہی لیٹی ہوئی نغمہ بھی اٹھ گئی۔
"اف کتنا عجیب اور خوفناک خواب تھا۔"
وردا کی چیخ سن کر راجو اور مراد بھی جاگ گئے۔
راجو نے اٹھ کر کمرے کی بتی جلا دی۔
"کیا ہوا؟" مراد نے پوچھا۔
"ہاں بولو وردا، کیا بات ہے؟" نغمہ نے وردا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔
"کچھ نہیں، بس ایک ڈراؤنا خواب تھا، سو جاؤ تم لوگ۔"
"صبح کے چھ بج رہے ہیں اب کیا سوئیں گے بتاؤ نا۔" نغمہ نے کہا۔
"ہاں ہاں میڈم بتائیں نا کیا بات ہے۔" راجو بھی بول پڑا۔
وردا نے راجو کی طرف دیکھا اور اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ خواب کی ساری باتیں اسے یاد آ رہی تھیں اور ان باتوں کا اثر ابھی بھی اس کے دل دماغ پر تھا۔
"میڈم جی کیا ہوا کچھ تو بولیئے۔" راجو نے پھر پوچھا۔
"ہاں بولو تو کیا بات ہے۔" نغمہ نے بھی پوچھا۔
"میں نے بہت عجیب سا خواب دیکھا ہے وہ قاتل اس عینی شاہد کو مار رہا تھا راجو پولیس کی وردی میں تھا، بس اتنا ہی یاد ہے۔" وردا نے کہا۔ پورا خواب وہ بتا ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ بستر سے اتری اور واش روم کی طرف چل گئی۔
"لو کر لو بات کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔" نغمہ منہ بنا کر بولی۔
"تو تمہیں کیا امید تھی کہ پہاڑ کھودو گی تو اس میں سے بھی کوئی عاشق نکلے گا۔" مراد نے دھیرے سے ہنستے ہوئے کہا۔
"مجھ سے مذاق مت کیا کرو۔"
راجو کو جانے کیا سوجھی اس نے ٹی وی آن کر دیا اتفاق سے ٹی وی پر سہیل کے قتل کی خبر آ رہی تھی۔
"بہت ہی دردناک موت دی ہے قاتل نے عینی شاہد سہیل کو، قاتل نے ان دونوں سپاہیوں کو بھی مار ڈالا

جو سہیل کے گھر پر تعینات تھے۔ پولیس کا سارا شک وردا شمسی اور اس کے نقاب پوش ساتھی پر ہے۔ سہیل کے گھر کے سامنے رہنے والے ایک شخص نے بتایا ہے کہ اس نے رات کوئی ساڑھے گیارہ بجے ایک عورت کو سہیل کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔ پولیس کو پورا یقین ہے کہ وہ عورت وردا شمسی ہی تھی۔ ابھی پولیس کی طرف سے مزید کوئی تفصیل نہیں بتائی گئی ہے۔ اپنے دو سپاہیوں کی موت کے بعد پولیس کا محکمہ بھی جیسے سکتے کی حالت میں ہے۔" نیوز اینکر بولے جا رہا تھا۔

یہ خبر سنتے ہی راجو اور مراد حیران رہ گئے اسی وقت وردا بھی باہر آ گئی۔

"آپ کا خواب تو سچ ثابت ہو گیا میڈم دیکھیں خبروں میں دکھا رہے ہیں کہ سہیل کا خون ہو گیا ہے۔" راجو نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے تمہیں بھی پولیس کی وردی ملنے والی ہے خواب میں تم بھی تو پولیس کی وردی میں تھے۔" مراد نے فوراً کہا۔

"میڈم پورا خواب تو بتائیں۔" راجو بولا۔

"نہیں نہیں مجھے پورا خواب یاد نہیں جتنا یاد تھا بتا دیا باقی میں بھول گئی۔" وردا اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپاتے ہوئے بولی۔

"تم کچھ چھپا رہی ہو، سچ بتاؤ میرا راجو تمہارے خواب میں کیا کر رہا تھا؟" نغمہ نے وردا کے کان میں کہا۔

"میں کیوں کچھ چھپاؤں گی مجھے جو یاد رہا بتا دیا۔" وردا دھیمے لہجے میں بولی۔

"کہیں راجو تم سے اپنے پیار کا اظہار تو نہیں کر رہا تھا۔" نغمہ نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔

وردا نے نغمہ کی طرف غور سے دیکھا۔ جیسے پوچھ رہی ہو کہ تمہیں کیسے پتہ؟"

"کیا ہوا، ایسے کیوں دیکھ رہی ہو جیسے کہ میں نے تمہاری کوئی چوری پکڑ لی ہو، ارے میں تو مذاق کر رہی ہوں وہ راجو تمہاری بہت فکر کرتا ہے نا اس لیے بول دیا وہ تمہارے خواب میں تھا تو سوچا شاید اس نے تم سے اپنے جذبات کا اظہار کر دیا ہو اور ہاں حقیقت میں ایسا سوچنا بھی مت، تمہاری جان لے لوں گی میں۔" نغمہ کا لہجہ اٹل تھا۔

"یہ کھسر پھسر میں تم میڈم کو کیا کہہ رہی ہو۔ انہیں پریشان مت کرو۔" راجو نے کہا۔

وردا نے راجو کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں بولی۔ "پیار اور وہ بھی راجو سے کبھی نہیں، چھی کتنا گندا خواب تھا یہ سب اس نغمہ کی وجہ سے ہوا ہے ہر وقت گندی باتیں کرتی رہتی ہے لیکن اگر سہیل کے قتل کی طرح خواب کی یہ بات بھی سچ ثابت ہوئی تو، نہیں۔ خواب کی ہر بات سچی نہیں ہو سکتی مگر یہ صبح کا خواب تھا کہتے ہیں صبح کا خواب سچا ہوتا ہے، ایک بات تو سچ بھی ہو گئی۔ مگر کچھ بھی ہو میں راجو جیسے لڑکے سے پیار کسی بھی حالت میں نہیں کر سکتی۔"

"کہاں کھو گئیں اور یہ میرے راجو کو اس طرح سے کیوں دیکھ رہی ہو۔" نغمہ نے وردا کو ہلایا۔

"کوئی بات نہیں ہے اور تم یہ ہر وقت ایک ہی راگ مت گایا کرو۔" وردا نے جھلا کر کہا اور اگلے ہی پل وہ گہری فکر میں ڈوب گئی۔

"اس عینی شاہد کے مرنے کا مطلب ہے کہ اب میں بری طرح پھنس چکی ہوں۔" وردا نے کہا۔

"یہ قاتل جو بھی ہو لیکن ہے بہت شاطر وہ پوری پلاننگ سے کام کر رہا ہے۔" راجو بولا۔

"اب ہم کیا کریں۔" وردا پریشان ہو رہی تھی۔

یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا کمرے میں ایک پل کے لیے سناٹا سا چھا

گیا، کسی نے کچھ نہیں کہا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"کب آئیں میڈم۔" چوہان نے پوچھا۔

"سر صبح صبح نو بجے سے ہیں۔ اپنے کمرے میں ہیں۔ کافی غصے والی لگتی ہیں۔ کافی ینگ ہی کوئی چوبیس پچیس سال کی ہوں گی۔"

"دیکھنے میں کیسی ہے۔ خوبصورت ہے کیا۔"

"پوچھیں مت سر۔ بجلی ہے بجلی۔" وحید ملک نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہوں...... یہ تو دو دن بعد آنے والی تھی، اتنی جلدی کیسے ٹپک پڑی؟" چوہان بولا۔

"سر آپ کو فوراً بلایا ہے انہوں نے، جلدی جائیں کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔"

"ٹھیک ہے میں ان کے کمرے میں جا رہا ہوں، تم یہیں رکو۔"

"او کے سر۔"

چوہان، ڈی ایس پی شہلا احمد کے کمرے میں داخل ہوا۔

"گڈ مارننگ میڈم، میں انسپکٹر راحت چوہان، سوری میڈم مجھے پتا نہیں تھا کہ آپ نے آج ہی جوائننگ لے لی ہے۔" چوہان نے سیلوٹ مارتے ہوئے کہا۔

"گڈ مارننگ، آؤ بیٹھو، یہ کیا چل رہا ہے شہر میں۔"

"باقی سب تو ٹھیک ہے میڈم، بس یہ سیریل کلر کا کیس پریشان کر رہا ہے۔" چوہان نے کہا۔

"ایسی ہر پریشانی ہینڈل کرنا ہماری ڈیوٹی ہے مسٹر چوہان، آپ ایسی باتیں کریں گے تو کیسے کام چلے گا، آئندہ میرے سامنے ایسی بات مت کرنا۔" ڈی ایس پی شہلا نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"سوری میڈم۔" چوہان نے سر جھکا لیا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی اتنے اطمینان سے اس عینی شاہد کو مار کر چلا گیا اور ہم کچھ نہیں کر سکے۔ ساتھ ہی ہمارے دو سپاہی بھی مارے گئے۔ یہی کارکردگی ہے تمہارے اس شہر کی پولیس کی۔" شہلا سخت لہجے میں بولی۔

"وہ پیشہ ور قاتل بہت خطرناک اور بلا کا ذہین ہے میڈم، آپ نئی آئی ہیں آپ کو یہ سب سمجھنے میں کچھ وقت لگے گا۔" چوہان نے کہا۔

"شٹ اپ، میں نئی بے شک ہوں مگر بے وقوف نہیں، تم اس کیس کو بالکل بھی ہینڈل نہیں کر پا رہے ہو۔"

"ایسی بات نہیں ہے میڈم قاتل کی پہچان تو ہو ہی چکی ہے۔ وہ جلد ہی پکڑی جائے گی۔" چوہان جلدی سے بولا۔

"مجھے باتیں نہیں رزلٹ چاہیے مسٹر چوہان۔ ورنہ اپنی چھٹی سمجھیں۔ مجھے اس کیس کی پل پل کی خبر چاہیے۔ از دیٹ کلیئر۔" شہلا تحکم سے بولی۔

"جی میڈم جیسا آپ کا حکم۔" شہلا کے آگے چوہان کی بولتی بند ہو چکی تھی۔ بڑی مشکل سے بول پایا تھا۔

"اور ہاں، میں یہ فائل دیکھ رہی تھی یہ ریاض حسین ہے کوئی سب انسپکٹر کے لیے سلیکشن ہوئی تھی اس کی، یہاں پر اس کی اب تک جوائننگ کیوں نہیں لی گئی۔" شہلا نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"میں دیکھ لیتا ہوں میڈم مجھے اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔" چوہان احترام سے بولا۔

"شام تک اس کی بھی رپورٹ دینا مجھے، اب تم جا سکتے ہو۔"

"او کے میڈم۔" چوہان سیلوٹ مار کر باہر نکل گیا۔

وحید ملک اسے دیکھ کر قریب آیا۔ "کیا ہوا سر،

آپ کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا ہے۔“

”پوچھو مت‘ یوں سمجھو قیامت آ گئی ہے ہمارے سر پر‘ سالی نے خوب ڈانٹا مجھے‘ آج تک ایسا نہیں ہوا ہے میرے ساتھ۔“ چوہان رومال سے اپنا پسینہ پونچھتا ہوا بولا۔

”سر وہ ہماری باس ہے۔“

”ارے باس ہے تو اس کا مطلب ہے کچھ بھی بول دے گی۔“

”کہا کیا انہوں نے؟“ ملک نے پوچھا

”کہے گی کیا۔ اسے لگتا ہے کہ وہ بہت زیادہ چالاک ہے‘ چل چھوڑ اور ہاں یار اس ریاض حسین کی جوائننگ کروادو۔“

”سر اس نے ہماری ڈیمانڈ تو پوری کی نہیں پھر کیسے‘ ویسے بھی غلطی سے نام آ گیا تھا اس کا لسٹ میں جنہوں نے پچاس پچاس ہزار روپے دیئے وہ کیا بے وقوف ہیں۔“ ملک بولا۔

”اب ان باتوں کو مارو گولی اس قیامت نے شام تک رپورٹ مانگی ہے اس بارے میں۔“ چوہان نے کہا۔

”ٹھیک ہے سر جیسا آپ کہیں‘ میں بھولو حوالدار کو بھیج کر بلواتا ہوں اسے‘ اس کے گھر پاس ہی رہتا ہے وہ ریاض حسین۔“

”ٹھیک ہے جو بھی کرو آج شام تک یہ کام ہو جانا چاہئے کہیں پھر ڈانٹ نہ پڑ جائے۔“

”آپ فکر نہ کریں سر‘ شام تک یہ کام تو ہو ہی جائے گا۔“ ملک نے چوہان کا کندھا تھپتھپا کر کہا۔

☆☆☆☆☆☆☆

صبح ہوتے ہی نغمہ مراد کے کمرے سے نکلنے کے لیے تیار ہوگئی آج اس کا ابا بھی واپس آنے والا تھا اس لیے وہ جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔

”میں تو اب چلتی ہوں تم لوگ اپنا پلان بناؤ کہ اب کیا کرنا ہے جہاں میری ضرورت ہو بتا دینا۔“ نغمہ نے چلتے ہوئے کہا۔

مراد اس کے قریب آ کر دھیمے لہجے میں بولا۔

”پھر کب ملوگی۔“

”پوری رات میں یہاں بور ہوتی رہی رات میں تو تم نے کوئی بات ہی نہیں کی۔“ نغمہ نے بھی سرگوشی میں شکایت کی۔

”پاگل ہو کیا‘ وردا کے رہتے کیا ہو سکتا تھا۔“

”اف! اس وردا نے تو سارا مزا خراب کر کے رکھ دیا ہے میں جا رہی ہوں‘ بعد میں بات کریں گے۔“

”ٹھیک ہے جاؤ۔“ مراد نے کہا۔

نغمہ باہر نکل گئی۔ نغمہ کے جاتے ہی وردا نے جیسے سکون کی سانس لی۔

”استاد یہ تم چپکے چپکے نغمہ سے کیا کہہ رہے تھے۔“ راجو نے پوچھا۔

”کچھ نہیں بس ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔“ مراد نے ٹالتے ہوئے کہا۔

”میں سب جانتی ہوں یہ ادھر ادھر کی باتیں کون سی ہیں‘ مجھے اس مصیبت میں پھنسا کر تم مستیاں کر رہے ہو‘ کچھ سوچا تم نے کہ میرا اب کیا ہوگا میرے گھر میں سب کتنا پریشان ہو رہے ہوں گے میرے والد دل کے مریض ہیں اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہو گیا تو اس کے ذمہ دار بھی تم ہو گے‘ میں اب اور نہیں رک سکتی یہاں‘ میں گھر جا رہی ہوں۔“ وردا نے غصے سے کہا۔

مراد کے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”میڈم آپ اپنا دماغ ٹھنڈا رکھیں استاد کی تو غلطی ہے ہی میں مانتا ہوں مگر جو بھی ہوا انجانے میں ہوا۔“ راجو نے اپنے استاد کی حمایت لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں مجھے کیا پتا تھا کہ کھیل اس طرح بگڑ جائے گا۔“ مراد فوراً اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

”جس کھیل کو کنٹرول نہ کر سکو وہ کھیل نہیں کھیلنا چاہئے اب وہ عینی شاہد بھی مار دیا اس قاتل نے‘ بتاؤ ہمارے پاس کرنے کو کیا ہے پولیس الگ مجھے ڈھونڈ رہی ہے‘ تمہیں نہیں‘ تمہاری تصویر ٹی وی پر آئی ہوتی تو پتہ چلتا تمہیں۔“ وردا ابھی بھی غصے میں تھی۔

اچانک دروازے پر دستک سنائی دی مراد نے اٹھ کر دروازہ کھولا سامنے سحرش کھڑی ہوئی ہے۔

”وردا کہاں ہے۔“ سحرش نے پوچھا۔

”یہیں ہے آؤ۔“ مراد نے کہا۔

سحرش اندر آ کر وردا کے قریب بیٹھ گئی۔

”سوری کل شام کو میں نہیں آ سکی اتنی گہری نیند آئی کہ پوچھو مت۔“ سحرش نے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“ وردا بولی۔

”یہ چہرہ کیوں اترا ہوا ہے تمہارا۔“ سحرش اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”جب کوئی ایسی مصیبت میں پھنسا ہو تو کیا اس کے چہرے پر پھول کھلیں گے۔“

”تم زیادہ دنوں تک اس مصیبت میں نہیں رہوگی‘ اصلی مجرم بہت جلد پکڑا جائے گا۔“ سحرش نے اپنے یقین کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”مگر یہ کرشمہ کیسے ہوگا پولیس تو میرے پیچھے پڑی ہے انہیں کیسے یقین دلائیں گے کہ خونی میں نہیں کوئی اور ہے۔“ وردا بولی

”لیکن مجھے یقین ہے کہ تمہیں انصاف ضرور ملے گا۔“ راجو نے کہا جواب تک چپ چاپ ان کی باتیں سن رہا تھا اور باتیں کیا سن رہا تھا سحرش کے سراپا کا جائزہ زیادہ لے رہا تھا۔

”لیکن کیسے...... مجھے سمجھاؤ تو سہی۔“ وردا جھلا رہی تھی۔

اب کوئی اس بات کا کیا جواب دیتا۔

”صرف کہنے سے ہی کچھ ٹھیک نہیں ہو جاتا مجھے تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دے رہا ہے۔“ وردا نے کہا۔

اچانک دروازے پر پھر دستک ہونے لگی۔

”راجو تم یہاں ہو کیا؟“ باہر سے آواز آئی۔

”ارے یہ تو بھولو حوالدار کی آواز ہے۔“ راجو بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھولا۔

”شکر ہے تم مل گئے میں تو تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا تھا۔“ بھولو کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

راجو نے بھولو کو اندر نہیں آنے دیا اور اپنے پیچھے دروازہ بھیڑ کر وہیں کھڑا ہو گیا۔

”کیا ہوا مجھے کیوں ڈھونڈ رہے تھے تم؟“ راجو نے پوچھا۔

”روز پوچھتے تھے نا تم اپنی جوائننگ کے بارے میں۔“

”ہاں تو...... تو کیا اب کبھی نہ پوچھوں؟“

”تو پھر چلو آج تمہاری...... اوہ سوری...... آپ کی جوائننگ کروا دیتا ہوں‘ اب تم ہمارے سب انسپکٹر بن گئے ہو تو آپ ہی بولنا پڑے گا۔“ بھولو حوالدر نے دھماکہ خیز خبر سناتے ہوئے کہا۔

”تم کیا کہہ رہے ہو‘ مجھے تو ذرا برابر بھی یقین نہیں آ رہا۔“ راجو بے یقینی سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔ ”دیکھ بھولو اگر تم میرے ساتھ کوئی مذاق کر رہے ہو تو سوچ لو بہت برا ہوگا تمہارے ساتھ۔“

”اب یقین کر بھی لو‘ تمہیں فوراً میرے ساتھ چلنا ہے‘ ابھی جوائننگ ہو جائے گی تمہاری۔“

”مگر یہ سب اچانک کیسے؟“ راجو کو ابھی بھی یقین نہیں ہو رہا تھا۔

”نئی ڈی ایس پی صاحبہ آئی ہیں انہوں نے ہی

"آرڈر کیا ہے تمہاری جوائننگ کا اب چلو دیر مت کرو۔"
ایسی صورت حال میں اندر کے جذبات اُمڈ آنا فطری عمل تھا راجو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ بھولو کو گلے سے لگاتے ہوئے بولا۔ "مجھے لگتا تھا کہ پولیس کی نوکری ایک خواب بن کر رہ جائے گی تم مجھے بس پندرہ منٹ دو میں ابھی آتا ہوں۔"
"ٹھیک ہے میں اپنے گھر پر ہوں تم وہیں آ جانا۔" بھولو نے کہا۔
بھولو کے جانے کے بعد راجو تیزی سے اندر آیا۔ اس کی آنکھیں ابھی بھی بھری ہوئی تھیں اندر سب ہی نے بھولو اور راجو کی باتیں سن لی تھیں۔
راجو کے اندر آتے ہی۔ مراد نے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ "واہ میرا راجو اب پولیس میں جائے گا اور سب کی بینڈ بجائے گا۔"
"استاد یہ سب تمہاری دعاؤں کا نتیجہ ہے۔" راجو گلوگیر لہجے میں بولا۔
"بھائی مجھے تو یقین ہی نہیں تھا اس لیے میں نے تو کبھی دعا کی ہی نہیں تھی یہ سب تیری لگن کا نتیجہ ہے تم نے بڑی محنت سے امتحان دیا تھا۔"
"استاد ہو نہ ہو اس میں وردا میڈم کے خواب کا بھی ہاتھ ہے۔" راجو نے کہا۔
وردا نے اپنے تیز دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔"
"کیا ہوا میڈم آپ کو خوشی نہیں ہوئی کیا۔" راجو نے پوچھا۔
"میں تو تمہارے لیے بہت خوش ہوں۔" وردا نے فوراً کہا۔
"پھر آپ نے کیوں کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا آپ کا یہ خواب بھی سچ ہو گیا اور کچھ بھی یاد ہو تو بتاؤ نا کیا پتہ وہ بھی سچ ہو جائے۔" راجو بولا۔
"اتنا کچھ سچ ہو گیا اب کیا ہر بات سچ ہو گی ایسا نہیں ہو گا۔" وردا بولی۔
وردا کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی آتی بھی کیسے پورا خواب تو صرف وردا کو ہی پتا تھا۔
"میڈم بتائیں نا کیا ہوا آپ اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہیں۔" راجو نے پھر پوچھا۔
"کچھ نہیں تم جاؤ ورنہ دیر ہو جائے گی۔" وردا جلدی سے بولی۔
"ارے ہاں مجھے دیر ہو رہی ہے استاد اب میں نکلتا ہوں پہلے جا کر ڈیوٹی جوائن کر لوں باقی کی باتیں بعد میں کریں گے۔" راجو نے مراد سے کہا۔
"ٹھیک ہے تم نکلو ہم تینوں بیٹھ کر آگے کا پلان بناتے ہیں۔"
"او کے، تم لوگ پلان بناؤ میں بعد میں ملتا ہوں۔" راجو یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔
"ہاں تو سحرش تم کیا کچھ جانتی ہو اس آدمی کے بارے میں، کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا۔" مراد نے سحرش سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔
"پرویز۔" سحرش جھٹ سے بولی۔
"تو تمہیں شک ہے کہ قاتل وہی ہے۔" مراد نے کہا۔
"مجھے شک نہیں پورا یقین ہے کہ وہی وہ پیشہ ور قاتل ہے۔" سحرش بولی۔
"تم اس پرویز کے بارے میں بتاؤ۔"
"مجھے اس کے بارے میں اور کچھ نہیں پتا، ہاں اس کا ایک نوکر بھی ہے مجھے اس پر بھی شک ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ نوکر پرویز کا ساتھ دیتا ہو۔" سحرش کو پرویز کا نوکر رمضان بھی یاد آ گیا۔
"اب سوچنا ہے یہ وہ ہمیں کہاں ملے گا۔"
"مجھے اس کے فارم ہاؤس کا پتا ہے باقی اس کے

بارے میں اور کوئی معلومات نہیں ہیں مجھے۔"
"ٹھیک ہے، مجھے اس کا فارم ہاؤس دکھا دو باقی معلومات میں خود اکٹھی کر لوں گا۔" مراد پختہ لہجے میں بولا۔
"ٹھیک ہے۔"
"وردا میں سحرش کے ساتھ فارم ہاؤس دیکھنے جا رہا ہوں بعد میں راجو کے آنے کے بعد سوچتے ہیں کہ کیا کرنا ہے؟" مراد وردا سے مخاطب ہوا۔
"ٹھیک ہے جاؤ میرا سر درد کر رہا ہے میں کچھ دیر سو لوں گی۔"
"دوا دوں کیا، میرے پاس ہے۔" مراد نے کہا۔
"نہیں یہ درد گولیوں سے نہیں جائے گا، میں ٹھیک ہوں تم لوگ جاؤ۔"
"آؤ سحرش چلیں۔"
"اسی کار میں چلیں گے؟" سحرش نے پوچھا۔
"نہیں بائیک پر چلیں گے وہ کار تو کسی اور کی تھی۔"
"بائیک پر......"
"کیوں، کوئی پریشانی ہے کیا بائیک پر۔" مراد نے پوچھا۔
"نہیں...... چلو۔" سحرش نے اٹھتے ہوئے کہا۔
تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بائیک پر پرویز کے فارم ہاؤس کی طرف دوڑے چلے جا رہے تھے۔
"کیا تمہاری اس نے کوئی مووی بنا لی تھی؟" راستے میں مراد نے پوچھا۔
"میری بھی زندگی کے بارے میں بات نہ ہی کرو تو اچھا ہے، میں بس وردا کی مدد کرنا چاہتی ہوں اور کچھ نہیں۔" سحرش روکھے لہجے میں بولی۔
"تم تو برا مان گئیں، میں تو یونہی پوچھ رہا تھا۔"
"جو بھی ہو میری زندگی کے بارے میں جاننے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے سمجھے، بہت اچھے سے جانتی ہوں میں تم دونوں کو۔"
"کیا جانتی ہو ذرا ہمیں بھی بتا دو ہم بھی تو دیکھیں کہ دنیا ہمارے بارے میں کیا جانتی ہے اور کیا سوچتی ہے۔" مراد بولا۔
"تم کیا ہو وہ تمہیں بھی پتا ہے اور مجھے۔"
"کیا نغمہ نے تمہیں بتا دیا ہے کہ میں اس کے ساتھ کیا کچھ کر چکا ہوں۔"
سحرش مراد کی بات سن کر حیران رہ گئی۔ اسے ایسی بات کی امید نہیں تھی۔
انہی باتوں کے دوران سحرش چونکی اور اس کا کندھا ہلا کر بولی۔ "بائیک اس روڈ سے سیدھی لے لو۔ اسی روڈ کے آخر میں ہے وہ فارم ہاؤس۔"
"راجو بیچارہ تو تمہارے چکر میں تھا۔ مگر چکر میں آ گئی تمہاری بہن، چکر میں کیا آ گئی وہ تو ہر وقت کسی نہ کسی چکر سے چلانے کے لیے تیار ہی رہتی ہے، راجو نے ایک بار ملوایا تھا مجھے نغمہ سے اور میں نے اسی دن اس کا ایک ایک نغمہ سن لیا تھا۔ ہی...... ہی۔" مراد ضرور کسی چکر میں بار بار نغمہ کا ذکر کر رہا تھا۔
"یہ بات تم مجھے کیوں سنا رہے ہو؟"
"یہ جاننے کے لیے کہ ان باتوں میں تمہاری دلچسپی ہے کہ نہیں کیا پتہ تمہاری میری بات بھی جم جائے۔"
"اچھا تو تم مجھ پر لائن مارنے کی کوشش کر رہے ہو اگر ایسی باتیں کر کے سوچتے ہو کہ مجھے پٹا لو گے تو تم غلطی پر ہو مجھے تمہاری یہ باتیں بالکل بھی اچھی نہیں لگتیں۔" سحرش نے اسے دھتکارتے ہوئے کہا۔
"کیوں اچھی نہیں لگتیں تمہیں میری باتیں کیا برائی ہے اپنی باجی سے پوچھ لینا میرے بارے میں۔"
"میں باجی سے کیوں پوچھوں بھلا، مجھے کیا مطلب ان باتوں سے، تم سیدھے سیدھے بائیک

چلانے پر دھیان دو۔" سحرش بولی۔

"میں جانتا ہوں کہ اس لڑکے نے تمہاری مووی بنالی ہوگی تب ہی تو تم اسے مارنا چاہتی تھیں۔ دیکھو میں اس جیسا کمینہ نہیں ہوں۔"

"تمہاری دال یہاں نہیں گلے گی مسٹر۔" سحرش نے صاف جواب دے دیا۔

"اچھا تو تم ہی بتا دو کہ یہ دال گلانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

"سوری یہ دال کسی بھی حالت میں گلنے والی نہیں ہے۔"

"اچھا ایسا ہے کیا پھر تو میں تمہارا یہ چیلنج قبول کرتا ہوں کہ تمہیں حاصل کر کے ہی رہوں گا۔" مراد فیصلہ کن لہجے میں بولا "اور وہ بھی تمہاری اپنی مرضی سے۔"

"میرے سامنے آئندہ ایسی بات مت کرنا ورنہ تم دیکھ ہی چکے ہو کہ میں کیا کر سکتی ہوں۔"

"اگر میں اور راجو وقت پر وہاں نہ پہنچتے تو تمہاری اور اس لڑکی کی بینڈ بجنے والی تھی وہاں' اس کے پاس پستول تھا اور تم ایک چاقو لے کر اسے ڈرانے چلی تھیں۔" مراد نے اپنا احسان یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"میں نے تم لوگوں کو نہیں بلایا تھا کہ آؤ اور میری مدد کرو۔"

"واہ بھئی واہ' ایک تو ان کی حفاظت کرو اوپر سے کوئی نام بھی نہیں۔"

"فارم ہاؤس آ گیا ہے بکواس بند کرو اور بائیک روکو۔" سحرش نے کہا۔

"کہاں ہے فارم ہاؤس۔" مراد نے بائیک روکتے ہوئے پوچھا۔

"وہ رہا...... یہیں سے دیکھ لو۔ پاس جانا مناسب نہیں ہے۔" سحرش نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

"ویسے ایک پوچھوں؟"

"اب کون سی بات؟"

"فارم ہاؤس جیسی جگہوں پر تو الٹے ہی کام ہوتے ہیں تم یہاں کیا کرنے آئی تھیں؟" مراد نے بہت ہی موقع کا سوال پوچھا تھا۔

"تم سے مطلب' تم بس اپنے کام سے کام رکھو اب واپس چلو۔"

"ارے اتنی دور کیا بس اس فارم ہاؤس کی دیواریں ہی دیکھنے آئے ہیں' اگر اس پرویز کے گھر کا ایڈریس مل جائے تو اچھا ہوگا۔"

"تو جاؤ معلوم کر کے آؤ اس کے گھر کا ایڈریس میں یہیں انتظار کرتی ہوں۔" سحرش اطمینان سے بولی۔

"مگر تم یہاں اکیلی...... ایسا کرتے ہیں کہ اس بائیک کو یہیں سڑک کنارے کی جھاڑیوں میں چھپا کر دونوں چلتے ہیں۔"

"نہیں میں وہاں نہیں جاؤں گی تم جاؤ میں یہیں انتظار کر لوں گی۔" سحرش کی آنکھوں میں کل کا منظر گھوم گیا جب پرویز اور چوہان نے مل کر اس کے ساتھ جشن منایا تھا۔

"پرویز وہاں ہوا تو میں کیسے پہچانوں گا چلو نا۔"

"ٹھیک ہے مگر اب کوئی الٹی سیدھی بکواس مت کرنا۔"

"اوکے بابا۔ اب چلو بھی۔"

بائیک کو جھاڑیوں میں چھپا کر دونوں فارم ہاؤس کی طرف چل پڑے۔

"ہم جھاڑیوں میں چھپتے ہوئے جائیں گے۔ سامنے سے جانا ٹھیک نہیں ہے۔" مراد نے رائے دی۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں بھی ایسا ہی سوچ رہی تھی۔"

"تو بس پھر دبے پاؤں میرے پیچھے چلی آؤ۔"

"شش...... تمہیں کچھ سنائی دیا۔" سحرش چونک کر بولی۔

"ہاں' شاید نزدیک ہی کوئی ہے۔"

"کل صاحب لوگوں نے ایک لڑکی کے ساتھ اس گھاس پر خوب جشن منایا۔" انہیں آواز سنائی دی۔ دونوں دبے پاؤں آواز کے نزدیک پہنچ گئے اور جھاڑیوں میں دبک گئے۔

"چلو یہاں سے۔" سحرش نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ارے رکو دیکھیں تو ماجرا کیا ہے۔"

ان کے سامنے پرویز کا ملازم رمضان ایک عورت کو اپنی بانہوں میں لیے کھڑا تھا۔ عورت کی عمر یہی کوئی پینتیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔

"کیا یہی پرویز ہے۔"

"نہیں یہ اس کا ملازم رمضان ہے۔"

"نوکر نے بھی کیا قسمت پائی ہے۔" مراد رشک کرتا ہوا بولا۔

"مجھے لگتا ہے کہ پرویز یہاں نہیں ہے۔ ہمیں چلنا چاہیے۔"

"یہ نوکر تو پرویز کا پتا جانتا ہی ہوگا۔ تھوڑا رکو تو۔"

"تمہارے صاحب آ گئے تو۔" عورت' رمضان سے بول رہی تھی۔

"صاحب تو شہر سے باہر گئے ہیں۔ کل شام کو ہی نکل گئے تھے یہاں سے۔" رمضان نے کہا۔

"اندر گھر میں چلو نا' یہاں کھلے میں عجیب سا لگ رہا ہے۔"

"کل اس لڑکی کی حرکتیں دیکھ کر دل کر رہا ہے کہ ہم بھی یہیں کھلے میں مستی کریں۔" رمضان بولا۔

"یہ کس لڑکی کی بات کر رہا ہے۔" مراد نے سرگوشی میں سحرش سے پوچھا۔

"مجھے کیا پتا' چلو یہاں سے۔" سحرش غصے سے بولی۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے کھسک جانا چاہتی تھی۔

"آہستہ بولو وہ سن لیں گے۔" مراد نے ٹوکا۔

"ٹھیک ہے۔ چلو پھر۔" یہ کہہ کر سحرش دبے پاؤں وہاں سے چل پڑی۔

سحرش کے جاتے ہی مراد جھاڑیوں سے باہر نکل آیا۔ "ارے بھائی پرویز صاحب کیا یہیں رہتے ہیں۔"

آناً فاناً رمضان اور وہ عورت ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔ الگ ہوتے ہی وہ عورت وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

"کک کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو۔" رمضان نے کہا۔

"بھائی میں پرویز کے گاؤں سے آیا ہوں۔ اس سے ملنا تھا۔ کسی نے اس فارم ہاؤس کا پتا بتایا تو چلا آیا یہاں آیا تو دیکھا کہ یہاں فلم محبت چل رہی ہے۔ پہلے تو سوچا کہ واپس چلا جاؤں۔ لیکن پھر رک گیا۔ سوچا بات کرنے میں کیا ہرج ہے۔"

"تھوڑی دیر رک نہیں سکتے تھے۔ اتنی مشکل سے تو اس عورت کو راضی کیا تھا۔" رمضان شکایتی لہجے میں بولا۔

"کوئی بات نہیں میرے جانے کے بعد فلم دوبارہ اسٹارٹ کر لینا آپ بس پرویز بھائی کے گھر کا پتہ بتا دو۔"

"وہ تو تم نے بھگا دی اب کیا میں ہوا میں ڈائیلاگ بولوں۔" رمضان جھلا کر بولا۔

"اس نشریاتی خلل کے لیے معافی چاہتا ہوں بھائی آپ مہربانی کر کے پتا بتا دیجئے۔ بہت پریشان ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی دیتا ہوں۔"

مراد کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر رمضان نے اسے پرویز کے گھر کا پتا بتا دیا اور مراد مسکراتا ہوا فارم

فاؤس سے باہر آ گیا۔
سحرش سڑک پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ "بڑی جلدی واپس آ گئے۔"
"پتہ مل گیا تو آ گیا میں یہاں کسی کام سے آیا تھا کام ہوتے ہی آ گیا۔ تم کیا سوچ رہی تھیں کہ میں وہاں جا کر کیا کروں گا۔"
"ارے ایسا کیسے ہو گیا۔ وہ لوگ تو۔" سحرش کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
"حیران ہونا میں نے وہاں سرپرائز اینٹری دی اور کام بن گیا۔ تم تھوڑا رک جاتیں تو اچھا خاصہ ڈرامہ دیکھنے کو مل جاتا۔"
"کام ہو گیا نا۔ اب واپس چلیں۔"
"کیا میں تمہیں بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔" مراد نے پوچھا۔
"کیوں......ایسا کیا ہے تم میں جو مجھے اچھا لگے گا؟ تمہاری انہی بیہودہ حرکتوں کی وجہ سے تو تمہاری بیوی بھی تمہیں چھوڑ گئی' اگر تم میں کچھ خوبیاں ہوتیں تو کیا وہ تم کو چھوڑ کر جاتی؟" سحرش نے کھری کھری سناتے ہوئے کہا۔
"اوہ وہ ایک الگ کہانی ہے' خیر چھوڑو مجھ سے غلطی ہو گئی جو تمہیں نغمہ جیسی سمجھ بیٹھا مجھے لگا تم نغمہ کی بہن ہو تو اس کے جیسی ہی ہو گی حالانکہ مجھے راجو نے بتایا تھا کہ تم نغمہ جیسی نہیں ہو مگر مجھے یقین نہیں آیا تمہیں پٹانے کا میرا طریقہ غلط تھا مجھے تم سے ایسی گندی باتیں نہیں کرنی چاہئیں تھیں اب مجھے کوئی اور ترکیب آزمانی ہو گی۔" مراد بولا۔
"تمہاری کوئی بھی ترکیب کامیاب نہیں ہو گی۔ اب چلو بھی یہاں سے۔"
"یہ تو وقت ہی بتائے گا۔"
مراد نے بائیک اسٹارٹ کی اور دونوں واپسی کے لیے چل پڑے۔

☆☆☆☆☆☆☆

راجو نے جوائننگ کی کارروائی پوری کرنے کے بعد شہلا احمد کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ کمرے داخل ہوا تو شہلا کسی اخبار کا مطالعہ کر رہی تھی۔ راجو بھاگ کر شہلا کے قدموں میں گرا اور ان کے پاؤں پکڑ لیے۔
"ارے یہ کیا کر رہے ہو کون ہو تم اور تمہیں اندر کس نے آنے دیا۔" شاید اس اچانک حملے پر وہ بوکھلا گئی تھی۔
راجو نے سر نیچے جھکاتے ہوئے کہا۔ "میں ریاض حسین ہوں میڈم اگر آپ یہاں نہ آتیں تو میری جوائننگ کبھی نہ ہو پاتی۔"
"اٹھو' تم اب سب انسپکٹر ہو۔ اور ایسے عام آدمی کی طرح پیش آؤ گے تو ابھی واپس نوکری سے نکال دوں گی۔" شہلا نے غصے سے کہا۔
راجو نے فوراً کھڑے ہو کر سیلوٹ مارا۔
"ارے یہ تو بہت ینگ ہے میں نے سوچا کوئی ادھیڑ عمر کھڑوس پولیس والی ہو گی بیکار میں پاؤں چھو کر اپنی بے عزتی کروالی۔" راجو نے سوچا۔
"تم نے جوائننگ کر لی۔" شہلا نے پوچھا۔
"ہاں میڈم۔" راجو نے جواب دیا۔
"جب کسی سینئر کے سامنے جاؤ تو ہاتھ پیچھے رکھو۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتے' ہاتھ جیب سے باہر نکالو اور سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔"
راجو نے جلدی سے ہاتھ جیب سے نکال کر پیچھے کر لیے۔ "سوری میڈم میرا پہلا دن ہے اور آپ جیسی خوبصورت لڑکی سامنے ہے میرے دماغ نے کام چھوڑ دیا۔ آئندہ دھیان رکھوں گا۔"
"میں کوئی لڑکی نہیں تمہاری باس ہوں احتیاط

سے بات کیا کرو۔"
"سوری میڈم۔"
اسی وقت چوہان نے اندر آ کر سلیوٹ مارا۔
"مسٹر چوہان اس کو ٹریننگ پر بھیج دو۔" شہلا نے کہا۔
"میڈم ٹریننگ میں یہ اب اگلے سال ہی جا پائے گا انسٹی ٹیوٹ میں کلاسز شروع ہو چکی ہیں اور وہاں مزید گنجائش بھی نہیں ہے۔"
"او کے، پھر ایسا کرو کہ اسے اپنے ساتھ رکھو اور کام سکھاؤ، اس کو ٹرینڈ کرنا اب تمہاری ذمہ داری ہے۔" شہلا نے چوہان کو گھورتے ہوئے کہا۔
"مجھے اپنے ساتھ رکھ لیجئے نا میڈم، مجھے لگتا ہے کہ میں آپ کے سائے میں زیادہ بہتر طریقے سے سیکھ پاؤں گا۔" راجو نے دخل دیا۔
"کسی نے تم سے تمہاری رائے مانگی کیا؟ جیسا کہا جائے ویسا کرو تمہاری کوئی شکایت نہیں آنی چاہئے۔"
"اف یہ تو تیکھی مرچی ہے اتنی خوبصورت لڑکی پولیس میں کیا کر رہی ہے۔" راجو نے پھر سوچا۔
"یو کین گو ناؤ۔" شہلا بولی۔
راجو وہیں کھڑا رہا چوہان نے اسے چلنے کا اشارہ کیا تب اس کی سمجھ میں آیا کہ اسے بھی باہر جانے کو کہا گیا ہے۔
باہر آ کر چوہان بولا۔ "برخوردار جوائننگ تو تم نے کر لی اپنی نوکری بچائے رکھنا چاہتے ہو تو ایک بات کا دھیان رکھنا اپنے سینئر کے آگے کبھی زیادہ منہ مت کھولنا میں بھی تمہارا سینئر ہوں یہ بھی یاد رکھنا ابھی تم نئے ہو سب سیکھ جاؤ گے۔"
"آپ کا کیا رینک ہے؟" راجو نے پوچھا۔
"میں انسپکٹر ہوں وردی اور یہ پھول دیکھ کر تمہیں پتا نہیں چل رہا کیا۔"

"پتہ چل گیا سر۔" پھر اچانک راجو کو یاد آیا کہ یہ تو وہی پولیس والا ہے جس نے کل سحرش کو سڑک پر ڈراپ کیا تھا۔
"چلو، تمہاری ٹریننگ شروع کی جائے جاؤ میرے لیے چائے لے کر آؤ۔" چوہان نے اسے پہلا سبق دیتے ہوئے کہا۔
"چائے...... سر؟" راجو حیرانی سے بولا۔
پیچھے سے شہلا بھی اپنے کمرے سے نکل کر آ رہی تھی، اس نے بھی یہ بات سن لی۔
"مسٹر چوہان میں نے مسٹر ریاض حسین کو تمہارے انڈر ٹریننگ کے لیے دیا ہے نا کہ تمہارا آفس بوائے بن کر چائے لانے کے لیے۔" شہلا نے کڑک لہجے میں کہا۔
"نہیں میڈم آپ غلط سمجھ رہی ہیں میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ چلو چائے پی کر اس قاتل کے کیس کی انکوائری کے لیے چلتے ہیں۔" چوہان نے بات بنائی۔
"ٹھیک ہے مجھے رپورٹ دیتے رہنا کہ کیا سکھا رہے ہو اسے۔"
"او کے میڈم۔" چوہان مودبانہ لہجے میں بولا۔
"غضب کی آفیسر ہیں یہ تو، ان کے ساتھ کام کر کے مزا آ جائے گا۔" راجو بڑبڑایا۔
"قیامت ہے یہ ہم سب کے لیے۔ جتنا جلدی سمجھ لو اچھا ہے۔" چوہان نے راجو کی بات پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا۔
"لیکن بہت خوبصورت قیامت ہے ایسی قیامت کو تو میں ہمیشہ سینے سے لگا کر رکھوں گا۔" راجو نے سوچا۔
"کیا سوچ رہے ہو۔ چلو ہمیں تفتیش کے لیے نکلنا ہے۔" چوہان نے کہا۔
"میری وردی سر؟" راجو نے پوچھا۔

"ارے وردی بھی مل جائے گی۔ ابھی ایسے ہی چلو۔"
"جیسا آپ کہیں سر۔"
چوہان، راجو کو لے کر سہیل کے گھر پہنچ گیا۔
"کرائم سین ہے گھبرانا مت چاروں طرف خون بکھرا پڑا ہے کہیں دیکھ کر تمہیں چکر نہ آ جائیں۔" چوہان نے ہنستے ہوئے کہا۔
"میں نے نیوز میں سب دیکھ لیا ہے سر میں ان باتوں سے نہیں ڈرتا۔"
"اچھا تو پھر چلو اندر۔"
راجو، چوہان کے پیچھے پیچھے سہیل کے گھر میں داخل ہوا۔
"یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔" راجو نے کہا۔
"لاش پیچھے پڑی ہے برخوردار۔ تھوڑا دھیرج رکھو۔"
"سر یہ بستر دیکھیں لگتا ہے اس پر کافی اُتھل پتھل ہوئی ہے۔"
"تم اس کمرے کو اچھی طرح چیک کرو میں پیچھے کی طرف جا رہا ہوں کوئی بھی بات اہم لگے تو مجھے بتا دینا۔" چوہان نے ہدایت دی۔
"او کے سر۔" راجو نے کہا۔ "ویسے بھی مجھے لاشیں دیکھنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" راجو دھیرے سے بڑبڑایا۔
"تم نے کچھ کہا؟"
"کچھ نہیں سر۔"
"اب لاشیں تو تمہیں اکثر دیکھنی پڑیں گی برخوردار پولیس میں آئے ہو کسی این جی او میں نہیں۔"
"میرا وہ مطلب نہیں تھا سر۔" راجو خجل ہو کر بولا۔
"او کے ٹھیک ہے چلو جو کام دیا ہے تمہیں اسے کرو اور میرے سامنے زیادہ بولنے کی کوشش مت کیا کرو۔"

"سوری سر۔"
"سوری...... ہونہہ۔" یہ کہتے ہوئے چوہان آگے بڑھ گیا۔
راجو کمرے کی اچھی طرح سے تلاشی لینے لگا۔
"یہاں اور کیا دیکھوں اس کمرے میں ہے ہی کیا یہ بکھرا ہوا بستر ہے اور یہ الماری باقی کچھ نہیں۔"
اچانک اس کی نظر بیڈ پر پڑے تکیے پر پڑی۔ اس کے بالکل پاس کوئی چمکیلی چیز نظر آ رہی تھی راجو نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔
"یہ تو سونے کی چین لگتی ہے یہ یہاں کیا کر رہی ہے، لگتا ہے اس بیڈ پر بڑا دھانسو کھیل ہوا ہے شاید اسی کھیل میں یہ چین گر گئی ہوگی، ایک بار نغمہ بھی تو اپنی پائل میرے کمرے میں بھول گئی تھی۔"
راجو نے بیڈ کو اچھی طرح چیک کیا مگر اسے اور کچھ نہیں ملا لیکن بیڈ کے پاس رکھی میز پر جو موبائل پڑا تھا اس پر راجو کا دھیان نہیں گیا راجو کمرے سے باہر آنے لگا۔ تبھی موبائل بجنے لگا۔
راجو نے موبائل اٹھایا اور آن کر کے کان سے لگا لیا۔
"سہیل میری سونے کی چین شاید تمہارے گھر پر ہی گر گئی ہے، مل جائے تو سنبھال کر رکھ لینا نواز نے تحفے میں دی تھی وہ ہمیشہ اسے میرے گلے میں دیکھنا چاہتا ہے تم کچھ بول کیوں نہیں رہے ہو کل رات مزا نہیں آیا کیا۔" یہ بول کر مینا ہنس پڑی۔
"مزا تو اسے آیا ہی ہوگا، کیا آپ کو پتا نہیں ہے کہ کل رات کو وہ یہ دنیا چھوڑ گئے ہیں۔" راجو نے کہا۔
"کک...... کون بول رہے ہو تم اور یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔" مینا غصے سے بولی۔
"میں سب انسپکٹر ریاض حسین بول رہا ہوں۔ زبان سنبھال کر بات کرو۔" راجو نے اپنے پولیس والا

ہونے کا رعب جمایا۔

یہ سن کر مینا نے فوراً لائن کاٹ دی۔

"فون کاٹ دیا کیوں کیا ہوا اب میں پولیس والا ہوں کوئی بھی ایرا غیرا مجھ سے ایسے ہی کچھ بھی نہیں بول سکتا۔"

راجو بیڈ روم سے نکل گھر کے پیچھے کی طرف آ گیا۔

"اف۔ کتنی بے رحمی سے مارا ہے درندے نے۔" راجو نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"کیوں برخوردار چھوٹ گئے پسینے......" اس کی حالت دیکھ کر چوہان ہنس پڑا۔

"سر آپ کو تو یہ سب دیکھنے کی عادت ہو گئی ہے میں تو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں تمہیں بھی عادت ہو جائے گی اس کمرے سے کچھ ملا۔"

"ہاں سر یہ سونے کی چین ملی ہے۔" راجو نے کہا۔

"راجو نے فون والی بات بھی چوہان کو بتا دی۔

"اس کا نام تو پوچھ لیتے؟"

"میں پوچھنے ہی والا تھا مگر پولیس کا سن کر اس نے لائن ہی کاٹ دی۔" راجو بولا۔

"کوئی بات نہیں اس کے نمبر سے اس کے گھر کا ایڈریس ٹریس کر لیں گے۔" چوہان نے کہا۔

"سر آپ کو کیا لگتا ہے کہ یہ سارے خون کوئی عورت کر سکتی ہے۔" راجو نے چوہان کا نظریہ معلوم کرنے کے لیے پوچھا۔

"کیوں نہیں، آج کل کوئی بھی کچھ بھی کر سکتا ہے اس عینی شاہد نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔" چوہان بولا۔

"مگر مجھے تو وہ لڑکی قاتل نہیں لگتی۔" راجو نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"برخوردار تمہیں کیا لگتا ہے اور کیا نہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قانون میں صرف ثبوت بولتے ہیں۔" چوہان نے اسے سمجھایا۔

پھر چوہان نے ایک سپاہی کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ "ان لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دو۔"

"جی سر۔" سپاہی نے کہا۔

"چلو برخوار دار یہاں کا کام تو ختم۔" چوہان اب راجو سے مخاطب ہوا۔

"اب کہاں جانا ہے سر۔"

"پہلے تھانے چلتے ہیں۔ بعد میں سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد چوہان اور راجو جیپ میں تھانے کی طرف چل پڑے۔

"سر اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھنی ہے۔"

"ہاں پوچھو کیا بات ہے؟"

"سر کل میں نے آپ کو اسی جیپ میں دیکھا تھا۔ آپ کسی لڑکی کو سڑک پر اتار کر آگے بڑھ گئے تھے۔ وہ لڑکی کون تھی؟"

"کیوں...... تمہارا بھی دل آ گیا کیا اس پر؟" چوہان ہنستے ہوئے بولا۔

"نہیں سر میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ اس لیے پوچھ رہا ہوں۔" راجو فوراً بولا۔

"کال گرل تھی وہ، میں نے اسے ایک ہوٹل میں پکڑا تھا بہت خوبصورت تھی اس لیے میں نے ہاتھ مار لیا اور اوپر سے میرے دوست پرویز کا برتھ ڈے بھی تھا اب تم ہی بتاؤ اس سے اچھا برتھ ڈے گفٹ کوئی ہو سکتا تھا کیا پہلے تو بہت نخرے دکھا رہی تھی۔ بعد میں ہم دونوں نے مل کر اس کے سارے نخرے ٹھکانے لگا دیئے اور تم بھی ایک بات سمجھ لو۔ اس نوکری میں تمہیں ایک سے بڑھ کر ایک آئٹم ملے گی۔ مگر سوچ سمجھ کر

کھیلنا پھنس بھی سکتے ہو آج کل میڈیا والے بہت پیچھے پڑے رہتے ہیں۔"

چوہان کی بات سن کر راجو کا دل بیٹھ گیا۔

"سحرش کے ساتھ اتنا کچھ ہو گیا آخر یہ سحرش کس چکر میں پھنس گئی ہے۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" راجو نے سوچا۔

"کیا ہوا برخوردار کس سوچ میں ڈوب گئے۔" چوہان نے اسے ٹوکا۔

"کچھ نہیں سر۔ بس ایسے ہی۔" راجو دانت نکالتا ہوا بولا۔

راجو کو سحرش کے بارے میں یہ سب سن کر بہت برا لگا تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ سحرش جیسی لڑکی ایسے چکروں میں پھنس جائے گی۔

"ضرور کوئی مجبوری رہی ہو گی اس کی۔" راجو کی سوچ نے کہا۔

☆☆☆☆☆☆☆

مینا ٹی وی کے سامنے کھڑی آنکھیں پھاڑے خبریں دیکھ رہی تھی۔

"اوہ مائی گاڈ...... سہیل تو سچ میں مارا گیا وہ دونوں پولیس والے بھی نہیں بچے اگر میں تھوڑی دیر اور وہاں رکتی تو شاید میرا بھی یہی حشر ہوتا، یہ کیا ہو رہا ہے اس شہر میں۔"

پیچھے سے راجہ نواز آ کر مینا کو اپنی بانہوں میں بھرتا ہوا بولا۔ "کیا بات ہے ڈارلنگ تم اتنی پریشان سی کیوں لگ رہی ہو اور یہ کیسی نیوز لگا رکھی ہے تم نے۔"

"تت...... تم اٹھ گئے۔" مینا بوکھلا کر بولی۔

"میں تو کب سے اٹھا ہوا ہوں۔ تم ہی بستر سے غائب تھیں۔"

"میں آج کل غسل کے بعد عبادت میں دل لگا رہی ہوں۔ اس لیے جلدی اٹھ جاتی ہوں۔"

"ہوں۔ تبھی یہ بھینی بھینی خوشبو آ رہی ہے۔ آؤ تھوڑی مستی ہو جائے۔" راجہ نے شرارت سے کہا۔

"میرا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ بعد میں۔"

"اوہ، میری بیوی کے نخرے روز بروز بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ کہیں کسی اور سے تو دل نہیں لگا لیا۔"

"کک کیسی باتیں کرتے ہو، تمہارے سوا میں کسی سے پیار نہیں کر سکتی۔"

"سچ کہہ رہی ہو؟" جیسے اسے یقین نہ ہو۔

"اور نہیں تو کیا؟" لہجے میں اعتماد کا فقدان جھلک رہا تھا۔

راجہ نے مینا کو گود میں اٹھایا اور بیڈ روم کی طرف چل پڑا۔

"آج تمہارا کوئی نخرہ نہیں چلے گا۔"

"اف سمجھا کرو۔ ابھی میرا موڈ آف ہے۔"

"میری محبت تمہارا موڈ ٹھیک کر دے گی۔"

"تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم وقت سے پہلے کیسے پہنچ گئے، ٹرین تو اکثر لیٹ ہو جاتی ہے اور تم تو ایک گھنٹہ پہلے ہی گھر بھی پہنچ گئے۔" مینا نے کہا۔

تمہیں اس سے کیا، میں ٹائم پر بلکہ ٹائم سے پہلے گھر تو آ گیا نا اب تم میرا موڈ مت خراب کرو ایسے الٹے سیدھے سوال کر کے۔"

مینا کے دماغ میں ابھی بھی سہیل کا خیال گھوم رہا تھا۔ "اف کہیں میں نہ کسی مصیبت میں پھنس جاؤں میرے نمبر سے پولیس میرا گھر ٹریس کر سکتی ہے۔ پولیس کسی وقت یہاں بھی آ سکتی ہے اب میں کیا کروں۔"

اسی دوران راجہ کی دست درازیاں بڑھنے لگیں۔

"ٹھہرو مجھے بس پانچ منٹ دو میں ابھی آتی ہوں۔" مینا نے اس کی پیش رفت کو روکتے ہوئے کہا۔

"اب کیا ہو گیا تمہیں؟" راجہ نے برا سا منہ بنا

کر کہا۔
"بس ڈارلنگ ابھی آئی پھر تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"
"ٹھیک ہے جلدی کرو جو کرنا ہے۔"
مینا بھاگ کر باہر آئی اور اپنے پرس سے موبائل نکال کر گھر کی چھت کی طرف بھاگی چھت پر آ کر اس نے موبائل آف کر کے سم سمیت گھر کے پیچھے پھیلی جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ "اب پولیس مجھ تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ موبائل بھی سہیل کا تھا اور سم کارڈ بھی اسی کے نام پر تھا۔" مینا بڑبڑائی اور تیزی سے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی جہاں راجہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔
حالانکہ مینا ابھی بھی الجھی ہوئی تھی لیکن پھر بھی وہ راجہ کے ساتھ ڈرامہ کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی کہ کسی بھی طرح اس کے شوہر کو کوئی شبہ نہ ہونے پائے۔
مخصوص لمحات کی راحتوں میں کھوتے ہوئے اچانک اس کے منہ سے نکلا۔ "آہ سہیل۔"
"کیا کہا تم نے۔" راجہ چونک پڑا۔
مینا کی سٹی گم گئی۔
"کک کچھ نہیں۔"
"تم نے شاید سہیل کہا تھا۔" راجہ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔
"ہاں..... وہ..... میں نیوز دیکھ رہی تھی نا اس میں کسی سہیل کے قتل کی خبر دکھا رہے تھے شش..... شاید وہ خبر میرے دماغ پر حاوی ہوگئی ہے..... بے خیالی میں منہ سے نکل گیا۔" مینا نے بات ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"نہیں..... مجھے لگتا ہے کچھ گڑبڑ ہے۔"
"گگ گڑبڑ..... گڑبڑ کیا ہوگی..... کہا نا ویسے ہی منہ سے نکل گیا۔"
راجہ نے اسے خود سے بھینچ لیا۔
"آہ راجہ۔"
"اب کی بار صحیح نام لیا تم نے۔ شاباش۔" راجہ نے کہا۔
"تو تمہیں کیا توقع تھی؟"
"میں ڈر رہا تھا کہ اس بار کسی اور کا نام نہ لے لو۔" راجہ ہنستے ہوئے بولا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"ملک صاحب کچھ پتہ چلا کہ کس کا نمبر تھا وہ۔" چوہان نے پوچھا۔ راجو بھی اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔
"سر وہ نمبر بھی سہیل کے نام پر ہی رجسٹرڈ تھا۔ موبائل ٹریس کیا تو وہ ایک جگہ جھاڑیوں میں پڑا ملا۔"
"تمہیں چاہئے تھا کہ فوراً وہ فون میرے ہاتھ میں دے دیتے ایڈیٹ۔" چوہان نے راجو کی طرف دیکھ کر جھلا کے کہا۔
"سوری سر آئندہ احتیاط کروں گا۔" راجو نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔
"یہ بات اس قیامت کو نہ پتا چلے ورنہ وہ میری کھٹیا کھڑی کر دے گی۔" چوہان نے کہا۔
"سر میں جاؤں اب۔"
"پولیس کی نوکری چوبیس گھنٹوں کی ہوتی ہے برخوردار کہاں جانے کی سوچ رہے ہو۔" چوہان نے ٹوکا۔
"سر آج پہلا دن ہے گھر پر بھی تھوڑا جشن منالوں ورنہ آس پڑوس کے لوگ ناراض ہو جائیں گے کہ وردی ملتے ہی ریاض حسین صاحب اونچے اڑنے لگے ہیں۔" راجو ہنستے ہوئے بولا۔
"ٹھیک ہے آج تو جاؤ مگر کل سے جلدی جانے کی سوچنا بھی مت۔" چوہان نے گھورتے ہوئے کہا۔
راجو گہری سانس لے کر چپ چاپ وہاں سے

نکل آیا۔
"اف، مجھے ٹرینڈ کرنے کے لیے میڈم کو یہ چوہان ہی ملا تھا۔" راجو نے سوچا۔
وہاں سے راجو سیدھا مراد کے کمرے پر پہنچا اور دروازے پر دستک دی۔ دروازہ وردا نے کھولا۔
"آپ یہاں اکیلی ہیں استاد کہاں ہے؟" راجو نے پوچھا۔
"مراد میرے لیے کچھ کپڑے لینے گیا ہے۔"
"ارے میں بھی سوچ رہا تھا کہ آپ کب تک ان کپڑوں میں رہیں گی۔"
"راجو مجھے اپنے گھر جانا ہے کیا کوئی راستہ نکل سکتا ہے۔" وردا نے پوچھا۔
"آپ فکر نہ کریں۔ میں خود لے کر جاؤں گا آپ کو، بس ایک دو دن اور رک جائیں۔" راجو نے کہا۔
وردا مایوس ہو کر بیٹھ گئی۔ اسی دوران مراد بھی آ گیا۔
"استاد تم نے یہ کام اچھا کیا کہ وردا میڈم کے لیے کچھ کپڑے لے آئے۔"
"اس طرف بھی سحرش نے دھیان دلایا تھا۔ ورنہ مجھے تو خود خیال نہیں رہا اور نہ ہی وردا نے کچھ کہا۔"
"میڈم آپ کپڑے ٹرائی کر لیں۔ ہم باہر جاتے ہیں۔ آؤ استاد۔ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" راجو نے کہا۔
باہر آ کر راجو نے سہیل کے گھر پر ہونے والی ساری تفتیش سے مراد کو آگاہ کر دیا۔
"اف..... یہ قاتل واقعی میں کسی درندے سے کم خطرناک نہیں ہے۔" مراد بولا۔
"ہاں استاد اور سحرش کے بارے میں بھی عجیب باتیں پتا لگی ہیں جن پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔"
"کیا پتا چلا میری سحرش کے بارے میں جلدی بتاؤ؟" مراد جلدی سے بولا۔
"تمہاری سحرش..... یہ سحرش تمہاری کب سے ہوگئی استاد۔" راجو نے پوچھا۔
"بس ہوگئی۔ تم اس پر لائن مت مارنا۔ اب وہ میری ہے۔" مراد نے کہا۔
"یہ خوب رہی استاد یہ ٹھیک نہیں کر رہے ہو تم۔" راجو کے لہجے میں ناراضگی تھی۔
"نغمہ ہے نا تمہارے پاس سحرش کا کیا اچار ڈالو گے۔"
"ایسا کیا ہوگیا جو تم سحرش کے پیچھے پڑ گئے۔"
"میں نے اس کا چیلنج قبول کر لیا ہے کہ میں اسے پٹا کر رہوں گا۔" مراد بولا۔
"ہی..... ہی کیا خوب کہی، چیلنج کے لیے سحرش ہی ملی تھی میری چپل گھس گئی اسے پٹانے کے چکر میں مگر اس نے ایک بار بھی گھاس نہیں ڈالی۔" راجو پیٹ پکڑ کر ہنسے جا رہا تھا۔
"تم بولو نا۔ سحرش کے بارے میں کیا بولنے والے تھے۔" مراد نے اسے یاد دلایا۔
راجو نے مراد کو چوہان سے معلوم ہونے والی ساری بات بتا دی۔
"یار ضرور بلیک میلنگ کا چکر رہا ہوگا۔ ورنہ سحرش ایسی لڑکی نہیں لگی مجھے۔"
"برتھ ڈے گفٹ بن چکی ہے وہ، مجھے تو خود یقین نہیں ہوا۔" راجو بولا۔
"کچھ بھی ہو میں پھر بھی سحرش کو پٹا کر ہی رہوں گا۔" مراد کا ارادہ اٹل لگ رہا تھا۔
"جیسی تمہاری مرضی استاد اب دوستی تو نبھانی ہی پڑے گی نا، جاؤ میں تمہارے راستے سے ہٹ جاتا ہوں۔" راجو نے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
"ابے تم راستے میں تھے ہی کب جو ہٹو گے تمہیں تو وہ بالکل بھی پسند نہیں کرتی۔" مراد بولا۔

”پھر بھی میری یہ قربانی یاد رکھنا استاد کہیں بھول جاؤ۔“

”بالکل میرے راجو میں تمہاری یہ عظیم قربانی ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

دونوں ہنستے ہوئے کمرے کی طرف واپس مڑ گئے۔

”کیسے لگے کپڑے؟“

”ٹھیک ہیں تم نے کچھ سوچا کہ آگے کیا کرنا ہے۔ میں ہمیشہ تو یہاں اس کمرے میں نہیں پڑی رہ سکتی۔“

اس سے پہلے کہ مراد کچھ جواب دیتا راجو بول پڑا۔ ”استاد ایسا کرتے ہیں پرویز کا ایڈریس تو آپ کے پاس ہے ہی، پہلے کنفرم کر لیتے ہیں کہ وہی وہ درندہ صفت قاتل ہے۔ پھر آگے میں سب سنبھال لوں گا جو انسپکٹر اس کیس کو ہینڈل کر رہا ہے میری اسی کے ساتھ ڈیوٹی لگی ہے۔“

”پہلے ہم دونوں چلتے ہیں وہاں بعد میں وردا کو لے جائیں گے۔ کیا کہتے ہو۔“ مراد نے کہا۔

”ٹھیک ہے چلو پھر انتظار کس بات کا ہے۔“

کچھ دیر بعد راجو اور مراد بائیک پر سوار ہو کر پرویز کے گھر کی طرف چل پڑے۔

”گھر تو یہی ہے مگر کوئی دکھائی نہیں دے رہا۔“ مراد بولا۔

”گھر کی بیل بجا کر دیکھتے ہیں کہ کون باہر آتا ہے۔“ راجو نے مشورہ دیا۔

”دیکھ لو کہیں کوئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔“

”سب انسپکٹر ریاض حسین تمہارے ساتھ ہے استاد فکر کیوں کر رہے ہو۔“ راجو سینہ اکڑاتے ہوئے بولا۔

”تم ساتھ ہو تب ہی تو فکر ہو رہی ہے۔“ مراد نے ہنس کر کہا۔

”ارے استاد ایسے کیوں بول رہے ہو تم۔“

”مذاق کر رہا ہوں یار۔ چل بیل بجاتے ہیں۔“

یہ کہہ کر مراد نے گھر کی بیل کا بٹن دبا دیا۔ اور کچھ دیر بعد دروازہ کھلنے لگا۔

”آپ یہاں۔“ مراد کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

راجو بھی اس لڑکی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”یہ میرا گھر ہے۔ تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”لگتا ہے ہم غلط ایڈریس پر آ گئے ہیں۔ ہم تو اسے پرویز کا گھر سمجھ کر آئے تھے۔“ مراد نے کہا۔

”پرویز میرے بڑے بھائی ہیں۔ ابھی وہ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ بولیے کیا کام ہے۔“

”چھوڑیئے۔ ہمیں ان سے ہی کام تھا۔ ہم پھر کبھی مل لیں گے۔“ مراد بولا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔ چائے پانی کچھ لیں گے آپ۔“ لڑکی نے کہا۔

”پہلے ہمیں اندر تو بلا لیجئے یہاں کھڑے کھڑے چائے پینا کچھ عجیب سا نہیں لگے گا؟“ راجو نے کہا۔

”اوہ سوری پلیز اندر آ جائیں۔“ لڑکی نے ایک طرف ہوتے ہوئے کہا

مراد نے اندر آتے ہوئے راجو کی پیٹھ تھپتھپائی۔

”آپ بیٹھیں میں ابھی چائے لاتی ہوں۔“

”یہ تصویر کس کی ہے۔“ راجو نے کہا۔

”عجیب بات ہے آپ لوگ بھیا سے ملنے آئے ہیں اور ان کی تصویر نہیں پہچانتے۔“ لڑکی کے لہجے میں ہلکا سا شبہ ابھر آیا۔

”یہ پرویز کو نہیں جانتا میں جانتا ہوں یہ تو بس میرے ساتھ آیا ہے۔“ مراد نے بات کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

”اوہ اچھا ٹھیک ہے میں چائے لاتی ہوں۔“

”ابے تم نے پہچانا نہیں کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کی وہ لڑکا وکی عریاں فلم بنانے والا تھا۔“ مراد بولا۔

”پہچان لیا استاد! ایسا کرتے ہیں یہ فوٹو لے چلتے ہیں۔ وردا جی کو بھی دکھا دیں گے کیا بولتے ہو۔“ راجو نے آہستہ سے کہا۔

”اوئی......شو...... ہٹو یہاں سے۔“ کچن سے آواز آئی۔

”شاید کوئی چوہا یا کاکروچ پریشان کر رہا ہے اسے میں دیکھ کر آتا ہوں۔“ مراد بولا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ میں یہ تصویر ٹھکانے لگاتا ہوں۔“ راجو نے کہا۔

مراد جب کچن میں آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ لڑکی چینی کا ڈبہ اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی مگر ڈر رہی تھی کیونکہ اس پر ایک موٹا سا کاکروچ بیٹھا ہوا تھا۔

”ہا......ہا۔“ مراد ہنسنے لگا۔

لڑکی نے مڑ کر دیکھا اور بولی۔ ”آپ کو ہنسنے کی بجائے میری مدد کرنی چاہئے۔“

”اوہ سوری۔“ مراد نے کہا اور لڑکی کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے ہاتھ کے جھٹکے سے کاکروچ کو ہٹا دیا اور کاکروچ بھاگ کر کسی کونے میں چھپ گیا۔

”لیجئے ہو گئی آپ کی مدد ویسے آپ کا نام کیا ہے؟“ مراد نے پوچھا۔

”غزل۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

”واہ کتنا خوبصورت نام ہے غزل، دل چاہتا ہے کہ یہیں بیٹھ کر یہ غزل پڑھتا رہوں۔“ مراد دل پھینک انداز میں بولا۔

”آپ بیٹھیں میں چائے لاتی ہوں۔“

”چائے بھی پی لیں گے آپ کو میرا یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں لگ رہا کیا۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ وہ کاکروچ بھگا دیا میں نے اب آپ کو یہاں میرا ٹھہرنا شاید گراں گزر رہا ہے۔“

”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“

”یعنی میں یہاں ٹھہر سکتا ہوں۔“ مراد مسکرا کر بولا۔

”آپ کا دوست باہر چائے کا انتظار کر رہا ہے۔“

”چائے بھی اسے مل جائے گی۔“ ویسے یاد ہے نا اس دن ہم نے ہی تم دونوں لڑکیوں کو بچایا تھا۔“ مراد نے اپنا احسان یاد دلاتے ہوئے کہا۔

”تو کیا آپ اس احسان کا معاوضہ چاہتے ہیں۔“ غزل سوالیہ انداز میں بولی۔

جواب میں مراد نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”جب تک چائے بنے تب تک کچھ ادائیگی ہو جائے تو، بہت خوبصورت ہیں آپ۔“

”آہستہ بولیں آپ کا دوست سن لے گا۔“

”تو سن لینے دو آپ کی تعریف ہی تو کر رہا ہوں نا بس۔“

یہ کہہ کر مراد نے غزل چھیڑنی شروع کر دی۔

”اب تم دونوں جاؤ یہاں سے۔ چائے وائے رہنے دو۔ بھیا واپس آئیں گے تو انہیں میسج دے دوں گی۔ اپنا نام اور موبائل نمبر بتا دو۔“ غزل مراد کو خود سے دور کرتے ہوئے بولی۔

”تو کیا مجھے چائے تک نہیں ملے گی۔“ راجو بولا۔

غزل نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ ”ٹھیک ہے بیٹھو دو منٹ۔ ابھی لاتی ہوں چائے۔“

”بھئی میں تو آپ کے ہاتھوں کی چائے پی کر ہی جاؤں گا۔“ راجو نے کہا اور مراد کے ساتھ باہر آ گیا۔

غزل کچھ ہی دیر میں چائے لے آئی۔

”آج آپ نے مجھے موقع نہیں دیا۔“ راجو بولا۔

”موقع تو لینا پڑتا ہے دیا نہیں جاتا۔“ غزل نے کہا۔

راجو نے مراد کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا۔ ”کیا کہتے ہو استاد۔ لے لوں موقع۔“

مراد نے بھی آنکھ جھپکا کر ہاں کا سگنل دے دیا۔

راجو نے آؤ دیکھا نا تاؤ آگے بڑھ کر غزل کو اپنی بانہوں میں اٹھایا اور کمرے میں غائب ہو گیا۔

ادھر مراد صوفے پر بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔

”کتنا وقت لگا رہا ہے یہ راجو کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔“

اچانک مراد کو گھر کے باہر کار کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ مراد نے فوراً کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔

”اوہ نو...... یہ تو پرویز ہی لگ رہا ہے۔“

مراد فوراً بیڈ روم کی طرف بھاگا۔ اور اندر آ کر راجو کے کندھے پر ہاتھ رکھا جو غزل پڑھنے میں مصروف تھا۔

”کک ......کون ہے؟“ راجو چونک کر بولا۔

”ارے استاد کیوں ڈسٹرب کر رہے ہو۔“

مراد نے راجو کے کان میں کہا۔ ”پرویز آ گیا ہے۔ چل اٹھ جلدی۔“

”کیا ہوا؟“ غزل نے آنکھیں کھول کر پوچھا۔

”میں اسے کہہ رہا ہوں کہ تمہارا بھائی آ گیا ہے۔“

”اوہ تم دونوں فوراً دفعہ ہو جاؤ۔ میرے بھائی نے دیکھ لیا تو میری جان لے لے گا۔“

اسی وقت گھر کی بیل بجنے لگی۔

”تمہارے گھر کا پیچھے سے بھی کوئی راستہ ہے کیا؟“ مراد نے پوچھا۔

”ہاں ہے مگر کیا تم بھیا سے نہیں ملو گے۔“ غزل حیران ہو کر بولی۔

”ابھی نہیں پھر کبھی انہیں کہیں شک نہ ہو جائے کہ ہم اور تم اکیلے۔“ مراد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو جلدی آؤ میرے ساتھ۔“

غزل نے راجو اور مراد کو پچھلے دروازے سے باہر نکال دیا اور خود بھاگ کر آگے کے دروازہ کھولنے لگی۔

”کیا کر رہی تھیں دروازہ کھولنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی۔“ پرویز نے پوچھا۔

”بھیا میں واش روم میں تھی سوری۔“ غزل نے بات بنائی۔

”اور یہ پسینہ کیوں آ رہا ہے تمہیں جاؤ پانی لے کر آؤ۔“

”جی بھیا ابھی لائی۔“

”بال بال بچ گئی۔“ غزل نے کچن کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

”فوٹو ساتھ لایا کہ نہیں۔ یا پھر مستی کرتے ہوئے سب بھول گیا۔“ مراد نے پوچھا۔

”لایا ہوں استاد لایا ہوں۔ یہ دیکھو۔“ راجو نے جیب سے فوٹو نکال کر دکھایا۔

”شکر ہے۔“

گھر آ کر راجو نے پرویز کی تصویر وردا کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ”یہی ہے نا وہ درندہ؟“

”نہیں۔ یہ وہ نہیں ہے۔“ وردا نے گہری سانس لے کر کہا۔

”کیا......؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے سحرش تو کہہ رہی تھی کہ یہی قاتل ہے۔“ راجو نے کہا۔

مراد اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ”ساری محنت بیکار گئی۔“

کمرے میں ایک سناٹا چھایا ہوا تھا راجو کچھ دیر تک تصویر کو دیکھتا رہا پھر اس نے تصویر واپس اپنی جیب میں رکھ لی۔

”پھینک دو تصویر کو اب اس کا کیا کرو گے۔“ مراد بولا۔

”واپس کر دیں گے استاد اچھا تھوڑی لگتا ہے کہ کسی کی تصویر چرا کر ڈسٹ بن میں پھینک دو۔“

وردا مایوسی کے عالم میں بستر پر بیٹھی ہوئی جانے کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی اس کے چہرے پر فکر اور پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔

”کیا ہو گا اب؟“ وردا نے کہا۔

راجو نے مراد کی طرف دیکھا اور اس نے بھی اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

”آج استاد پہلی بار اتنا پریشان لگ رہا ہے۔“ راجو نے سوچا۔

اس وقت دروازے پر دستک ہونے لگی۔

”کون ہو سکتا ہے؟“ راجو بولا۔

”دروازہ کھولو اور دیکھ لو۔“ مراد نے کہا۔

راجو نے دروازہ کھولا سامنے سحرش کھڑی تھی۔

”سحرش تم...... آؤ...... آؤ۔“ راجو نے کہا۔

سحرش اندر آ کر وردا کے پاس بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا...... تم سب خاموش کیوں ہو؟“ سحرش نے کمرے میں چھائی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”جسے تم قاتل سمجھ رہی تھیں۔ وہ قاتل نہیں ہے۔“ مراد بولا۔

”کیا! ایسا نہیں ہو سکتا۔“ سحرش جلدی سے بولی۔

”ایسا ہی ہے سحرش۔“ وردا نے کہا۔

”سوری میں نے تم لوگوں کا وقت برباد کیا۔“ سحرش کے لہجے میں افسوس تھا۔

”کوئی بات نہیں اسی بہانے ہمیں آپ کا ساتھ مل گیا۔“ مراد نے کہا۔

سحرش نے مراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں وردا کا ساتھ دے رہی ہوں۔ تمہارا نہیں۔“

”بات تو ایک ہی ہے ہم سب ساتھ ساتھ ہیں۔“

”وردا۔ مجھے بہت افسوس ہے میں تو بس تمہاری مدد کرنا چاہتی تھی۔“ سحرش نے وردا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”اٹس او کے آپ کے ساتھ دینے کا بہت بہت شکریہ۔“ وردا بولی۔

”ہاں آپ کی محبت اور تعاون ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا۔“ مراد اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

”یہ استاد کو کیا ہو گیا ہے ابھی تو منہ لٹکائے بیٹھا تھا اور اب سحرش سے فلرٹ کر رہا ہے۔“ راجو نے سوچا۔

”اچھا میں چلتی ہوں، میں تو بس حال چال پوچھنے آئی تھی تمہارا۔“ سحرش نے وردا سے کہا اور اٹھ کر چل دی۔

”رکو میں تمہیں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔“ مراد نے کہا۔

”جی نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں خود ہی چلی جاؤں گی۔“ یہ کہتے ہوئے سحرش باہر نکل گئی اور مراد سحرش کے منع کرنے کے باوجود اس کے پیچھے چل پڑا۔

”راجو کنڈی لگا لینا۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

راجو کنڈی لگانے لگا تو وردا نے اسے روک دیا۔

”نہیں کنڈی مت لگاؤ اسے کھلا رہنے دو۔“

”کیوں کیا ہوا کنڈی تو ہماری حفاظت کے لیے ہے۔“ راجو نے کہا۔

”میں تمہارے ساتھ بند کمرے میں اکیلی نہیں رہوں گی۔“ وردا نے کہا۔

راجو نے دروازہ بھیڑ دیا اور کنڈی نہیں لگائی۔

”کیا آپ کو مجھ سے ڈر لگتا ہے؟“

”میں خوب جانتی ہوں کہ تم کس چکر میں ہو۔“

”میں تو بس آپ کی مدد کر رہا ہوں۔“ راجو نے کہا۔

اب وردا کیا بتاتی کہ اس نے خواب میں کیا دیکھا

تھا وہ تو خواب کو سچ ہونے سے ہر صورت میں روکنا چاہتی تھی راجو بیچارہ حیران اور پریشان ہو رہا تھا کہ آخر وردا اس کے ساتھ ایسا رویہ کیوں رکھے ہوئے ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

"میں نے کہا نا میں چلی جاؤں گی۔ میرے پیچھے مت پڑو۔" سحرش نے پلٹ کر کہا۔

"مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔"

"میں جانتی ہوں تمہاری ضروری بات۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ مجھے تم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" سحرش روکھے لہجے میں بولی۔

"تم برتھ ڈے گفٹ بننے کے لیے کیسے تیار ہو گئیں۔ ہم سے تو بات کرنے کی بھی روادار نہیں ہو۔" مراد نے جیسے بم کا گولہ سحرش کے سر پر گرا دیا۔

"برتھ ڈے گفٹ...... میں کچھ سمجھی نہیں۔"

"برتھ ڈے گفٹ! مطلب کسی نے اپنے دوست کو تمہاری صورت میں سالگرہ کا تحفہ پیش کیا۔" مراد بولا۔

سحرش کے پیروں کے نیچے سے جیسے زمین نکل گئی وہ حیران تھی کہ آخر مراد کو یہ سب کیسے پتہ چلا۔

"تمہیں کس نے بتایا یہ سب؟" وہ حیرت سے بولی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے یہ بتاؤ یہ سچ ہے کہ نہیں۔"

"میں تمہیں کیوں بتاؤں تم ہوتے کون ہو مجھ سے یہ سب پوچھنے والے۔" سحرش نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں اور میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے یہ سب کیوں کیا؟"

"میری مرضی، میں یہ سب اپنی خوشی سے کرتی ہوں سن لیا تم نے۔"

"یہ سچ نہیں ہے تمہاری کوئی مجبوری رہی ہوگی۔" مراد بولا۔

"اس سے تمہارا کیا واسطہ اب مجھے تنہا چھوڑ دو۔" سحرش پھٹ پڑی۔

"دیکھو میرا یقین کرو میں سچ میں تمہیں چاہنے لگا ہوں اور تمہارا بھلا چاہتا ہوں مجھے ساری بات بتاؤ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔" مراد نے سچے دل سے کہا۔

"مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ اب میں اس مصیبت سے نکل چکی ہوں۔"

"کیا تمہیں بلیک میل کیا گیا تھا۔" مراد جیسے ہر حال میں سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔

سحرش نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔

"ہاں، لیکن اب میری بات دھیان سے سنو تم بہت اچھا فلرٹ کرتے ہو لیکن مجھے فلرٹ کرنا بالکل پسند نہیں ہے۔"

"یہ فلرٹ نہیں یہ تو میرا پیار ہے۔" مراد نے صفائی پیش کی۔

"واقعی اب یہ بھی بتا دو کہ یہ جملے تم اب تک کتنی لڑکیوں سے بول چکے ہو۔" سحرش کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔

"تم تیسری ہو۔" مراد نے سچ بتا دیا۔

"شکر ہے تم نے سچ تو بولا۔"

"مگر ان دونوں کے لیے میں اتنا پاگل نہیں تھا جتنا تمہارے لیے ہو رہا ہوں۔"

"میرا گھر آ گیا ہے اب تم جاؤ۔"

"مووی دیکھنے چلو گی میرے ساتھ۔" مراد نے آفر دیتے ہوئے کہا۔

"بالکل بھی نہیں۔" یہ کہہ کر سحرش اپنے گھر کی طرف چل دی۔

مراد کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ "اصل مزا تو ایسی اڑیل گھوڑی کو راضی کرنے میں ہے۔ باقی سب بکواس ہے۔"

ادھر جیسے ہی سحرش گھر میں داخل ہوئی نغمہ نے پوچھ لیا۔ "کہاں چلی گئی تھیں تم؟"

"باجی میں وردا سے ملنے گئی تھی۔"

"وردا کو تم کیسے جانتی ہو؟"

"بس جانتی ہوں۔" سحرش نے گول مول جواب دیا۔

"کیا راجو اور مراد بھی تھے وہاں۔"

"ہاں وہ دونوں بھی تھے۔" سحرش بولی۔

"دیکھو ان دونوں سے بچ کر رہنا۔ ان کی باتوں میں مت آنا۔" نغمہ نے اسے سنہرا مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"باجی جو باتیں تم مجھے سکھا رہی ہو اگر تم خود بھی سیکھ لو تو زیادہ اچھا ہوگا۔ میں سب جانتی ہوں کہ آپ کیا کرتی پھرتی ہیں۔"

"یہ...... یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔" نغمہ اس کی باتیں سن کر حیران رہ گئی تھی۔

"راجو تو تھا ہی تم مراد کے ساتھ بھی......"

"یہ تمہیں کس نے بتایا؟" نغمہ کا خون بری طرح ابل رہا تھا۔

"باجی آپ بس سنبھل جائیں دنیا بہت بری ہے۔"

"میں جانتی ہوں مگر تم مجھے غلط مت سمجھو۔"

"تو پھر آپ ایسا کیوں کرتی ہیں۔" سحرش کو اچھا نہیں لگ رہا تھا اپنی بڑی بہن سے ایسی باتیں کرنا لیکن اب یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔

"ابا ابھی تک نہیں آئے۔" نغمہ نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

"ان کا فون آیا تھا کہہ رہے تھے اب وہ اگلے ہفتے آئیں گے۔"

"مجھے کم از کم بتا تو دیتیں میں یونہی پریشان ہو رہی تھی۔" نغمہ بولی۔

"آپ بات کو ٹال رہی ہیں باجی۔" سحرش نے پھر اصل بات پر آتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے تم کھانا کھا لو بعد میں بات کرتے ہیں۔" نغمہ نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆☆☆☆☆

ایک اور رات اپنے اندھیرے پر پھیلانے لگی تھی اور جوں جوں اندھیرے کی چادر دبیز ہوتی جا رہی تھی۔ شہر میں سناٹا پھیلنے لگا تھا۔ ہر کوئی یہی سوچ رہا تھا کہ کیا آج کی رات بھی کوئی حادثہ جنم لے سکتا ہے۔ سب یہی دعا کر رہے تھے کہ وہ درندہ صفت قاتل جلد سے جلد پکڑا جائے اور شہر میں امن اور سکون کی لہر دوڑ جائے۔

نغمہ اور سحرش بستر لگا کر لیٹ چکی تھیں۔

"باجی پچھلی دو راتیں تم کہاں رہیں۔" سحرش نے پوچھا۔

"دیکھو تم میرے معاملے میں زیادہ ٹانگ مت اڑاؤ سمجھیں تم کالج جاتی ہو کیا تم موج مستی نہیں کرتی ہوگی وہاں۔"

تب سحرش کی آنکھوں کے سامنے وہ سب مناظر گھومنے لگے جو اس نے وکی کے ساتھ گزارے تھے وکی سے ملنے کے لیے وہ کئی بار کالج سے غائب ہوئی تھی۔

"کیا ہوا چپ کیوں لگ گئی؟" نغمہ نے اسے ٹوکا۔

سحرش کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے اور وہ پیار کے نام پر ملنے والے دھوکے کے بارے میں سوچ کر آبدیدہ ہو گئی تھی۔

بہن کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر نغمہ فوراً اپنے بستر سے اٹھ کر سحرش کے پاس آ گئی۔

"ارے کیا ہوا تم تو برا مان گئیں میں تو یونہی کہہ رہی تھی کیا مجھے پتہ نہیں ہے کہ تم دو سال سے کالج میں فیل ہو رہی ہو۔"

"ہاں مگر آپ کی بات سچ تھی، میں ایک لڑکے کے پیار میں پھنس گئی تھی۔" سحرش نے سچائی کا اقرار کرتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ہوا جھوٹا پیار ہی تو تھا کچھ ایسا ویسا تو نہیں ہوا تھا نا۔" نغمہ کے لہجے میں سو اندیشے تھے۔

سحرش نے اپنی بڑی بہن کی آنکھوں میں دیکھا اور نغمہ سب سمجھ گئی۔

"چل کوئی بات نہیں۔" نغمہ نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"مگر آپ تو کمال کر رہی ہیں باجی ایسا کوئی کرتا ہے کیا جیسا آپ کر رہی ہیں۔"

"تم میری فکر چھوڑو اور آئندہ سے دھیان رکھنا کہیں پھر کوئی مجنوں بن کر تمہیں پیار بھرا دھوکہ نہ دے جائے۔"

"میں دوبارہ کسی کے پیار کے چکر میں نہیں پڑوں گی مگر آپ یہ بتائیں کہ کیا مراد نے بھی آپ کے ساتھ......" سحرش نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہاں ایک بار۔" نغمہ اقرار کرتی ہوئی بولی۔

"چھی...... آپ بھی نا حدیں ہی پار کر جاتی ہو۔"

"اب جب پٹارہ کھل ہی گیا ہے تو صاف صاف بات کرنی چاہئے، تم اپنی کہانی سناؤ میں اپنی سناتی ہوں۔" نغمہ نے کہا۔ اور سحرش کو کیا پتہ تھا کہ اس کی بڑی بہن کو تو ایسی باتوں کا چسکہ تھا۔

"نہیں میری کوئی لمبی چوڑی کہانی نہیں ہے اور نہ ہی میں سنانا چاہتی ہوں۔" سحرش کی طرف سے صاف انکار تھا۔

"مجھے اندازہ تھا کہ تمہارا کسی نہ کسی کے ساتھ کوئی چکر چل ضرور رہا ہے۔ بڑی سج دھج کے کالج جاتی تھیں تم۔"

"باجی ایسی باتیں مت کرو۔ مجھے وہ دن یاد مت دلاؤ۔"

"اچھا میری کہانی سنے گی۔" نغمہ بڑے چاؤ سے بولی۔

"بالکل بھی نہیں۔ جاؤ سو جاؤ۔"

مگر نغمہ بھی کہاں ماننے والی تھی۔ اس نے کہانی سنانی شروع کر دی نغمہ کی کہانی ختم ہوئی اور اس نے سحرش پر نظر ڈالی تو اسے سوتا ہوا پایا۔

"یہ بھی وردا جیسی ہے میری باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی ہونہہ اور نہ اپنی بتاتی ہے۔"

نغمہ نے گھڑی میں وقت دیکھا رات کے دس بج چکے تھے باہر سے آنے والی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سن کر نغمہ سہم گئی۔

"کہیں وہ درندہ سیریل کلر یہیں کہیں تو نہیں گھوم رہا۔" نغمہ نے سوچا۔

"اف اگر پہلے سے پتہ ہوتا کہ آج ابا نہیں آئیں گے تو راجو کے ساتھ کوئی پروگرام بنا لیتی۔ لگتا ہے آج کی رات تو بیکار ہی جائے گی۔"

اچانک نغمہ کو گھر کے باہر کچھ ہلچل سنائی دی۔ وہ لائٹ بند کر کے کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"یہ بھولو حوالدار یہاں کیا کر رہا ہے۔" نغمہ نے سوچا۔ "مجھے تو یہ بھولو ہی قاتل لگتا ہے۔ راجو اور مراد کو بے وقوف بنایا ہے اس نے۔ مگر یہ اس وقت میرے گھر کے باہر کیا کر رہا ہے۔"

باہر سناٹا پھیلا ہوا تھا اور صرف کتوں کے بھونکنے

کی آوازیں آ رہی تھیں اور بھولو اس وقت نغمہ کے گھر کے عین سامنے کھڑا تھا۔

"آخر یہ چاہتا کیا ہے کیوں کھڑا ہے یہ میرے گھر کے سامنے۔" وہ بھولو پر برابر نظر رکھے ہوئے تھی۔ اچانک بھولو وہاں سے ہٹ گیا۔

"کہاں جا رہا ہے یہ...... اس کا گھر تو دوسری طرف ہے۔" نغمہ پھر سوچ میں ڈوب گئی۔

کچھ دیر تک نغمہ کھڑکی پر کھڑی باہر جھانکتی رہی۔ جب اسے مزید کچھ نظر نہیں آیا تو واپس اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔

"کچھ تو گڑبڑ ہے بھولو کے ساتھ، کمینے نے میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا مگر اس بات کا شکر ہے کہ اس نے میری جان تو نہیں لی تھی راجو کو آج کی بات ضرور بتاؤں گی، مگر وہ صرف کھڑا ہی تو تھا میرے گھر کے سامنے، کہیں وہ یہاں میرے چکر میں تو نہیں آیا تھا، نہیں نہیں میں اس کے ساتھ کیوں جاتی۔" نغمہ بستر پر پڑے پڑے ایسے ہی الٹے سیدھے خیالوں میں الجھی رہی۔

☆☆☆☆☆☆☆

"یہ استاد کہاں رہ گیا دس بج چکے ہیں۔" راجو نے کہا۔

وردا اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میڈم آپ کھانا کھائیں نا کب تک یونہی چپ چاپ بیٹھی رہیں گی۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے تم کھا لو۔" وردا بے دلی سے بولی۔

"آپ کے بغیر تو نہیں کھاؤں گا میں بھی۔"

"کہا نا مجھے بھوک نہیں ہے۔" وردا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"تھوڑا تو لے لیں ایسا کیسے چلے گا اور یہ آج بھوک کیوں نہیں ہے۔" راجو نے پوچھا۔

"مجھے اب پولیس کے پاس جا کر ساری سچائی بتا دینی چاہئے۔" وردا جیسے فیصلہ کرتے ہوئے بولی۔

"بات تو ٹھیک ہے میں آپ کے ساتھ ہوں، مگر اس سے حاصل کچھ نہیں ہوگا آپ کو پکڑ کر بند کر دیں گے اور کیس بند ہو جائے گا۔" راجو نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تو میں کیا کروں آخر ساری عمر یہیں پڑی رہوں۔"

"مجھ پر یقین رکھیں میں ہوں نا، میں اسی انسپکٹر کے ساتھ ڈیوٹی پر ہوں جو اس کیس کو ہینڈل کر رہا ہے۔"

"تمہارا استاد کہاں ہے؟" وردا نے پوچھا۔

"پتہ نہیں سحرش کو چھوڑنے گیا تھا نہ جانے کہاں رہ گیا۔" راجو نے جواب دیا۔

اسی وقت راجو کا موبائل بجنے لگا راجو نے فون ریسیو کر کے بات سنی اور آف کر دیا۔

"استاد آج گھر نہیں آئے گا۔" راجو نے کہا۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"اپنے کسی دوست کے ساتھ بیٹھا پی رہا ہے۔" راجو نے بوتل کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب مجھے اس مصیبت میں پھنسا کر خود دارو کا مزا لے رہا ہے۔" وردا بھنا کر بولی۔

"کچھ کھا لیں نا۔" راجو پھر ضد کرتا ہوا بولا۔

راجو کے بہت زیادہ کہنے پر وردا نے چند لقمے زہر مار کر لیے اسے کھاتا دیکھ کر راجو بھی کھانے لگا۔

"کل رات سہیل کے ساتھ کوئی لڑکی تھی اسے ڈھونڈنا پڑے گا، ہو سکتا ہے اسے کچھ پتہ ہو درندے کے بارے میں۔" راجو نے نوالہ چباتے ہوئے کہا۔

"وہ وہاں کیا کر رہی تھی؟" وردا نے پوچھا۔

"بیڈروم کے بستر کی چادر بکھری ہوئی تھی اور۔"

"بس بس سمجھ گئی۔" وردا نے راجو کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

"ابھی اس لڑکی کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلا' لیکن امید ہے کہ جلد ہی پتہ لگ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے راجو اب تم جاؤ مجھے نیند آ رہی ہے۔" وردا نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"نہیں تم جاؤ میں اکیلی رہ لوں گی۔" وردا ابھی بول ہی رہی تھی کہ اچانک کچھ اس کے ماتھے سے ٹکرایا۔

"آہ۔" وردا کراہ اٹھی۔

راجو نے غور کیا تو دیکھا کہ کاغذ میں لپٹا ہوا پتھر تھا راجو نے فوراً اسے اٹھایا اور کاغذ کو پتھر سے الگ کر کے پتھر ایک طرف پھینکا اور کاغذ پھیلا لیا' اس پر لکھا تھا۔

"تم بھاگ سکتی ہو مگر چھپ نہیں سکتیں۔"

راجو نے کاغذ وردا کی طرف بڑھایا اور فوراً باہر آ کر دیکھا کتے زور زور سے بھونک رہے تھے اور چاروں طرف سناٹا تھا راجو کو کوئی دکھائی نہیں دیا۔

وردا نے کاغذ پر لکھے الفاظ پڑھے تو تھر تھر کانپنے لگی راجو دروازہ بند کر کے واپس اندر آ گیا کچھ کچھ وہ بھی ڈرا ہوا تھا۔

"اس رات جنگل میں وہ قاتل چیخ چیخ کر یہی الفاظ بول رہا تھا جو اس کاغذ میں لکھے ہیں۔" وردا نے کانپتے ہوئے کہا۔

راجو نے فوراً کھڑکی بھی بند کر دی اور بولا۔ "اف وہ پستول بھی نہیں ہے آج استاد کو بھی آج ہی پینی تھی۔" پھر اس کا دھیان وردا کے ماتھے کی طرف گیا۔

"ارے آپ کے سر سے تو خون نکل رہا ہے۔"

وردا نے فوراً اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اسے ماتھے پر خون کی چپچپاہٹ سی محسوس ہونے لگی۔

راجو نے موبائل نکالا اور انسپکٹر چوہان کو فون لگایا مگر اس کا فون آف جا رہا تھا۔ پھر اس نے سب انسپکٹر وحید ملک کا نمبر ملایا بیل جا رہی تھی مگر کوئی فون ریسیو نہیں کر رہا تھا۔

"کیسے پولیس والے ہیں یہ' کوئی بھی ایمر جنسی ہو یہ نہیں ملیں گے۔" راجو بڑبڑایا۔

پھر راجو نے مراد کو فون کیا مگر وہ تو نشے میں دھت ہو رہا تھا وہ کیا فون اٹھاتا۔

"سب کے سب نکمے ہیں مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔" راجو نے کہا اور کنڈی کھولنے لگا۔

"کیا کر رہے ہو باہر مت جاؤ' وہ بہت خطرناک ہے۔" وردا نے روکتے ہوئے کہا۔

راجو رک گیا اور بولا۔ "مگر یہ اسے پکڑنے کا اچھا موقع تھا۔" پھر اسے وردا کی چوٹ کا خیال آیا "میڈم یہاں چوٹ پر لگانے کے لیے کچھ نہیں ہے آپ ایسا کریں کہ چوٹ پر ٹھنڈا پانی ڈال لیں خون بند ہو جائے گا۔"

"کوئی بات نہیں خون بند ہو چکا ہے معمولی سی چوٹ ہے ٹھیک ہو جائے گی۔" وردا نے کہا۔

"میڈم اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتی تو پتا نہیں کیا حال ہوتا اس کا آپ بڑی بہادری کے ساتھ اس صورت حال کا سامنا کر رہی ہیں۔" راجو نے اس کے حوصلے کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"بس زیادہ مکھن مت لگاؤ میں جانتی ہوں تم کیا کوشش کر رہے ہو۔"

"آپ میرے بارے میں ایسا کیوں سوچتی ہیں' میں تو بس۔"

"اسے پتا ہے کہ میں یہاں ہوں۔" وردا نے بات کا رخ قاتل کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"شاید۔" راجو نے مبہم سا جواب دیا۔

"شاید نہیں یقیناً ورنہ وہ یہ پتھر کیوں پھینکتا یہاں۔" وردا نے پرخیال لہجے میں کہا۔

"کل وہ نغمہ کے پیچھے یہاں آیا تھا' ہو سکتا ہے وہ اسی کے پیچھے ہو۔"

کل اس نے آپ کو پہچانا نہیں ہوگا' آج تو وہ کھڑکی کے پاس آیا ہی نہیں۔ بس دور سے پتھر پھینکا ہے اس نے۔"

"ہاں' مگر یہ تمہارا اندازہ ہے میں اب ایک پل کے لیے بھی یہاں نہیں رکوں گی اسی وقت گھر جا رہی ہوں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں یہ وقت کہیں آنے جانے کا نہیں ہے۔" راجو نے سمجھایا۔

"تو کیا کروں اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے اپنی قسمت کو روتی رہوں مجھے اب یہاں سے جانا ہی ہوگا۔"

"وردا جی آپ سمجھ نہیں رہی ہیں۔ وہ باہر ہی کہیں گھوم رہا ہے۔"

"تم بھی نہیں سمجھ رہے ہو۔ میرا یہاں رہنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔" وردا کے لہجے میں بے بسی کا عنصر نمایاں تھا۔

"میں سمجھ رہا ہوں مگر...... ایک منٹ۔"

"کیا ہوا۔" وردا نے پوچھا۔

"ایک کام ہو سکتا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ہم ڈی ایس پی شہلا احمد سے ملتے ہیں اور انہیں ساری بات بتاتے ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری بات سمجھ جائے گی۔" راجو نے ایک اور آئیڈیا پیش کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں...... کیسی ہے یہ شہلا احمد۔"

"بہت کڑک آفیسر ہیں ان کی وجہ سے ہی میری جوائننگ ہوئی ہے مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارا ساتھ دیں گی۔"

"تو چلو پھر دیر کس بات کی ہے۔"

"رکئے' میں پولیس جیپ منگواتا ہوں ایک سپاہی کا نمبر ہے میرے پاس جو کہ جیپ لا سکتا ہے۔" اب راجو واقعی عقل کی باتیں کرنے لگا تھا۔

راجو نے سپاہی کا نمبر ملایا اور اسے اپنے مطلوبہ پتے پر جیپ لانے کو کہا۔

"شکر ہے اس سپاہی نے فون اٹھا لیا وہ بیس منٹ مین یہاں پہنچ جائے گا۔"

بیس منٹ میں تو نہیں البتہ آدھے میں وہ سپاہی جیپ لے کر حاضر ہو گیا تھا راجو وردا کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا اور چاروں طرف نظر دوڑائی دور دور تک کوئی نظر دوسرا افرد نظر نہیں آ رہا تھا راجو نے کمرے کو تالا لگایا اور وردا کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔

"ہمیں ڈی ایس پی شہلا احمد کے گھر لے چلو۔" راجو نے سپاہی کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

"جی سر۔" سپاہی ادب سے بولا۔

رات نہایت اندھیری تھی اور اس سناٹے بھری رات میں پولیس جیپ سڑک پر اپنی رفتار سے دوڑی چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

نغمہ رہ رہ کر کروٹیں بدل رہی تھی۔

"یہ نیند کیوں نہیں آ رہی مجھے۔" وہ خود سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

اسے پھر سے گھر کے باہر کچھ آہٹ سی سنائی دی۔ وہ فوراً اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ گئی۔

"کیا یہ بھولا ابھی بھی یہاں گھوم رہا ہے۔" نغمہ نے سوچا۔

باہر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر آس پاس کچھ آہٹیں ضرور ہو رہی تھیں۔

"کہیں راجو تو نہیں، اسے پتہ چل گیا ہوگا کہ میرا ابا آج رات نہیں آیا، شاید وہ میرے لیے یہاں آیا ہو مگر وہ آتا تو دھیرے سے دروازے پر دستک تو ضرور دیتا جیسے ہمیشہ دیتا ہے۔ ویسے اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ایک بار بہت دیر تک کھڑا رہا تھا باہر اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا، دروازہ کھول کر دیکھوں کیا نہیں، دروازہ کھولنا ٹھیک نہیں ہوگا۔"

مگر نغمہ کو لگ رہا تھا کہ باہر کوئی ہے ضرور پھر نہ جانے اسے کیا سوجھی اس نے ہلکا سا دروازہ کھولا اور دائیں بائیں جھانک کر دیکھنے لگی۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے بس کتے بھونک رہے ہیں۔"

نغمہ دو قدم باہر آ گئی اور چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اچانک کسی نے اسے پیچھے سے دبوچ لیا اور ساتھ ہی ایک ہاتھ سے نغمہ کا منہ بھی بند کر دیا تاکہ وہ چلا نہ سکے۔

"گھبراؤ مت میں ہوں بھولو۔" بھولو نے کہا اور نغمہ کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو چھوڑو مجھے۔" نغمہ نے بھولو کو دیکھ کر سکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا ورنہ وہ تو سمجھی کہ آج وہ بن گئی اس درندے قاتل کا نیا شکار۔

"کل تم بڑی جلدی بھاگ گئی تھیں۔" بھولو نے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم اتنی رات کو یہاں کیا کر رہے ہو۔"

"تمہارے لیے ہی بھٹک رہا تھا یہاں کسی نے مجھے بتایا تھا کہ آج تمہارا ابا نہیں آئے گا تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ آج کی رات تمہارے ساتھ گپ شپ کی جائے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو، چھوڑو مجھے۔" نغمہ نے کسمسا کر خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"چلو نا نخرے مت کرو، چلو میرے گھر چلتے ہیں۔"

"نا بابا، میں وہاں نہیں جاؤں گی۔" نغمہ نے ڈر کے مارے کہا۔

"تو چلو تمہارے ہی گھر میں بیٹھ جاتے ہیں۔"

"میری چھوٹی بہن بھی ساتھ میں سو رہی ہے۔"

"اسے بھی شامل کر لیں گے فکر کیوں کرتی ہو۔" بھولو ہلکے سے ہنس کر بولا۔

"چپ کرو اگر میری بہن کے بارے میں کچھ بھی بولا تو زبان کھینچ لوں گی۔"

"پھر چل نا میرے گھر چلتے ہیں۔" بھولو نے اسے کھینچتے ہوئے کہا۔

نغمہ کی نفسانی خواہشات اس کے ہر ڈر اور وسوسے پر حاوی ہو رہی تھی اور وہ بہکنے کے لیے تیار تھی مگر پھر بھی نہ جانے کیوں وہ بھولو کے ساتھ جاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

"چلتی ہے یا یہیں کھڑے کھڑے پیار کا ڈرامہ شروع کر دوں۔" بھولو اس کے کان میں پھسپھسایا۔

"ٹھیک ہے چلتی ہوں مجھے گھر کو تالا تو لگانے دو۔" اس کی خواہشات اسے کچھ بھی کرنے پر اکسا رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔" بھولو ہنسنے لگا۔

نغمہ نے گھر کو تالا لگایا اور سحرش کو سوتا چھوڑ کر بھولو کے ساتھ چل پڑی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

راجو اور وردا، ڈی ایس پی شہلا احمد کے گھر کے باہر پہنچ گئے۔

"کیا سوچ رہے ہو بیل بجاؤ۔" وردا بولی۔

"بہت کڑک میڈم ہیں ڈر بھی لگتا ہے ان سے۔" راجو نے کہا۔

"تم ہٹو پیچھے مجھے بیل بجانے دو۔"

وردا نے بیل بجائی مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔

"لگتا ہے میڈم سو رہی ہیں۔" راجو بولا۔

وردا نے پھر سے بیل بجائی اور کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی راجو کا دل بیٹھ رہا تھا وہ ڈر رہا تھا کہ نہ جانے میڈم ان کی بات کو کس طرح سے لے گی اسے یقین تو تھا کہ وہ ان کی بات یقین سمجھ لیں گی لیکن پھر بھی ان کے گرم مزاج سے گھبرا رہا تھا۔

راجو کی انہی سوچوں کے درمیان دروازہ کھل گیا۔

"جی کہیے کیا کام ہے؟" ملازمہ نے دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

"کیا میڈم گھر پر ہیں؟" راجو نے پوچھا۔

"ہاں ہیں کیا کام ہے؟" ملازمہ نے اکھڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میڈم کی تو ملازمہ بھی کڑک ہے۔" راجو نے سوچا۔

"ہمیں ان سے ملنا ہے۔" وردا نے جواب دیا۔

"یہ کوئی وقت ہے ملنے کا، صبح آنا جاؤ یہاں سے۔"

"ہمیں کیا بھکاری سمجھ رکھا ہے میں سب انسپکٹر ریاض حسین ہوں ہمارا میڈم سے ملنا بہت ضروری ہے جاؤ میڈم کو میسج دے دو۔" راجو کو یاد آ گیا کہ وہ بھی تو پولیس والا ہے۔

"میڈم مجھ پر غصے ہوں گی۔" شاید ملازمہ بھی میڈم کے غصے سے خائف تھی۔

"کون ہے مالا۔" اندر سے میڈم کی آواز آئی۔

"میڈم آپ سے ملنا چاہتے ہیں یہ لوگ۔"

"یہ ملنے کا وقت ہے کیا، رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے شہلا احمد دروازے پر آ گئی۔

"ریاض حسین تم اور یہ لڑکی کون ہے؟"

"میڈم بات ذرا الجھی ہوئی ہے اگر ہم بیٹھ کر بات کریں تو ٹھیک رہے گا۔" راجو نے ادب سے کہا۔

"ہاں ہاں آؤ اندر...... آ جاؤ...... مالا جاؤ ان کے لیے چائے کا انتظام کرو۔" میڈم نے ملازمہ کو ہدایت دی۔

ملازمہ نے راجو اور وردا کو گھور کر دیکھا اور ناک سکوڑ کر وہاں سے چلی گئی۔

راجو اور وردا ایک صوفے پر بیٹھ گئے میڈم ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"انہیں کہیں دیکھا ہے۔" شہلا نے وردا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ وردا ہے جنہیں پورا پولیس ڈپارٹمنٹ پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہے۔" راجو نے کہا۔

"کیا......" شہلا یہ سنتے ہی کھڑی ہو گئی۔ "یہ تمہارے ساتھ کیا کر رہی ہے؟"

"میڈم انہوں نے کسی کا خون نہیں کیا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ صرف یہی جانتی ہیں کہ وہ درندہ صفت قاتل کون ہے۔" راجو نے وضاحت کی اور تفصیل سے پوری داستان شہلا کے گوش گزار کرنے لگا شہلا اس کی پوری بات بہت دھیان سے سن رہی تھی۔

"ہوں اگر تم سچی ہو تو تمہارے ساتھ بہت برا ہوا ہے مگر تمہیں پہلے ہی پولیس کو سچ بتا دینا چاہیے تھا۔" شہلا ساری بات سن کر بولی۔

"کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں ٹی وی پر اپنی تصویر دیکھ کر ڈر گئی تھی میں پولیس قاتل سمجھ کر مجھے ڈھونڈ رہی تھی ایسے میں کیسے آتی پولیس کے پاس۔" وردا نے کہا۔

"آج جب اس قاتل نے یہ کاغذی پیغام پتھر

میں لپیٹ کر پھینکا تو میں نے سوچا کہ آپ سے بات کر لینی چاہیے، صرف یہ جانتی ہے کہ قاتل کون ہے اس لیے وہ ان کے پیچھے پڑا ہے اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

"تمہارے پاس چوہان کا نمبر ہے۔" شہلا نے پوچھا۔

"جی میڈم ہے۔" راجو نے کہا۔

"اسے فوراً یہاں آنے کا کہو۔"

"اوکے میڈم۔"

یہ کہہ کر راجو نے پھر سے چوہان کا نمبر ملایا۔

"ارے اب مل گیا پہلے نہیں مل رہا تھا۔" کال ملنے پر راجو نے چوہان کو میڈم کے گھر پر آنے کو کہا۔

"کیا اب میں اپنے گھر جا سکوں گی۔" وردا بولی۔

"ہاں بالکل، مگر پوری حفاظت کے ساتھ جاؤ گی تم اپنے گھر، دو سپاہی تو وہاں پہلے سے ہیں دو اور لگا نے پڑیں گے، اچھا ایک بات تو بتاؤ؟" شہلا نے کہا۔

"جی پوچھیے۔"

"کیا تم اس قاتل کا اسکیچ بنوا سکتی ہو۔"

"کوشش کروں گی، مگر میرے لیے اس کے چہرے کو وضاحت سے بیان کرنا تھوڑا مشکل ہے۔"

"اوکے بعد میں اس پر بات کریں گے۔"

اسی دوران چوہان بھی وہاں آ گیا۔ اس نے راجو اور وردا کو گھور کر دیکھا۔

"مسٹر چوہان کس طرح سے ہینڈل کر رہے ہیں آپ اس کیس کو؟" شہلا نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"کیا ہوا میڈم۔" چوہان گڑگڑایا۔

"کیا اس عینی شاہد کے علاوہ تمہارے پاس وردا کے خلاف کوئی اور ثبوت تھا؟"

"جی نہیں میڈم بس وہی کافی تھا۔"

"کیسے کافی تھا، ریاض حسین جو تم نے مجھے بتایا ان کو بھی بتاؤ۔" شہلا نے کہا۔

راجو نے چوہان کو بھی ساری داستان سنا دی۔

"کچھ سمجھ میں آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔" شہلا نے استفسار کیا۔

"جی میڈم لیکن اگر کوئی پولیس کو آ کر کچھ بتائے گا ہی نہیں تو ہمیں کیسے پتا چلے گا۔" چوہان نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"جو بھی ہو مگر تم اس کیس کو ٹھیک طرح سے ہینڈل نہیں کر پا رہے ہو۔"

"مجھے ایک اور موقع دیجیے میڈم اصلی قاتل جلد سے جلد پولیس کی حراست میں ہو گا۔"

"ٹھیک ہے میں تمہیں ایک اور موقع دیتی ہوں، پہلے وردا کو ان کے گھر چھوڑنے کا انتظام کرو اور ان کے گھر کی حفاظت کا مکمل بندوبست کرو۔" شہلا نے چوہان کو ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

"میڈم وہ میڈیا والوں کو کیا کہیں گے؟" لگتا تھا چوہان کے سر پر میڈیا کا بھوت بہت زیادہ ہی سوار تھا۔

"ابھی کسی سے کچھ نہیں کہنا ہے یہ بات پولیس ڈپارٹمنٹ سے باہر نہیں جانی چاہیے۔"

"اوکے میڈم ایسا ہی ہو گا۔" چوہان نے کہا۔

وردا اور راجو اسی جیپ میں سوار ہوئے جس میں آئے تھے، ساتھ میں چوہان کی جیپ تھی اور اندھیری رات میں دونوں جیپیں وردا کے گھر کی طرف دوڑ رہی تھیں۔

وردا کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ برسوں بعد اپنے گھر لوٹ رہی ہو۔

گھر پہنچ وردا نے بیل کا بٹن دبایا تو اس کے ابو نے گھر کا دروازہ کھولا انہیں یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ سامنے ان کی بیٹی کھڑی ہے۔

"ابو ایسے کیا دیکھ رہے ہیں یہ میں ہوں وردا۔" وردا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بیٹا۔" بس وہ اتنا ہی کہہ پائے اور بیٹی کو گلے سے لگا لیا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے بیٹا۔" ابو نے سوال کیا۔

"سب بتاتی ہوں ان سے ملیے یہ ہیں انسپکٹر راجو، انہوں نے میری مدد کی تھی۔"

راجو نے وردا کے ابو کو ادب سے سلام کیا۔

"ٹھیک ہے وردا جی اب آپ اپنے گھر پہنچ گئی ہیں مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔"

"آؤ بیٹا کچھ چائے وغیرہ ہو جائے۔"

"نہیں انکل رات بہت ہو چکی ہے پھر کبھی سہی۔" راجو نے انکساری سے کہا۔

چوہان دور کھڑا سب سن رہا تھا۔ "یہ پولیس میں آتے ہی ہیرو بن گیا اچھی قسمت پائی ہے سالے نے۔"

وردا کو چھوڑ کر راجو اور چوہان واپسی کے لیے چل دیے۔ چوہان نے چار سپاہی وردا کی حفاظت کے لیے وہاں چھوڑ دیے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

وردا اپنے گھر پر آ کر بہت خوش تھی اس نے الف سے ی تک پوری داستان اپنے ابو کو سنا دی تھی۔

"اس لڑکے مراد کو بھی کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے، ایسا تو کوئی پاگل ہی کر سکتا ہے۔" وردا کے ابو بولے۔

"چھوڑیے ابو جو ہو گیا سو ہو گیا، اب بس یہی دعا کیجیے کہ وہ درندہ جلد پکڑا جائے۔"

سب گھر والے کافی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے رات بھی بہت بیت چکی تھی۔

"چلو بیٹا اب تم سو جاؤ آنکھیں بھی لال ہو رہی ہیں تمہاری لگتا ہے ٹھیک سے سوئی بھی نہیں شاید۔" وردا کی امی بولیں۔

"ٹھیک ہے واقعی میں مجھے بہت گہری نیند آ رہی ہے مگر آپ لوگوں سے ملنے کی خوشی میں سونا نہیں چاہ رہی تھی۔"

سب اپنے کمروں میں سونے چلے گئے وردا نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا باہر ہر طرف سناٹا تھا تین سپاہی خوابِ خرگوش کے مزے لیتے ہوئے ڈیوٹی انجام دے رہے تھے جبکہ ایک سپاہی جاگتے ہوئے اپنے موبائل پر کوئی شریفانہ فلم دیکھ رہا تھا جس کا اندازہ اس کے چہرے کے تاثرات سے بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

"ایسی حفاظت سے تو حفاظت نہ ہونا ہی بہتر ہے کم از کم انسان اپنے بھروسے پر تو ہوتا ہے۔" وردا بڑبڑائی۔

وردا اپنے بستر پر آ کر ڈھیر ہو گئی۔ "میں اپنے گھر تو آ گئی ہوں۔ اب مجھے پہلے سے زیادہ ہوشیار رہنا ہو گا۔"

اپنے گھر پہنچ کر بھی وردا کے دل میں سو وسوسے جنم لے رہے تھے اس کے دل میں یہی گھبراہٹ مچی ہوئی تھی کہ کہیں وہ درندہ یہاں بھی نہ پہنچ جائے۔

☆☆☆☆☆☆☆

"یار بس اور نہیں بہت پی لی۔" مراد نے کہا۔

"پی نا یار، روز روز کہاں ملتی ہے پینے کو آج پی رہے ہیں تو کیوں نہ جی بھر کے پیئں۔" دوست بولا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر یار نشہ بہت چڑھ رہا ہے۔" مراد کو اپنی آواز میں لڑکھڑاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

"تو پھر دوسرے نشے کی جگہ خالی ہے کہ نہیں؟" دوست نے ذو معنی انداز میں پوچھا۔

"دوسرا نشہ...... کون سا دوسرا نشہ؟" مراد نے

حیرت سے کہا۔
''میرے پڑوسی کی بیوی بڑی مست ہے۔ کہو تو بلالوں اسے...... بول نا کیا کہتا ہے' ابھی آجائے گی وہ۔''
''بابو تم شادی بھی کرو گے یا یونہی پڑوس کے آسرے پر زندگی گزار دو گے۔'' مراد اس کے کندھے پر ہاتھ مارتا ہوا بولا۔
''ارے یار تمہیں شادی کر کے کیا مل گیا' بتا کہاں ہے تیری بیوی۔'' دوست نے سوال کر دیا۔
''یار تم اس کی بات مت کرو۔ وہ الگ ہی کہانی ہے۔''
''بتا دے ہمیں بھی' ہمیں بھی تو پتہ چلے۔''
''چھوڑ یار موڈ مت خراب کر۔'' مراد نے ٹالتے ہوئے کہا۔
''تو پھر کیا کہتے ہو' بلاؤں پڑوسن کو۔''
''ابے رات کے دو بج رہے ہیں' اس وقت وہ کیسے آئے گی۔'' مراد وقت کا احساس دلاتے ہوئے بولا۔
''آئے گی کیسے نہیں۔ اس کی دکھتی رگ میرے ہاتھ میں ہے۔''
''ابے اسے بلیک میل کر رہا ہے کیا؟ مجھے کسی کے ساتھ زبردستی اچھی نہیں لگتی۔''
''ارے نہیں یار' اس کا ایک لڑکے کے ساتھ چکر چل رہا تھا' میں نے ایک دن چھت پر انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا' بس تبھی سے مجھے بھی حصہ مل رہا ہے' یہ اور بات ہے کہ میں اسے ڈراتا رہتا ہوں کہ تیرے شوہر کو بتا دوں گا' وہ ڈرتی رہتی ہے اور ہم ہمسائے کے حقوق حاصل کرتے رہتے ہیں۔'' دوست بے ڈھنگی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔
''جو بھی ہو' ہے تو یہ ایک طرح کی بلیک میلنگ ہی نا۔''
''تو وہ کون سی نیک پروین ہے' ایسا موقع کوئی گنواتا ہے کیا۔''
''ویسے سچ کہوں تو ابھی میرا دل نہیں کر رہا' ایک لڑکی پہ یہ دل آ گیا ہے تیرے یار کا۔'' مراد کے دماغ میں سحرش کا سراپا گھوم رہا تھا۔
''بھائی مجھے تو شراب کے ساتھ شباب بھی چاہیے' ابھی فون کرتا ہوں۔''
مراد نشے میں دھت ہو رہا تھا۔
بابو نے پڑوسن کو فون لگایا۔ ''اٹھا نہیں رہی ہے' کہاں مر گئی۔''
بابو نے پھر فون ملایا۔ ''نسرین' کیا بات ہے۔ فون کیوں نہیں اٹھا رہی۔''
''کیا ہے' اتنی رات کو کیوں فون کیا ہے؟'' نسرین کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔
''تمہیں تو پتہ ہے کہ میں کب اور کیوں فون کرتا ہوں تمہیں۔'' بابو نے ہنستے ہوئے کہا۔
''میں اس وقت نہیں آ سکتی...... مجھے رات کو گھر سے باہر نکلنے میں ڈر لگتا ہے۔''
''میں تم سے درخواست نہیں کر رہا ہوں...... حکم دے رہا ہوں...... جلدی آ جاؤ یہاں ورنہ کل تمہارے شوہر کو تمہارے سارے کارنامے بتا دوں گا۔ سمجھی کہ نہیں۔''
''ٹھیک ہے آ رہی ہوں۔'' نسرین کے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔
جیسے تیسے نسرین اپنے گھر کی چھت پر آ گئی۔
نسرین بابو کے گھر کی سیڑھیوں سے نیچے آ گئی' اس نے پیچھے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔
''لو آ گئی میری آئٹم' دیکھتے رہ جاؤ گے اور پھر فیصلہ کرنا کہ دل کر رہا ہے یا نہیں۔'' بابو اپنے گٹکے ز

دانتوں کی نمائش کرتا ہوا بولا۔
بابو دروازہ کھولنے چل دیا' نشے کی زیادتی سے اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے بابو نے دروازہ کھولا تو سامنے نسرین اسکائی بلو ساڑھی میں کھڑی قیامت ڈھا رہی تھی۔
''واہ کیا خوب ساڑھی پہن کر آئی ہو' آؤ میرا دوست تمہیں دیکھتے ہی مر مٹے گا۔'' بابو اسے اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
''کیا...... تمہارا دوست بھی ساتھ میں ہے؟'' نسرین چونک گئی۔
''ہاں' آ جاؤ ملواتا ہوں' بہت اسمارٹ ہے تمہیں پسند آئے گا۔'' بابو نے نسرین کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔
بابو تقریباً گھسیٹتے ہوئے نسرین کو کمرے کے اندر لے آیا جہاں مراد بیٹھا تھا۔
''یہ دیکھ۔'' بابو' مراد کو مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہے میری مست آئٹم...... بیوی سے بھی زیادہ کام کی ہے...... جب چاہے بلا لیتا ہوں اسے۔ ہی ہی ہی۔''
نسرین نے کسی طرح اپنا ہاتھ بابو کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ نسرین کو دیکھتے ہی مراد لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھ کھڑا ہوا۔
بابو نے نسرین کو اپنی بانہوں میں لینے کی کوشش کی تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔
''پلیز' ان کے سامنے یہ سب مت کرو۔'' وہ التجائیہ لہجے میں بولی۔
''اوئے بابو...... آرام سے یار' میرے سامنے زبردستی مت کرو مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' مراد بولا۔
''اور یار۔ تم نہیں جانتے کہ یہ اسی طرح قابو میں آتی ہے۔''
''میں جا رہا ہوں یار مجھ سے یہ سب نہیں دیکھا جائے گا۔''
''ارے یار تم کہاں جا رہے ہو...... رکو نا۔''
مراد' بابو کی بات ان سنی کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ دوسرے کمرے میں آ کر وہ بستر پر گر گیا۔ نشے کی وجہ سے اس کا سر گھوم رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے چپ چاپ لیٹ گیا۔
''تمہیں آج کیا ہو گیا ہے۔ کیوں اتنے نخرے دکھا رہی ہو۔'' بابو نے نسرین کو جکڑتے ہوئے کہا۔
''ایک تو اتنی رات کو بلاتے ہو مجھے۔ اوپر سے اپنے دوست کے سامنے یہ سب حرکتیں کرتے ہو۔ کسے اچھا لگے گا۔'' نسرین بے بسی سے بولی۔
''بہت بول رہی ہو آج۔ ٹھہرو ابھی اس کا مزا چکھاتا ہوں۔'' بابو نے کہا اور ایک اسکیل اٹھا لیا اور زور سے نسرین کی پیٹھ پر دے مارا۔ اور نسرین کے بال پکڑ کر جھٹکا دیا۔
''آہ! میرے بال چھوڑو۔'' یہ کہتے ہوئے نسرین نے بابو کو زور کا دھکا دیا۔
بابو لڑکھڑا کر سر کے بل پیچھے کی طرف گرا۔ اس کا سر صوفے کی ہتھی سے ٹکرایا اور اس کے سر سے خون ابل آیا۔
نسرین نے مڑ کر دیکھا۔ بابو زمین پر بے ہوش پڑا تھا اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔
''اوہ میرے خدا' کہیں یہ مر تو نہیں گیا۔''
نسرین نے بابو کو ہلایا جلایا مگر اس کے بدن میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔
''یا خدا' یہ میں کس نئی مصیبت میں پھنس گئی۔ اب میرا کیا ہوگا؟'' نسرین سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔
بابو کے گرنے کی آواز دوسرے کمرے میں لیٹے مراد نے بھی سن لی تھی۔

"پتا نہیں اب کیا کردیا بے وقوف بابو نے۔" مراد سمجھا کہ شاید بابو نسرین پر تشدد کررہا ہے۔

مراد اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا واپس اندر آیا اندر کا منظر دیکھ کر مراد کے ہوش اڑ گئے بابو زمین پر بے سدھ پڑا تھا اور نسرین اس کے برابر میں سر پکڑے بیٹھی تھی۔

"یہ...... یہ کیا ہوا؟" مراد نے پوچھا۔

نسرین نے سر اٹھا کر مراد کی طرف دیکھا مگر وہ کچھ بھی بولنے کی حالت میں نہیں تھی۔

مراد کا تو جیسے نشہ ہرن ہوگیا وہ فوراً بابو کے پاس آیا اور اس کی سانس چیک کی۔

"اوہ! یہ تو مرچکا ہے کیا کیا تم نے اس کے ساتھ۔" مراد نسرین کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

"یہ...... یہ میرے ساتھ زبردستی کررہا تھا' میں نے اسے دھکا دیا تھا بس' اس کا سر صوفے کی ہتھی سے ٹکرا گیا شاید اور۔" نسرین پھر رونے لگی۔

"اچھا...... اچھا ٹھیک ہے چپ ہوجاؤ اب۔" مراد نے اسے خاموش کراتے ہوئے کہا۔

"تم کیا کرسکتے ہو اس معاملے میں؟" نسرین مسلسل روئے جارہی تھی۔

"تھوڑا سوچنے تو دو۔" مراد جھلا کر بولا۔

"ایک آئیڈیا ہے ہم یہ کام کرسکتے ہیں۔" مراد پرخیال انداز میں بولا۔ "آج کل پورے شہر میں اس نفسیاتی قاتل کا خوف چھایا ہوا ہے' کیوں نہ ہم اس قتل کا الزام اسی پر ڈال دیں۔" مراد نے اپنا خیال پیش کیا۔

"کیا ایسا ہوسکتا ہے؟" نسرین پرامید لہجے میں بولی۔

"بالکل ہوسکتا ہے۔" مراد نے کہا۔

"لیکن تم ایسا کیوں کررہے ہو تمہارے تو دوست کو مارا ہے میں نے۔"

"دیکھو تم نے اسے نہیں مارا' یہ تو حادثہ ہے' بابو تو مر ہی چکا ہے۔ تمہاری زندگی کیوں برباد ہو۔" مراد نے وجہ بیان کی۔

"مگر یہ سب کیسے ہوگا؟"

"تمہارے پاس کوئی گاڑی ہے؟" مراد نے پوچھا۔

"ہاں میرے شوہر کی کار ہے۔"

"جاؤ جاکر چابی لے آؤ۔۔۔ ہمیں یہ کام جلد سے جلد کرنا ہوگا۔" مراد نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں ابھی چابی لے کر آتی ہوں۔" یہ کہہ کر نسرین وہاں سے باہر آگئی۔

مراد نے بابو کی لاش کو چادر میں لپیٹ لیا۔

"معاف کرنا دوست مگر یہ سب کرنا بھی ضروری ہے کسی کی زندگی کا سوال ہے۔" مراد نے آہستہ سے بابو کی لاش سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں نسرین کار کی چابی لے آئی۔

مراد' نسرین سے چابی لے کر فوراً باہر نکل گیا۔ اور کار گھر کے دروازے کے سامنے لے آیا۔

اندر آکر مراد نے بابو کی لاش کو اٹھایا اور اسے کار کی ڈگی میں ڈال دیا۔

"تم یہیں رکو میں لاش کو ٹھکانے لگا کر ابھی آتا ہوں۔" مراد یہ کہتا ہوا کار آگے بڑھا لے گیا۔

نسرین دروازہ بند کرکے وہیں صوفے پر بیٹھ گئی اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

مراد ایک سنسان جگہ پر جھاڑیوں کے بیچ لاش ڈال کر واپس آگیا اور اس نے فرش سے خون کے دھبے صاف کردیئے۔

"میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی' پلیز میرے بارے میں کسی کو مت بتانا۔" نسرین نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

"مجھ پر بھروسہ رکھو' اب تم اپنے گھر جاؤ پھر کبھی ملتے ہیں۔" مراد اسے تسلی دیتا ہوا بولا۔

"میری مدد کرنے پر میں واقعی دل کی گہرائیوں سے آپ کی مشکور ہوں۔" نسرین کی آنکھوں میں تشکرانہ آنسو تھے۔

"گڈنائٹ۔" مراد نے مختصر سا جواب دیا۔

نسرین چھت کے راستے سے ہی اپنے گھر واپس چلی گئی اور مراد' بابو کے گھر کو تالا لگا کر وہاں سے چل دیا۔

"اوہ...... اتنی رات کو تو کچھ نہیں ملے گا اور بابو کی بائیک لانا بھی مناسب نہیں تھا۔" مراد بڑبڑاتا ہوا پیدل ہی اپنے گھر کی طرف چلنے لگا۔

رات کا سناٹا بہت بھیانک لگ رہا تھا رہ رہ کر کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مراد کو بار بار ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کا پیچھا کررہا ہے۔ اس نے کئی بار پیچھے مڑ کر دیکھا مگر اسے کوئی دکھائی نہیں دیا۔

"اچھا خاصہ سحرش کو گھر چھوڑ کر واپس جارہا تھا نہ جانے یہ بابو کہاں سے ٹپک پڑا مگر بہت برا ہوا بیچارے کے ساتھ۔"

مراد اپنی ہی دھن میں چلا جارہا تھا۔ اچانک اس کی نظر سڑک کنارے پیڑ کا سہارا لے کر کھڑے ایک سائے پر پڑی اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔

"اتنی رات کو پیڑ کا سہارا لے کر یہ کون کھڑا ہے؟" مراد نے سوچا پھر مراد نے غور سے اس سائے پر نظر ڈالی جو سگریٹ پی رہا تھا۔

"یہ کوئی پاگل تو نہیں جو ان حالات اور اس موسم میں یہاں کھڑا سگریٹ پی رہا ہے۔" مراد نے پھر سوچا۔

اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ مراد کو اس سائے کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر جب مراد چلتے چلتے تھوڑا اور نزدیک پہنچا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس سائے کے قدموں میں کوئی آدمی پڑا تھا اور اور سائے کا ایک پاؤں اس آدمی کے سینے پر تھا۔ جبکہ سائے نے نقاب پہن رکھا تھا۔

مراد کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ سایہ کون ہے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تا کہ وہ اب کیا کرے۔

"کہاں جارہے ہو اتنی رات کو؟" اس سائے کی آواز کسی درندے کی غراہٹ سے مشابہ تھی۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ ایک بار شکل تو دکھاؤ۔" مراد خود کو سنبھالتا ہوا بولا۔

"ہا...... ہا...... تجھے مارنے سے پہلے تیری زبان کاٹوں گا۔"

"یار وہ بھی کاٹ لینا پہلے اپنا دیدار تو کرادو بعد میں مجھے آرام سے مارتے رہنا۔"

"تمہارے پیچھے کوئی ہے ذرا مڑ کے تو دیکھو۔" سایہ چلایا۔

مراد نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا وہ قاتل کی چال میں آگیا تھا خنجر مراد کے پیٹ میں اتر چکا تھا۔

"آہ...... بہت مکار ہو تم۔" مراد درد سے کراہ اٹھا۔ مگر اس نے ہمت کرکے قاتل کو زور سے ایک طرف دھکا دیا اور جھٹکے سے اپنے پیٹ میں پیوست خنجر باہر نکال لیا۔

"آہ......" مراد خنجر نکالتے ہوئے بری طرح کراہ اٹھا تھا۔

اب مراد کے ہاتھ میں خنجر تھا اور وہ قاتل اس کے سامنے گرا ہوا تھا مراد اس کی طرف بڑھا لیکن نزدیک پہنچتے ہی قاتل نے مٹی مراد کی آنکھوں میں اچھال دی۔ مٹی پڑتے ہی مراد کی آنکھیں بند ہوگئیں مگر خنجر ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا قاتل دبے پاؤں مراد

کے پیچھے آ گیا اور اس کے سر پر پستول کی نال رکھتے ہوئے بولا۔

"جو خنجر سے بچ جاتا ہے اسے میں گولی سے مار دیتا ہوں۔"

مراد نے پھرتی کے ساتھ گھوم کر خنجر کا وار کیا۔ قاتل کے پیٹ پر خنجر نے گہرا گھاؤ ڈال دیا تھا اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا مراد کو وہ نقاب پوش سایہ گرتا ہوا دکھائی دیا اور اگلے ہی پل ایک گولی زناٹے کے ساتھ مراد کے کندھے میں اتر گئی۔

"آہ......" مراد پھر سے چیخ اٹھا۔

مراد نے پاؤں سے مٹی سائے پر اچھالی اور بھاگ کر سڑک کنارے درختوں کے پیچھے چھپ گیا۔ اتنے میں فضا پولیس سائرن کی آوازوں سے گونجنے لگی پولیس سائرن کی آوازیں سنتے ہی وہ درندہ اٹھ کر ایک طرف بھاگ نکلا اور رات کے اندھیرے نے اسے اپنے اندر نگل لیا۔

مراد نے جیسے تیسے اپنی شرٹ اتار کر اپنے پیٹ پر باندھ لی تا کہ خون کا رساؤ کم ہو جائے۔ اس کے کندھے سے بھی خون بہہ رہا تھا۔

"یہاں تو آس پاس کوئی اسپتال یا کلینک بھی نہیں ہے میرا موبائل......اوہ کہاں گیا......شاید کہیں گر گیا' اف......آج کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ' لیکن شکر ہے خدا کا کہ میں اس درندے کا شکار ہونے سے بچ گیا۔"

مراد لڑکھڑاتا ہوا درد سے کراہتا ہوا اپنی کالونی کے پاس پہنچ گیا۔ اسے سامنے ہی بھولو حوالدار کا گھر دکھائی دیا۔

"بھولو کو ہی اٹھاتا ہوں۔ راجو تک پہنچتے پہنچتے کہیں میری جان نہ چلی جائے۔" مراد نے سوچا۔

مراد زور زور سے بھولو کے گھر کا دروازہ بجانے لگا۔ نغمہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی مگر دروازے پر ہونے والی دستک سن کر وہ جاگ گئی اور اٹھ بیٹھی۔

"یہ بھولو کہاں گیا اور یہ دروازے پر کون ہے؟"

نغمہ دروازے پر آئی اور جھری سے باہر جھانک کر دیکھا باہر اسے مراد نظر آیا جو آہستہ آہستہ ہمت ہارتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو رہا تھا۔

جب تک نغمہ دروازہ کھولتی مراد بے ہوش ہو چکا تھا۔

"ارے اسے کیا ہو گیا' کیا کروں میں یہ بھولو بھی نہ جانے کہاں جا کے مر گیا۔"

نغمہ دوبارہ اندر آئی اور واش روم میں دیکھا لیکن بھولو وہاں بھی نہیں تھا۔

"کہاں گیا کنڈی تو اندر سے بند تھی اوہ شاید پیچھے کے دروازے سے گیا ہے۔"

نغمہ کی نظر میز پر رکھے موبائل پر پڑی۔ اس نے فوراً راجو کا نمبر ملایا۔ اس وقت راجو پولیس اسٹیشن میں چوہان کے ساتھ تھا۔

نغمہ کی بات سنتے ہی وہ جیپ لے کر وہاں سے نکل پڑا اور نکلتے نکلتے ایمبولینس کے لیے بھی کال کر دی۔

نغمہ دروازے کے پاس بیٹھی تھی اور مراد باہر پڑا رہا۔ شاید اس کی کچھ سانسیں ابھی بھی چل رہی تھیں۔

راجو کے پہنچنے کے ساتھ ہی ایمبولینس بھی وہاں پہنچ گئی اور دوسرے ہی لمحے مراد کو اسپتال لے جایا جا رہا تھا۔

باقی آئندہ

جُدائی

شکیل صدیقی

شکیل صدیقی

عورت کا تعلق چاہے کسی مذہب' فرقے یا ذات سے ہو' خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں رہتی ہو لیکن جب وہ ماں بن جاتی ہے تو اس کی اپنی اولاد کے لیے محبت یکساں ہوتی ہے اور اگر یہی اولاد نوجوانی میں ہی اس سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائے تو وہ غم کا مجسمہ بن جاتی ہے۔ جدائی کی آگ میں دھیمے دھیمے سلگتی ہوئی ایک عورت کی المناک داستان' وہ قارئین اس کہانی کا درد زیادہ محسوس کریں گے' جن کے دل حساس ہیں۔

غمزدہ لوگوں کی تسکین کے لیے ایک جانگداز تحریر

"حقیقت کا کھلے دل سے اعتراف کرو......ملی۔"

اس نے اپنی بیوی کے کانپتے لرزتے ہوئے ہاتھ تھام کر کہا۔ "ہمارا بچہ مر گیا ہے اور دوسری دنیا سے اسے کوئی واپس نہیں لا سکتا۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اس حادثے کو چھ ماہ گزر چکے ہیں اور تم ابھی تک اس کا سوگ منا رہی ہو۔"

"گزشتہ شب میں نے پھر اسے اپنے خواب میں دیکھا۔" وہ اداس لہجے میں بولی۔ "مجھے ایسا لگا جیسے وہ زندہ ہے میرا دل چاہا کہ میرا خواب کبھی ختم نہ ہو اور بند آنکھوں میں صدیوں تک سمایا رہے میں کبھی بے دار ہونا نہیں چاہتی۔ اگر مجھے اس بات کا یقین ہو جاتا کہ ایک نہ ایک میرا بیٹا مجھ سے آن ملے گا۔ اگر مجھے یہ یقین ہو جاتا کہ وہ مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہیں بچھڑا ہے۔" اس نے اسے زور سے دھکا دیا اور سسکیاں بھرتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

وہ بچہ نہیں تھا۔ بلکہ اگر وہ زندہ ہوتا تو اٹھارہ برس کا ہوتا وہ حادثہ اچانک ہی رونما ہوا تھا۔ وہ کار ڈرائیو کر رہا تھا کہ اچانک اس میں آگ لگ گئی اور اس کے پرخچے اڑ گئے۔ ملی ایک سمجھ دار اور شریف عورت تھی۔ وہ اس مکار خود غرض دنیا کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔ لیکن وہ بہت زیادہ جذباتی تھی۔ ملی کے برعکس اس کا شوہر ایک دنیا دار شخص تھا۔ کبھی نوکری کرتا اور کبھی چھوڑ دیتا۔ بارہا غلط قسم کے پیشوں سے بھی منسلک رہا تھا اور کبھی کبھی تو وہ قانون شکنی پر بھی اتر آتا تھا۔

ملی کی ساری دنیا اس کے بیٹے تک محدود تھی۔ اس نے اپنی پوری توجہ اپنے پیارے بیٹے کی طرف مبذول کر رکھی تھی۔ لوگوں کو اس کے بیٹے کی قسمت پر رشک آتا۔ اس نے اس کی تربیت بہت نزاکت سے کی تھی لہٰذا بچہ بھی بڑا نرم و نازک تھا۔ بلکہ لطافت کے سانچے میں ڈھل گیا تھا۔

ایک روز سریش نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی بیوی کو اس جہنم سے نکال کر رہے گا۔

ملی اور سریش کمار لندن میں ہی رہتے

تھے۔ ان کے والدین کی شہریت اسی ملک کی تھی۔

❀......☆☆......❀

اجے اس کا دوست ایک عرصے بعد اپنے خوب صورت فلیٹ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سریش نے اس سے کہا کہ اسے اس کی مدد درکار ہے۔ وہ جو کام کرے گا اس کا اسے معقول ترین معاوضہ دیا جائے گا۔ اجے نے اس کے بیٹے کی ناگہانی موت پر افسوس کا اظہار کیا اور پوچھا کہ وہ اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہے۔ اس نے اجے سے کہا کہ وہ ایک ذہین شخص ہے اور وہ یقیناً اسے اس مصیبت سے نجات دلا سکتا ہے۔

اجے نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی بیوی کو روزانہ رات کو خواب آور گولیاں کھلا دیا کرے، اگر اسے اس بات کا یقین ہوجائے کہ ان گولیوں کے استعمال سے اس کا بیٹا اس کی نظروں کے سامنے آجائے گا تو نفسیاتی طور پر اس کے ذہن پر بہترین اثرات مرتب ہوں گے اور وہ خوشی خوشی ان گولیوں کا استعمال کرنے لگی گی۔

سریش نے غصے سے اجے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ وہ ملی کو نہیں سمجھتا اور نہ اس کی اور ملی کی زندگی کے متعلق اسے بہت سی تفصیلات کا علم ہے۔ وہ ایک بااصول عورت ہے اور اس احمقانہ بات کو کبھی تسلیم نہیں کرے گی۔ اس نے مزید کہا کہ وہ اس کے لیے کسی شعبدے باز کا بندوبست کرے جو اسے کسی طرح قائل کرسکے کہ اس کا بیٹا زندہ ہے لیکن یہ یاد رہے کہ اسے بے وقوف بنانے کی کوشش ہرگز کامیاب نہ ہوگی کیونکہ وہ بہت ذہین عورت ہے میرے دوست اگر وہ کسی طرح سے یہ یقین دلا سکے کہ اس کا بیٹا بقید حیات ہے اور کہیں آرام سے زندگی بسر کررہا ہے تو اس کی زندگی میں ایک خوب صورت انقلاب برپا ہوجائے گا۔

اجے نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کہا۔ ''یہ حقیقت ہے کہ......!'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر آہستہ سے بولا۔ ''تمہاری بیوی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کی عمر زیادہ ہوگئی ہے اور تنہائی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اگر وہ اس کے کچھ اور قریب ہوجاتا اور اس کی نفسیات سمجھتے ہوئے اور اسے زیادہ پیار ومحبت دے سکتا تو شاید یہ تنہائی دور ہوجاتی۔''

سریش کو غصہ آگیا۔ اس نے اجے سے کہا۔ ''کیا میری بیوی کے لیے بہتر ہے اور کیا بہتر نہیں ہے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔''

اجے نے سر کر اثبات میں ہلایا اور اس سے کہا کہ وہ اسے زبیدہ خاتون کے پاس لے جائے گا۔ وہ اپنے وقت کا ایک ماہر آدمی ہے۔

❀......☆☆......❀

پندرہ دنوں کے بعد وہ ملی کو زبیدہ خاتون کے دفتر لے گیا۔ ایک مدقوق شکل کی عورت نے ان کا استقبال کیا اور انہیں ایک چھوٹی سی گول میز کے گرد بٹھا دیا اور اس کے بعد کمرے کے پیچھے کسی تاریک گوشے میں گم ہوگئی۔

اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور اس کے اندر جو کشمکش

جاری تھی وہ اسے اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

دفعتاً لمبا چوڑا زبیدہ خاتون کمرے کے ایک گوشے سے نمودار ہوا۔ بیٹھتے ہی اس نے ان کے ماضی کے متعلق بتانا شروع کردیا۔ ملی حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ سمجھ گیا کہ یہ معلومات اسے نہایت ہی ذہانت سے اجے نے فراہم کردی ہوں گی۔ دفعتاً زبیدہ خاتون نے ایک بار پھر ملی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا کہ اس کا بیٹا یقیناً میوزک کا بہت شوقین ہوگا۔

ملی بت بنی اسے دیکھتی رہی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے ہسپناٹائز کردیا گیا ہو۔ دفعتاً ملی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اس کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

زبیدہ کہہ رہی تھی ''پیارے بچے! اپنی امی کی خوشیوں کے لیے لوٹ آؤ۔ تمہاری امی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتیں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور اپنی گھومنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ اداس ہوگیا اور اس نے دونوں بازوؤں سے میز کا کونا پکڑ لیا۔

تبھی ایک مانوس سی آواز ملی کے کانوں سے ٹکرانے لگی۔

''امی مجھے آپ سے جدائی کا بہت دکھ ہے۔'' ملی زور سے چیخی اور ہذیانی انداز میں آواز کی سمت بھاگی، لیکن سریش نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر واپس کرسی پر بٹھا دیا۔

''آپ کو تعجب تو ہوا امی! لیکن میں بالکل بخیریت ہوں۔'' بچے کی آواز میں ایسا مدوجزر تھا جیسے وہ قریب ہی کسی ریڈیو اسٹیشن سے نشر

aanchal.com.pk
تازہ شمارہ شائع ہوگیا ہے
آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
آنچل
کراچی
ملک کی مشہور معروف قلم کاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے مزین ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں جو آپ کی آسودگی کا باعث ہوسکتا ہے اور وہ صرف اور صرف آنچل آج ہی ہاکر سے کہہ کر اپنی کاپی بک کرالیں۔
معروف مصنفہ اقرا صغیر احمد کا خوبصورت انداز بیان ناقابل فراموش ناول
پرچہ نہ ملنے کی صورت میں دفتر سے رابطہ کریں۔ فون 35620771/2

کی جا رہی ہو۔'' میں بھی تنہائی کی آگ میں جل رہا ہوں' امی مگر میں اس پرمسرت دن کے لیے یہ سب کچھ برداشت کرلوں گی۔ امی جب ہم ملیں گے' ہم جلد ملیں گے۔ آپ بالکل بے فکر رہیں خدا حافظ' امی اور ڈیڈی۔''

ملی ٹھنڈی سانس بھرتی ہوئی ایک دم کھڑی ہوگئی اور اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے بولی۔ ''میرے بیٹے...... میرے بیٹے۔'' اس کی آواز فرط جذبات سے کانپ رہی تھی۔

زبیدہ نے اپنی آنکھیں کھولیں اور آہستہ سے بولی۔ ''جو کچھ بھی ہوا ہے سب میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔''

ملی نے ندیم کا شکریہ ادا کیا اور دونوں اٹھ گئے۔ واپسی بڑی پرسکون تھی۔ ملی کا چہرہ چمک رہا تھا۔ اس پر فرشتوں جیسی معصومیت کا گمان ہو رہا تھا۔

وہ ایک ہفتے تک بہت پرسکون رہی اور سریش اس بات پر مطمئن تھا کہ جو کچھ وہ چاہتا تھا وہ اس نے کر دکھایا لیکن اسے بھی اب تھوڑا سا سکون چاہیے تھا۔

ہفتے کی شام کو اس نے اپنی بیوی سے جھوٹ بولا کہ وہ اپنے کسی دوست کے پاس ایک سروس کے بات چیت کرنے جا رہا ہے' اچھی خاصی رقم ہاتھ آجائے گی۔ کمیشن الگ ملے گا۔ اسے اس کام میں دیر ہوجائے گی۔ لہٰذا وہ رات کو اس کا انتظار نہ کرے۔

شام کو پبلک ہاؤس میں اس نے اپنی پرانی گرل فرینڈ سے ملاقات کی اور رات تک اس کے ساتھ رہا لیکن جب گھر واپس آیا تو اس کے ضمیر نے ملامت کی اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ اس کے دوست اجے نے درست ہی کہا تھا۔ ملی کا مسئلہ تنہائی ہے۔ اسے اس کی محبت اور قربت کی شدید ضرورت تھی۔ اس نے سوچا کہ آئندہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ کسی قسم کی بے وفائی نہیں کرے گا اور نہ اس کا دل توڑے گا۔ جیسے ہی اس نے بیڈ روم میں قدم رکھا وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔

ملی' بیڈ لیمپ روشن چھوڑ کر گہری نیند سو رہی تھی۔ شاید بتی بجھانا بھول گئی ہو۔ اس نے سوچا اور لباس تبدیل کیے بغیر ہی بستر کی طرف بڑھا۔ اس خیال سے کہ کہیں اس کے چلنے پھرنے کی آواز سے وہ جاگ نہ پڑے۔ اور اتنی رات گئے گھر واپس آنے پر کہیں ناراض نہ ہوجائے۔ اس نے اس کے بازوؤں پر سے ہاتھ بڑھا کر لیمپ بجھانا چاہا تو چونک پڑا۔ لیمپ کے نیچے ایک تحریر موجود تھی۔

''میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے میں اپنے بیٹے کا مزید انتظار نہیں کرسکتی اور میں اس کے پاس جا رہی ہوں۔'' تحریر پڑھتے ہی اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے خواب آور دوا کی خالی بوتل اٹھا کر باہر اچھال دی اور اپنی بیوی کی لاش پر گر کر سسکنے لگا جو برف کی سل کی طرح ٹھنڈی ہوکر اکڑ گئی تھی۔

⌘

احمق

حسن اختر پریم

کہتے ہیں جب تک دنیا میں بے وقوف زندہ ہیں عقل مند کبھی بھوکے نہیں مرسکتے۔

ایک ایسے ہی عقل مند کا قضیہ' وہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر ہی کھاتا کماتا تھا مگر ایک احمق اس کی ذہانت کے لئے چیلنج بن کر آگیا۔

فارغ لمحوں کے لیے اکسیر ایک پرتفکر کہانی

اسے تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ کتنے عرصے سے نوکری کر رہا ہے اور نہ ہی یہ یاد تھا کہ سر ایڈگر کا خادم خاص بنے ہوئے اسے کتنی مدت ہوئی ہے۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ اس کا نام پیکر ہے اور اس کا کام جسٹس ایڈگر کی خدمت کرنا ہے۔

پیکر کی زندگی ابھی تک کامیاب نہ تھی یہ ضرور تھا کہ بچپن سے اب تک گھر کا کام کاج کرنے والے لڑکے' پھر چوکیدار اس کے بعد اردلی پھر شوفر اور اب خادم خاص کی حیثیت سے اس نے جو کچھ کمایا تھا وہ جمع ہوتا رہا تھا لیکن ابھی تک اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ رقم پس انداز کرنے کا مقصد کیا ہوتا ہے۔

لوگوں کی عام رائے یہ تھی کہ پیکر پیدائشی طور پر ناکارہ آدمی ہے۔ جسمانی طور پر وہ مختصر دبلا پتلا' سکڑا ہوا' منحنی' نحیف' زرد رو' گنجا' کبڑا اور ذہنی طور پر غبی' احمق' لالچی' حاسد اور عملی طور پر نکما اور نکھٹو تھا۔ اس کی ازدواجی زندگی تھی ہی نہیں اور اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ازدواجی زندگی کی اصطلاح کیوں استعمال کی جاتی ہے۔

ان تمام خامیوں کے باوجود سر ایڈگر نے اسے ملازم رکھ لیا تھا۔ شاید وہ کوئی ایسا نوکر ہی چاہتے تھے جس میں یہ تمام خامیاں موجود ہوں لہٰذا پیکر کی خوش قسمتی تھی کہ ایڈگر کے وسیع و عریض محل میں اس کی یہ خامیاں خوبیاں بن گئی تھیں۔

ابتدائی دنوں میں تو پیکر کو یہ شک محسوس ہوتا رہا کہ سر ایڈگر بھی لات مار کر اسے نوکری سے نکال دیں گے لیکن پھر جب مہینے سالوں میں بدلنے لگے تو اسے یقین ہوگیا کہ اب اپنی یا سر ایڈگر کی آخری سانس تک وہ یہیں کام کرتا رہے گا۔

جسٹس سر ایڈگر خاندانی اعتبار سے رئیس اور رنڈوے تھے۔ ان کے جسم پر گوشت کی تہیں تھیں اور انہیں شہر کے سماجی حلقوں میں اہم ترین مقام حاصل تھا۔

وہ نایاب پودوں اور نایاب جانوروں سے عشق کرتے تھے۔ کھانے میں انہیں مچھلیاں پسند تھیں اور وہ مچھلیوں کو پالنے کے بھی شوقین تھے۔

مزاج کے اعتبار سے وہ بہت غصیلے تھے بس غصہ ان کی ناک پر دھرا رہتا ہے اور جب بھی وہ کسی نایاب چیز کے اچھے دام لگانے کے باوجود اسے حاصل کرنے میں ناکام رہتے تھے تو سارا نزلہ پیکر پر گرتا تھا اور وہ بے چارہ اپنے گنجے سر کو کھجاتا ہوا کہیں چھپ جایا کرتا تھا۔

پیکر سر ایڈگر کی ڈانٹ کھا کھا کر اگر ڈھیٹ

نہیں تو بے غیرت ضرور ہو گیا تھا۔ اسے کوئی گالی بری نہیں لگتی تھی۔ سر ایڈگر ہمیشہ اسے احمق پیکر کہہ کر بلاتے تھے اور شاید اس نے اس خطاب کو اپنے نام کا قانونی حصہ تسلیم کر لیا تھا۔

اس کی زندگی میں روز ڈانٹ کھانا اسی طرح کا جز بن گیا تھا جیسے کپڑے بدلنا اور پانی پینا۔

ایک روز جب اس سے چائے کی پیالی گر گئی اور سر ایڈگر کی ایک آفس فائل بھیگ گئی تو انہوں نے اسے بے نقط سنا ڈالیں۔ انہوں نے اسے احمق، پاجی، الو اور گدھا کہا اور پھر جب بھی تسکین نہ ہوئی تو چڑی کا غلام بھی کہہ ڈالا۔ یہ نئی گالی تھی جو پیکر کو گھائل کر گئی۔ اس کے دل میں پہلی بار سر ایڈگر کے لیے نفرت کی چنگاری نے جنم لیا اور جب اگلے روز سر ایڈگر نے اسے دوبارہ یہی گالی دی تو اس چنگاری نے شعلے کی شکل اختیار کر لی۔

تب ہی پیکر نے فیصلہ کیا کہ سر ایڈگر کو مر جانا چاہیے۔

پیکر کے ساتھ سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ اسے اپنی خامیوں کا اچھی طرح علم تھا۔ اسے یہ بات معلوم تھی کہ وہ نا اہل ہے اور کسی کو خراش بھی نہیں لگا سکتا۔

پھر بھی اس نے اپنے طور پر ایک منصوبہ تیار کیا اور اگلے روز ہی اس پر عمل کر ڈالا۔

مگر منصوبہ ناکام ہو گیا۔

''احمق پیکر۔'' انہوں نے وہسکی کے گلاس کو دیکھتے ہی گرج کر آواز دی۔ وہ کانپتا ہوا ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ''گلاس کی ڈھنگ سے صفائی بھی نہیں کر سکتے۔'' انہوں نے انگلی سے گلاس پر جمے ہوئے پاؤڈر کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تم احمق نہ ہوتے تو میں یہی کہتا کہ تم نے مجھے قتل کرنے کی سازش کی ہے۔'' پھر انہوں نے گلاس پیکر کی گنجی چندیا پر خالی کر دیا۔

پیکر کی اگلی کوشش قدرے بہتر تھی۔ اس نے کہیں یہ پڑھ لیا تھا کہ سڑے ہوئے سرد گوشت میں زہریلے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں لہٰذا اس نے پہلے ایک گوشت کے پارچے کو اچھی طرح سڑنے دیا اور پھر اس کے کباب بنا کر سر ایڈگر کو سلاد کے ساتھ پیش کر دیے۔

''احمق پیکر۔'' سر ایڈگر نے میز پر زور سے گھونسا مار کر اسے لرزا دیا۔ ''کیا تم سونگھ بھی نہیں سکتے۔ یہ گوشت سڑا ہوا ہے۔ یہ اب تم ہی کھاؤ۔'' انہوں نے پیکر کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجوڑ ڈالا اور بے چارے پیکر کو سارا گوشت خود کھانا پڑا۔ پھر وہ تین روز تک اپنے کمرے سے بیت الخلا اور بیت الخلا سے اپنے کمرے تک محدود ہو گیا۔

اس تجربے سے اسے اپنی نا اہلی کا مکمل اندازہ ہو گیا وہ گوشت میں زہریلے جراثیم بھی پیدا نہ کر سکا تھا۔

اس واقعے کے بعد بھی اس نے دو کوششیں کر ڈالیں لیکن اسے ناکامی ہی ہوئی۔

ایک مرتبہ اس نے سوئمنگ پول کے قریب لکڑی کے زینے کا ایک تختہ نکال دیا لیکن پھر یہ بھول گیا کہ تختہ نکلا ہوا ہے اور تیزی سے اترنے کی کوشش میں خود ہی لڑھک کر زخمی ہو گیا۔

ایک روز اس نے دوسری منزل کی کھڑکی سے ایک بھاری گلدان پھینکا جو سر ایڈگر سے ایک گز دور گر کر چکنا چور ہو گیا۔

''پیکر احمق، کیا مجھے مار ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔'' سر ایڈگر گلا پھاڑ کر چلائے اور اسے یہ وضاحت کرنے میں بے حد دشواری ہوئی کہ وہ گلدان صاف کر رہا تھا کہ اچانک ہاتھ سے پھسل گیا۔

ایک اچھی بات یہ تھی کہ ابھی تک سر ایڈگر کو اس پر شبہ نہیں ہوا تھا لیکن پیکر کو معلوم تھا کہ یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکتا۔ وہ کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگا جس سے مقصد جلد از جلد حاصل ہو جائے۔

ایک روز اس کی نظر اخبار میں شائع ہونے والے اشتہار پر پڑی تو وہ مارے خوشی کے اچھل پڑا یہ بزنس ایفی شنی کنسلٹنٹ کا اشتہار تھا۔ پیکر کو اس روز پہلی بار یہ احساس ہوا کہ قدرت اس کا ساتھ دے رہی ہے۔

اگلے روز اسے نصف دن کی چھٹی ملی تو وہ ٹرین میں بیٹھ کر سیدھا شہر پہنچ گیا۔

''میں ایک ناول لکھ رہا ہوں جناب۔'' اس نے چیف کنسلٹنٹ سے کہا جو ایک نوجوان اور خاموش مزاج آدمی تھا۔ ''ناول کا اختتام ایک قتل پر ہوتا ہے اور میں آپ سے قتل کا ایسا طریقہ پوچھنے کے لیے آیا ہوں جو خطرناک نہ ہو؟''

''میں سمجھا نہیں۔'' چیف کنسلٹنٹ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''میرا مقصد یہ ہے کہ قتل کے بعد قاری کو بھی یہ احساس نہ ہو کہ یہ قتل کی واردات تھی۔''

نوجوان ماہر چند لمحوں تک اسے بڑی دلچسپی سے گھورتا رہا۔ وہ خود بھی جاسوسی ناول پڑھنے کا شوقین تھا۔ ''قتل کا پس منظر تو بیان کریں۔'' اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

پیکر نے سر ایڈگر کا نام لیے بغیر ان کی زندگی کا نقشہ کھینچ دیا۔ اس نے سر ایڈگر کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا اور ایک ایسے نوکر کا بھی تذکرہ کیا جو اپنے مالک کی خبیث عادتوں سے تنگ آ کر اب اسے قتل کرنا چاہتا ہے۔

''وہ اپنے ملازم کو ذرہ برابر بھی اہمیت نہیں دیتا اتنی بھی نہیں جتنی اپنی مچھلیوں کو دیتا ہے۔'' پیکر نے آخری جملہ ادا کرتے ہوئے بڑی نفرت سے کندھے سکیڑ لیے۔

''مچھلیاں......!'' نوجوان ماہر نے اچھل کر کہا۔ ''سنو، تم ناول میں مچھلیوں کے ذریعے ہی اسے قتل کرا دو۔ جنوبی امریکا میں ایسی خون آشام مچھلیاں موجود ہیں جو بظاہر بے ضرر نظر آتی ہیں انہیں فائرن کہتے ہیں جن کا جھنڈ صرف بیس منٹ میں پوری گائے ہڑپ کر سکتا ہے۔''

''فائرن'' پیکر بھی اچھل کر بولا۔ ''اوہ میرے ناول میں مالک کا کردار ایسا ہی ہے جو مچھلیوں سے بہت محبت کرتا ہے مگر......!''

''ایسا کرو کہ کسی طرح ناول میں ان مچھلیوں کا ذکر کر دو ایک پیرا گراف یہ بڑھا دو کہ مالک نے فائرن مچھلیوں کا آرڈر دیا ہے۔''

''مگر اس سے کیا فرق پڑے گا۔ میں نے ناول میں دو سوئمنگ پولز کا ذکر کیا ہے جن میں سے ایک مچھلیوں کے لیے مخصوص ہے اور مالک صرف اس پول میں نہاتا ہے جس میں مچھلیاں نہیں ہوتیں۔''

''درست لیکن فرض کرو کہ نوکر فائرن مچھلیاں جان بوجھ کر اسی سوئمنگ پول میں ڈال دے جس

میں مالک نہاتا ہے تب......!''

آہ......!'' پیکر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''یہ بھی براخیال نہیں ہے اس پر کام ہوسکتا ہے۔''

پیکر نے پہلی کامیابی بہت آسانی سے حاصل کرلی۔

اسے علم تھا کہ سرایڈگر مچھلیوں کواپنی نگرانی میں پول میں ڈلوائیں گے لہٰذا اس نے اس صورت حال سے بچنے کے لیے ازخود کمپنی کوفون کیا کہ مچھلیوں کی ڈیلیوری فوراً درکار ہے۔ اس وقت سر ایڈگر گھر میں موجود نہیں تھے۔

ان کی واپسی تک سوئمنگ پول میں خوں آشام مچھلیاں تیر رہی تھیں۔

''کیا آپ آج بھی سوئمنگ پول میں وقت گزاریں گے جناب۔''

پیکر نے بڑی عاجزی سے پوچھا۔

''ہاں' کیوں نہیں۔'' لیکن پہلے کافی پلادو پھر بتاؤں گا۔'' وہ ٹرے لے کر سوئمنگ پول پر پہنچا تو سرایڈگر صرف کاسٹیوم پہنے ہوئے تھے پیکر کے ایک کندھے پر بڑا سا تولیہ پڑا ہوا تھا۔

''لاؤ بھئی' کافی کو بہت دل چاہ رہا ہے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر آگے بڑھ کر کافی پاٹ کا ڈھکنا اٹھالیا۔ ''یہ کیا احمق یہ تو چائے ہے۔'' وہ غصے سے بل کھا کر بولے اور پھر انہوں نے کافی پاٹ دور پھینک کر پیکر کی گردن دبوچ لی۔ ''تو اس طرح اپنی حماقتوں سے باز نہیں آئے گا۔'' انہوں نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا اور سزا دینے کے لیے پول میں دھکا دے دیا۔

وہ زور زور سے چلانے لگا۔ سرایڈگر یہی سمجھتے رہے کہ وہ خنک پانی سے خوفزدہ ہے لہٰذا اس کی چیخوں کے جواب میں ان کے قہقہے ہی گونجتے رہے۔ پھر جونہی پیکر کی چیخیں تھم گئیں اور پانی سرخ ہوگیا تو وہ اچھل پڑے انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ پیکر کا بے جان جسم پول میں تیر رہا تھا اور مچھلیاں اس کا گوشت کھانے کے لیے ایک دوسرے پر پلی ہوئی تھیں۔

......☆......☆......

''سوال یہ ہے کہ مچھلیاں میری لاعلمی میں کس طرح آئیں اور انہیں ان کے پول کے بجائے میرے پول میں کیوں ڈالا گیا۔'' پولیس کو بیان دینے کے بعد سرایڈگر نے پوچھا۔

''اس کا جواب وہی کمپنی بہتر طور پر دے سکے گی جس نے مچھلیاں فراہم کی تھیں جناب۔'' انسپکٹر نے بڑے احترام سے کہا اور جب کمپنی نے جواب دیا تو سرایڈگر سر پکڑ کر رہ گئے۔ یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ پیکر نے ان کے قتل کی سازش کی تھی وہ اپنے ملازم کی موت پر بہت آزردہ تھے۔ اس رات وہ سو نہیں سکے صرف یہ سوچتے رہے کہ پیکر نے انہیں قتل کرنے کی سازش کیوں کی تھی۔ شاید اس نے میرا وصیت نامہ دیکھ لیا تھا۔ وہ سگریٹ سلگا کر بیٹھ گئے۔ جس میں' میں نے اپنی آدھی جائیداد اس کے نام پر کر دی ہے بے چارہ' جائیداد جلد از جلد حاصل کرنے کی ہوس میں مارا گیا بے چارہ......!

سرایڈگر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''احمق پیکر' تمہیں اتنی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے تھا۔''

❖

گردش

شهناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن' زر' زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کردی ہے۔

اس داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری' بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

تحیر اور ایکشن پسند قارئین کے لئے نئے افق کی تحیر خیز سلسلے وار کہانی آخری اوراق

تنویر مجھے میٹنگ ہال کے دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے پورے اعتماد سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔

میرے آنے سے پہلے ہی یہاں سارے لوگ آچکے تھے۔ شاید میرا ہی انتظار ہورہا تھا۔ اس کمرے میں ایک طویل و عریض ٹیبل تھی جس کے گرد کرسیاں رکھی تھیں۔ ہر کرسی کے سامنے ایک مائک اور اسپیکر رکھا ہوا تھا سامنے دیوار پر ایک بڑی اسکرین لگی ہوئی تھی۔

میں نے اندر پہنچ کر باآواز بلند کہا۔ ''السلام علیکم!'' سب نے ہم آواز میرے سلام کا جواب دیا۔ میں آگے بڑھا تب ہی سامنے بیٹھے شخص پر میری نگاہ پڑی تو میں جھجک کر رک گیا۔ میرے سامنے میرا وہ تفتیشی افسر بیٹھا تھا جس نے سب سے پہلے مجھ سے تفتیش کا آغاز کیا تھا۔ میں جھجک کر رکا تو کرنل احتشام نے کہا۔ ''آؤ' آؤ شمروز رک کیوں گئے۔''

''ناٹ شمروز آئی ایم ڈاکٹر شاہ زمان۔'' میں نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

''شیور' شیور۔'' انہوں نے خوش دلی سے کہا۔

''میرا اصل نام شاہ زمان ہے جو میرے والدین نے رکھا جو ایک اچھے انسان ایک ڈاکٹر کی پہچان تھا شمروز نام تو مجھے جرم اور برائی کی راہ میں ملا تھا لیکن شکر الحمدللہ آج میں اپنی اصل کی جانب لوٹ آیا ہوں۔ آپ سب سے گزارش ہے کہ مجھے شاہ زمان کہہ کر ہی مخاطب کیا جائے۔''

''آیئے ڈاکٹر شاہ زمان آیئے ہم آپ ہی کا انتظار کررہے تھے کچھ ضروری معلومات آپ سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔'' کرنل مشتاق نے کہا اور ایک کرسی کی جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں بیٹھ گیا تو کرنل مشتاق نے وہاں موجود دوسرے لوگوں سے میرا تعارف کروایا۔ سب سے پہلے انہوں نے اسی سخت گیر تفتیشی افسر کی جانب اشارہ کیا اور بولے۔

''یہ سفیان ہیں ان کے ساتھ بیٹھے ہیں بدر الحسن۔ ان کے سامنے جو حضرت بیٹھے ہیں یہ کرنل ظفر عالم ہیں ان کے ساتھ جو صاحب تشریف فرما

ہیں ان سے تو تم اچھی طرح واقف ہی ہو یہ حشام ہیں۔ ہماری ٹیم کا حصہ ہیں۔ کرنل احتشام میرے برابر میں ہیں۔"

"آپ سب سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ آج سے میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ شامل ہوں اور اللہ کو حاظر ناظر جان کر یہ عہد کرتا ہوں کہ اپنے ملک کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کروں گا۔"

"گڈ۔" کرنل احتشام نے کہا پھر بولے۔

"اچھا شاہ زمان تم یہ بتاؤ کہ تم اس شخص کو' کیا نام تھا اس کا......!" اس نے ایک لمحہ دماغ پر زور دیا اور بولے۔ "ہاں رئیس خان' کیا تم رئیس خان کو پہچان سکتے ہو یا پھر یہ کہ اس سے پہلے تمہاری اس سے کبھی کہیں اور ملاقات ہوئی ہے تم نے...... کسی اور روپ میں اس کو دیکھا ہے؟"

"جی نہیں سر' میری اس شخص سے وہ پہلی ملاقات تھی اور اس روز سے پہلے میں نے کبھی بھی اس شخص کو نہیں دیکھا تھا۔ البتہ نواب سطوت نے اس کا ذکر ضرور کیا تھا اور وہ بھی اس حوالے سے کہ وہ مجھے کسی سے ملوانا چاہتا ہے کیونکہ جس طرح انہوں نے مجھے سہیل ہاشمی کو قتل کرنے کے لیے کہا تھا میں نے بالکل اسی خاموشی اور رازداری سے وہ کام انجام دیا تھا اور اس سے پہلے کہ پولیس الرٹ ہو کر چاروں جانب گھیرا ڈالتی اور ناکہ بندی کرتی میں اس جگہ سے صاف بچ کر نکل آیا تھا۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ دراصل سہیل ہاشمی کا قتل اس شخص رئیس خان کی ایما پر نواب نے میرے ذریعے کروایا تھا۔ اب یا تو وہ شخص را کا ایجنٹ ہے یا پھر وہ ان کے لیے کام کر رہا ہے اس کے بارے میں مجھے صرف اتنا پتا چلا تھا کہ اس کا بزنس دبئی میں پھیلا ہوا ہے اور شاید پاکستان میں بھی ہے۔" میں نے کہا۔

وہ شخص تو فوری طور پر منظر سے غائب ہو گیا ہے لیکن ہم نے اس کے ساتھ آئی ہوئی ایک لڑکی کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ جسے اس نے ہوٹل میں ٹھہرایا ہوا تھا۔ اس لڑکی نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ وہ اس کا شوہر ہے۔ اس کی بیوی سے ہمیں بہت گراں قدر معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ ہم وہ ساری باتیں بھی تم سے شیئر کریں گے لیکن ہم تمہیں ایک اور مشتبہ شخص کو دکھانا چاہتے ہیں تم ہمیں بتاؤ کیا تم نے اس کو کبھی نواب کے ساتھ یا کبھی کسی اور حوالے سے دیکھا ہے یا اسے جانتے ہو۔"

کرنل احتشام تو مجھ سے بہت کچھ پوچھ رہے تھے مگر میرا ذہن صرف اس ایک بات پر اٹک کر رہ گیا تھا کہ انہوں نے اس رئیس خان کی بیوی کو گرفتار کر لیا ہے جو ایک ہوٹل میں مقیم تھی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

مجھے مہ وش کے ساتھ ہونے والی ملاقات میں اس کے شوہر کے مطابق ہونے والی گفتگو یاد آنے لگی اس نے یہی بتایا تھا کہ اس کا شوہر یہاں اپنے روحانی پیشوا سے ملنے کے لیے آیا ہے اور اس نے اسے ہوٹل میں ٹھہرا دیا ہے اور خود اس کے پاس ٹھہرا ہوا ہے اسی وقت مجھے یہ خیال آیا تھا کہ کہیں نواب کے پاس دوبئی سے آنے والا مہمان اس کا شوہر تو نہیں۔

لیکن پھر بعد میں مہ وش سے کوئی رابطہ بھی نہیں ہوا۔ اس نے اپنا نمبر دیا نہیں اور میرا لے لیا تھا لیکن میرا وہ سیل فون بھی ان لوگوں نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا اور مجھے دوسری سم لینی پڑی......

"کیا سوچ رہے ہو شاہ زمان......؟" کرنل احتشام نے بہت غور سے میرے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سر رئیس خان کی بیوی نے اپنا کیا نام بتایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مہ وش۔" وہ بدستور مجھے کھوجتی ہوئی نگاہوں دیکھتے ہوئے بولے۔

"کیا...... مہ وش...... سر...... سر...... وہ بے گناہ ہے...... مم...... میں اسے جانتا ہوں۔" میں نے بے ساختہ کھڑے ہو کر اپنی پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

"جانتے ہو' مگر کس طرح؟" کرنل احتشام نے نہایت پرجوش لہجے میں پوچھا۔

"میں اپنے کالج کے زمانے سے اسے جانتا ہوں' اس کی رہائش پنڈی میں تھی اور وہ راجا صاحب کی بیٹی ہے۔ راجا صاحب سردار شیر افضل کے قریبی دوستوں میں سے تھا ہماری دوستی رفتہ رفتہ محبت کا روپ دھار چکی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو اپنا جیون ساتھی بنانے کا وعدہ کیا لیکن مہ وش کے ڈیڈی اپنی اکلوتی بیٹی کا ہاتھ مجھ جیسے معمولی ڈاکٹر کے ہاتھ میں دینا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے سردار شیر افضل کے ساتھ مل کر میرا پورا گھرانہ ختم کر دیا اپنے گھر میں' صرف میں واحد فرد زندہ بچا ہوں۔ جیسا کہ میں سر سفیان کو اپنی داستان میں ساری بات بتا چکا ہوں۔ سردار شیر افضل اور راجہ جو میرے جانی دشمن تھے ان سے اپنی جان بچانے کے لیے ہی میں نے اپنی شناخت تبدیل کی تھی تا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ میں ٹرین کے حادثے میں مر چکا ہوں۔

بعد میں مہ وش کی شادی راجہ نے سردار شیر افضل کے بھتیجے سے کر دی اور خود ہارٹ اٹیک کے باعث چل بسا۔ بعد میں مہ وش کو معلوم ہوا کہ رئیس خان سردار شیر افضل کا بھتیجا نہیں ہے بلکہ دونوں میں سرے سے کوئی بھی رشتہ موجود ہی نہیں ہے سوائے لالچ اور حرص و ہوس کا راجہ کی بے تحاشا دولت اور جائیداد کی تنہا وارث مہ وش ہی تھی۔ سردار شیر افضل نے رئیس خان سے مہ وش کی شادی اس شرط پر کروائی تھی کہ وہ اس کی آدھی جائیداد اس کے نام کر دے گا۔"

"تمہیں یہ سب باتیں کس نے بتائیں؟" کرنل مشتاق نے چونک کر تیزی سے پوچھا۔

"ابھی کچھ عرصہ قبل اچانک ہی مجھے ایک ٹیکسی میں جاتی ہوئی مہ وش دکھائی دی تھی۔" پھر میں نے انہیں مہ وش سے ملاقات کی ساری تفصیل بتا دی۔

بہرحال ہم ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔

"اچھا تو اس رات تم مہ وش کے ساتھ ریسٹورنٹ میں تھے جس رات تمہیں خالد...... میرا مطلب ہے دلارے ملا تھا۔" کرنل احتشام نے کہا۔

"جی ہاں' لیکن اس رات کے بعد میرا مہ وش سے دوبارہ کوئی رابطہ نہیں ہوا کیونکہ اس نے اپنا کوئی بھی رابطہ نمبر مجھے نہیں دیا تھا بلکہ مجھ سے میرا نمبر لے لیا تھا۔"

"تمہیں یقین ہے کہ رئیس خان کی وہ ساتھی لڑکی تمہاری دوست مہ وش ہی ہے۔" کرنل مشتاق نے کہا۔

"نائنٹی پرسنٹ یقین ہے یہ تو میں اسے دیکھ کر ہنڈریڈ پرسنٹ کہہ سکتا ہوں۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو ہم اس کا بھی کوئی انتظام کرتے ہیں۔" کرنل مشتاق کہا۔

"شمروز ایک اور مشتبہ شخص ہماری نگاہ میں ہے لیکن

اس کے بارے میں ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے' میں تمہیں اس کے بارے میں بتاتا ہوں تم بتانا کہ تم کسی حوالے سے اس سے واقف ہو یا نہیں' کبھی نواب سطوت نے اس کا تم سے ذکر کیا یا کبھی وہ نواب سطوت کی کوٹھی میں اس سے ملنے کے لیے آیا یا نواب سطوت نے کبھی تمہیں اس کے پاس کسی کام سے بھیجا ہے۔" حشام نے ٹیبل پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے قدرے آگے کی جانب جھکتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"آپ بتائیں وہ کون ہے' کیسا ہے اگر میں اس سے اس حوالے سے واقف ہوا تو آپ کو ضرور بتاؤں گا۔" میں نے کہا تو حشام اپنے سامنے رکھی ہوئی ایک فائل کھول کر مجھے اس کے بارے میں بتانے لگا اس نے بتایا۔

"اس شخص کی عمر تقریباً چالیس سال کے لگ بھگ ہے۔ ویل ڈریس ہے ہمیشہ گلے میں سونے کی موٹی چین اور ہاتھوں میں قیمتی پتھروں کی انگوٹھیاں پہنتا ہے۔ رسٹ واچ ڈائمنڈ کی پہنتا ہے۔ سگار کا شوق اور ذوق رکھتا ہے اور سگار ایک خاص اور مخصوص اسٹائل سے پیتا ہے۔ دولت اور پیسہ بہت ہے اس کے پاس اس کے کئی بزنس ہیں پاکستان سے لے کر دبئی تک پھیلے ہوئے ہیں۔

یہاں کراچی میں بھی اس کے کئی ہوٹل اور سپر مارکیٹیں ہیں۔ پاکستان کی فلم انڈسٹری میں بھی اس نے کثیر سرمایہ لگایا ہوا ہے کتنی ہی فلمی ہیروئن اس کے تلوے چاٹتی ہیں۔ ڈائریکٹر اور ڈسٹری بیوٹرز بھی اس کی جیب میں رہتے ہیں۔ پولیس اہلکار اور حکومت کے اعلیٰ عہدیداران سے بھی اس کے تعلقات ہیں۔ ایک وفاقی وزیر سردار شیر افضل سے تو اس کا خاص یارانہ ہے......!"

"کیا نام ہے اس کا؟" میں نے سردار شیر افضل کا نام سنتے ہی تیزی سے پوچھا۔

"وہ حبیب سلطان کے نام سے مشہور ہے۔" حشام نے بتایا اور کھوجتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"حبیب سلطان۔" میں نے آہستہ سے زیر لب دہرایا۔ اس حلیے کے بندے کو اپنے ذہن کے حافظے میں تلاش کیا لیکن اس حلیے اور اس نام کے کسی فرد سے میں واقف نہیں تھا۔ اس لیے میں نے مایوسی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تم نے نام تو اس طرح چونک کر تیزی سے پوچھا تھا جیسے تم اس شخص سے واقف ہو کہیں تم کچھ چھپانے کی کوشش تو نہیں کر رہے۔" حشام نے مشکوک نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"میرے چونکنے کی وجہ سردار شیر افضل کا نام تھا۔" میں نے وضاحت کی۔ "اچھا کیا تم مجھے اس شخص کی کوئی تصویر دکھا سکتے ہو۔" میں نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ہمارے پاس اس کی کئی تصاویر موجود ہیں۔" حشام نے کہا پھر پروجیکٹر پر متعین ایک صاحب کو اشارہ کیا کہ وہ بڑی اسکرین پر حبیب سلطان کی تصاویر دکھائیں اور چند ہی لمحوں میں اس حلیے کا حامل ایک شخص دکھائی دینے لگا۔ مجھے اس شخص کو پہچاننے میں قطعی کوئی دشواری نہیں ہوئی اس لیے میں جذباتی ہو کر کرسی سے کھڑا ہو گیا اور کہا۔

"میں اس شخص سے اچھی طرح سے واقف ہوں اس شخص کی دہری شخصیت ہے اور یہ دو مختلف ناموں اور حلیوں سے دو جگہ رہتا ہے۔"

"کون ہے یہ؟" سب کی زبانوں سے بیک وقت نکلا۔

"اس کا اصل نام ہی رئیس خان ہے اور یہ مہہ وش کا شوہر ہے اور اسی سے وہ اہم کاغذات لے کر میں اشرف علی یا کمل راؤ کو دینے کے لیے جا رہا تھا۔ یہ شخص دوبئی میں بھی رہتا ہے اور کراچی میں بھی۔

اس کی بیوی مہہ وش کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے کہ یہ کہاں دن و رات گزارتا ہے یا کیا کرتا ہے۔ دنیا کی نگاہوں اور کاغذات میں وہ اس کی بیوی ضرور ہے لیکن حقیقت میں وہ اس کے دبئی والے محل میں ایک قیدی کی سی زندگی گزار رہی ہے کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ اس لیے میری موت کی خبر سننے کے بعد اس کا دنیا سے دل اچاٹ ہو گیا اور اس نے کبھی بھی رئیس خان کو ایک شوہر کی حیثیت سے نہ چاہا نہ تسلیم کیا اس کی بلا سے وہ کیا کرتا ہے۔ کہاں جاتا ہے۔

لیکن میری سمجھ میں ایک بات یہ نہیں آ رہی کہ وہ اس مرتبہ مہہ وش کو اپنے ساتھ پاکستان کیوں لے کر آیا ہے۔ یقیناً اس کے پیچھے بھی کوئی خاص مقصد ہوگا۔ اس نے تو مجھے یہ بتایا تھا کہ وہ اسے یہ کہہ کر پاکستان لایا تھا کہ میرے پیر صاحب میرے روحانی باپ ہیں میں تمہیں ان کی خدمت میں لے جاؤں گا تاکہ تمہاری حالت بہتر ہو سکے۔" میں نے تفصیل سے اس کے بارے میں بتایا۔

"تم ایک بار پھر غور سے اس کو دیکھو اور پھر حتمی بات کرو کہ کیا یہ واقعی رئیس خان ہے۔" حشام نے خاموشی سے ساری بات سننے کے بعد کہا۔

"ہاں مجھے پورا یقین ہے کہ یہی رئیس خان ہے فرق صرف حلیے کا ہے۔ مجھے یہ عام اور سادہ لباس میں ملا تھا اور یہاں یہ شہنشاہ بنا ہوا ہے۔" میں نے انتہائی نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

"اچھا یہ بتائیں اب آپ لوگوں نے ان دونوں کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔ میرا مطلب ہے نواب سطوت اور رئیس خان کے بارے میں اور کیا اب یہ لوگ اپنی جگہ موجود ہیں یا منظر سے غائب

آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں
ہم بروقت ہر ماہ آپ کی دہلیز پر فراہم کرینگے
ماہنامہ آنچل کراچی
ماہنامہ نئے افق کراچی
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے ہر کونے میں 600 روپے
امریکا' کینیڈا' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے
میڈل ایسٹ' ایشیاء' افریقہ' یورپ کے لیے 6000 روپے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ' منی آرڈر' منی گرام' ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہیں۔ مقامی افراد دفتر میں نقد ادائیگی کر کے کر سکتے ہیں۔
رابطہ: طاہر احمد قریشی...... 0300-8264242
نئے اُفق گروپ آف پبلی کیشنز کمرہ نمبر: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔
فون نمبرز: 2/+922-35620771 فیکس: +922-5620773 Email:circulationngp@gmail.com

ہو گئے ہیں۔'' میں نے سوال کیا۔

''نواب سطوت تو اپنی جگہ ڈھٹائی کے ساتھ موجود ہے لیکن رئیس خان غائب ہے اور اس کی جگہ حبیب سلطان موجود ہے اور ان دونوں کے بارے میں ابھی ہم فوری طور پر کوئی بھی ایکشن نہیں لے سکتے اوپر بات کرنی پڑے گی ہم یوں ہی عام آدمی کی طرح ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔'' کرنل احتشام نے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا۔

''اگر آپ مزید تصدیق چاہتے ہیں اس بات کی کہ یہی شخص رئیس خان ہے آپ مہہ وش کو یہ تصاویر دکھا دیں وہ تو اس کی بیوی ہے اس کے ہر انداز اور حرکات سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ بھی میری بات کی تصدیق کرے گی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ہم یقیناً ایسا کریں گے۔ بلکہ بجائے ان تصاویر کے ہم اس کی ایک ویڈیو اسے دکھائیں گے جو ایک نجی محفل میں بنائی گئی تھی۔ وہ ایک فلمی اداکارہ کی سالگرہ کی مووی ہے۔'' حشام

اور پھر ہماری یہ میٹنگ اختتام کو پہنچی میں اپنے نئے روم میں آ گیا اور حشام وغیرہ بھی شاید چلے گئے ہوں گے ان کے بارے میں مجھے نہیں پتا چلا۔

❀......❀......❀

اپنے دل میں یہ بات سوچ کر کہ حشام یقیناً کسی اہم کام میں مصروف ہے جب ہی اس نے اپنا فون بند کر رکھا ہے میں نے مزید فون نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے فون ٹیبل پر رکھ دیا اور سونے کے ارادے سے لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں لیکن آنکھیں بند کر لینے کے باوجود نیند میری آنکھوں میں آنے کا نام نہیں لے رہی تھی میرا دماغ حشام کی جانب ہی لگا ہوا تھا میں دل ہی دل میں اس کے لیے دعائیں کرنے لگی۔

جب سے مجھے اس بات کا ادراک ہوا تھا کہ حشام نا صرف ایک بے باک صحافی ہے بلکہ وہ انٹیلی جنس کا بندہ بھی ہے میرا دل فخر و غرور سے بھر گیا تھا اس نے مجھ سے اپنا آپ کیوں چھپایا یہ میں نہیں جانتی حالانکہ اسے ہر ہر بات کی خبر تھی لیکن وہ مجھ سے اسی طرح ہر بات سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا جیسے حقیقت میں وہ بے خبر ہے انکل نے میرے سامنے بھی یہی ظاہر کیا مجھے اس بات کی بھی بے حد خوشی اور تسلی تھی کہ حشام اب مکمل طور پر صحت یاب ہے وہ اتنا زیادہ زخمی ہوا تھا یا نہیں مجھے اس کی کوئی فکر نہیں تھی میں تو بس خوش اور مطمئن تھی کہ وہ مکمل طور پر صحت یاب ہے۔

اپنے نام نہاد باپ نواب سطوت کے لیے میرے دل میں موجود نفرت پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنے ملک کا دشمن اور غدار ہے اور ایسے لوگوں کے لیے رشتے کوئی بھی معنی نہیں رکھتے۔ اگر میں ایک حقیقی بیٹی کی حیثیت سے اس سے پیار کر بھی رہی ہوتی تب بھی اس کی اصل حقیقت سامنے آنے کے بعد میں اس سے اسی طرح نفرت کرتی۔ میرے لیے سب سے زیادہ عزیز میرا ملک اور یہاں بسنے والے لوگ تھے اور جو اس سے دشمنی کرے گا میں سب سے پہلے اس سے دشمنی کروں گی۔

میرے خیالات کی رو ایک بار پھر حشام کی جانب مڑ گئی۔ خیالوں میں میری نئی زندگی کے خوش کن لمحات مجھے گدگدانے لگے اور ان ہی خوش کن تصورات کے ساتھ میں نیند کی گہری وادیوں میں اتر گئی۔ میرے موبائل پر الارم بجا تو میری آنکھ کھل گئی میں نے ہاتھ بڑھا کر موبائل آف کر دیا اور گہری نیند

ہونے کی وجہ سے کروٹ لے لی پھر جیسے کسی نے میرے کان میں سرگوشی کی الصلوٰۃ خیر من النوم تو میں تیزی کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اللہ تعالیٰ میری سرمئی امی کو جنت الفردوس عطا کرے کہ میرے بچپن ہی سے انہوں نے مجھے نماز کی پابندی کی عادت ڈالی تھی میں کہیں بھی ہوتی نماز کی وقت پر ادائیگی کبھی بھی نہ بھولتی تھی۔

نماز کے بعد میں دوبارہ سو گئی امی نے میرے کمرے میں جھانکا پھر مجھے سوتا ہوا دیکھ کر چلی گئیں۔ گہری نیند سے ایک بار پھر میں ڈسٹرب ہو گئی جب حشام کا فون آیا۔

''ہوں۔'' میں نے فون کان سے لگا کر بنا نمبر دیکھے نیند سے بوجھل لہجے میں کہا۔

''ہوں۔'' جواباً میرے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے اس نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''ابھی تک میری جانو کی نیند پوری نہیں ہوئی لگتا ہے اتنے دنوں کی نیند پوری ہو رہی ہے۔''

آواز حشام کی تھی اس لیے میں پوری طرح نیند سے بے دار ہو گئی۔ میں اسے یہ بتانا نہیں چاہتی تھی کہ رات کو میں نے اسے فون کیا اور اس کا فون آف پایا اس لیے کہا۔

''ہاں شاید، کیوں کیا ٹائم ہوا ہے۔''

''آنکھیں کھولو جان من صبح کے گیارہ بج رہے ہیں۔'' اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا اس کے جان من کہنے سے مجھے شرم آ گئی پیار میں وہ مجھے نجانے کون کون سے خطابات دینے لگتا تھا۔

''کیا بات ہے مسٹر تم سیدھی طرح میرا نام کیوں نہیں لیتے۔'' میں نے اسی طرح کہا۔

''کیوں میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔'' اس کے لہجے میں ڈھیر ساری شرارت چھپی تھی۔

''مجھے نہیں پتا...... تم بہت وہ ہو۔'' میں نے کہا۔

''وہ یعنی ہینڈسم اور اسمارٹ۔'' وہ پھر بولا۔

''نہیں وہ۔'' میں نے کہا۔

''اچھا تم مجھے اپنا جانو کہنے سے شرما رہی ہو۔'' اس نے مجھے چھیڑا۔

''باز آ جاؤ حشام ورنہ میں......!'' میں اپنا ہمیشہ کہا جانے والا جملہ کہتے کہتے رک گئی۔

''پیار کر لو گی، تو کر لو...... کس نے منع کیا ہے۔'' اس نے خمار آلود لہجے میں کہا۔

''حشام میں فون بند کر رہی ہوں۔'' میں نے اس کی شرارتوں سے تنگ آ کر کہا۔

''ارے رے رے، یہ کیا غضب کر رہی ہو، ایسا مت کرنا...... اچھا چلو چھوڑو ایک خوش خبری سنو۔'' اس نے کہا تو میں مسکرا دی۔

''آج شام کو ممی اور ڈیڈی تمہارے گھر آ رہے ہیں ہمارے رشتے کی بات کرنے کے لیے۔ بس کچھ دن اور ہیں دوری کے پھر تم ہو گی اور میں......!'' اس کے لہجے میں گنگناہٹ اتر آئی۔

''منہ دھو رکھیے جناب، میں شادی کے موڈ میں قطعی نہیں ہوں اور وہ بھی تم سے......!'' میں نے اسے چھیڑا کیونکہ بہت دیر سے وہ مجھے تنگ کر رہا تھا اب میری باری تھی۔

''پلیز سرمئی ایسا مذاق میں بھی مت کہنا دیکھو میں گولیاں کھا کر بھی زندہ بچ گیا لیکن تمہاری نہ کے بعد میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا لہجہ بھیگ گیا اور میں تڑپ گئی۔

''کیا ہو گیا ہے حشام میں تو مذاق......!''

''نہیں، مذاق میں بھی نہیں۔'' اس نے تیزی سے

میری بات کاٹ کر قطعی لہجے میں کہا۔

"اور تم جو مجھے اتنی دیر سے تنگ کر رہے تھے میں نے ایک بات کہہ دی تو سنجیدہ ہی ہو گئے۔" میں نے ہلکی سی ناراضگی بھرے لہجے میں کہا۔

"تو کیا میں نے کوئی ایسی بات کہی جس سے تمہارا دل دکھا ہو۔ تم اندازہ ہی نہیں کر سکتی میری جان تم میرے لیے کیا حیثیت رکھتی ہو۔ میرے دل کی دھڑکن ہو اور میری آتی جاتی سانس ہو۔" اس نے کہا تو میں نے جھٹ کہا۔

"جناب کو صرف اپنی محبت کی شدت کا احساس ہے سچی محبت تو یہ ہے کہ بندے کو دوسرے کے دل کا بھی پتا ہو کہ وہ کسی کے لیے کیا ہے۔"

"کیا کریں۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "کبھی کسی نے کھل کر بتایا بھی تو نہیں ہم تو ترستے ہی رہے کہ کوئی ہم سے بھی اپنی بے تابیوں کا ذکر کرے اور کہے جان میں تمہاری بانہوں کے لیے ترس رہی ہوں۔"

"خدا کی قسم حشام تم انتہائی بے شرم انسان ہو۔ توبہ توبہ کس قسم کی باتیں کرتے ہو۔" میں نے بوکھلا کر کہا تو حشام کا بلند قہقہہ میری سماعت سے ٹکرایا وہ پھر بولا۔

"ابھی تم نے بے شرمی دیکھی کہاں ہیں بے شرمی تو......!"

"اللہ حافظ۔" میں نے جھٹ اسے اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا یہ سوچ کر ہی میرا چہرہ دہک اٹھا کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔

میں نے فون بند کر دیا تو اس نے دوبارہ ملا لیا لیکن بیل ہوتی رہی اور میں نے فون ریسیو نہیں کیا۔ مجھے واقعی بے حد شرم آ رہی تھی۔ "یہ مرد واقعی بڑے بے شرم ہوتے ہیں۔" میں نے زیر لب کہا اور فریش ہونے واش روم چلی گئی۔

میں کمرے سے باہر آئی تو امی اور اماں دونوں بہت خوش گوار موڈ میں دھیرے دھیرے باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھا تو مسکراتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگیں۔ اماں جھٹ اٹھیں اور میرے بلائیں لے ڈالیں۔ امی بھی ڈھیروں دعائیں دینے لگیں۔ میں سمجھ گئی کہ آنٹی کا فون امی کے پاس آ چکا ہے۔ لیکن انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے کیوں میری بلائیں لی جا رہی ہیں اور امی اتنی دعائیں بھی دے رہی ہیں۔"

"مبارک ہو میرا بچہ، خیر سے آج شام حشام میاں کے والدین تمہارے اور حشام کے رشتے کی بات کرنے آ رہے ہیں بلکہ بات کیا ہم تو یہ سوچ رہے ہیں کہ چند خاص خاص لوگوں کو بلا لیں اور تمہاری منگنی کا اعلان کر دیں۔" اماں نے پرمسرت لہجے میں کہا۔

"اچھا......!" میں شرم سے گلنار چہرہ لیے جھک گئی۔ امی نے ہنستے ہوئے ایک بار پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"تو پھر حمیدہ باجی میں حشام کی والدہ سے بات کروں۔" امی نے اماں سے پوچھا۔

"ہاں میرا خیال تو یہی ہے کہ یہ رشتہ وغیرہ لانے کی بات چھوڑیں۔ انہیں بھی معلوم ہے کہ ہم بھی راضی ہیں تو پھر کیوں نہ چھوٹی سی رسم ادا کر لیں۔" اماں نے جواب دیا تو امی ریسیور اٹھا کر حشام کے گھر کا نمبر ملانے لگیں اور میں کچن کی جانب آ گئی۔ چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔

شام تک میں اپنے کمرے میں ہی رہی۔ امی اور اماں نے کس طرح سے کیا انتظامات کیے مجھے نہیں معلوم البتہ مغرب کی نماز کے بعد امی ہلکا گلابی اور

آسمانی کلر کا کامدار سوٹ لے کر آ گئیں کہ یہ پہن کر تیار ہو جاؤ۔

اس کلر کمبینیشن کو دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ یہ دونوں کلر تو حشام کے پسندیدہ کلرز تھے۔ میں نے حیرانی سے امی کو دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"ابھی ان کے گھر کا ڈرائیور یہ سارا سامان دے کر گیا ہے تم تیار ہو جاؤ آج تمہاری منگنی نہیں نکاح ہے۔"

"کیا...... نکاح......!" میں نے حیرانی سے کہا۔

"بھئی کیا کریں حشام بیٹا کی یہی ضد تھی۔ مجھے تو یہ ٹینشن ہو رہی ہے کہ کہیں موصوف نکاح کے بعد یہ ضد نہ شروع کر دیں کہ میں اپنی دلہن کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔" امی بولیں۔

"تو کیا امی آپ مجھے رخصت کر دیں گی۔" میں نے بھولپن سے کہا تو امی ہنسنے لگیں اور بولیں۔

"بھئی پھر تو بات ماننی پڑے گی پھر میں تمہیں کس حق سے روکوں گی۔"

"ہائے اللہ امی یہ سب اتنا اچانک۔" میں واقعی ہونق ہو گئی تھی۔ حشام سے کچھ بعید نہیں کہ وہ کسی بھی وقت کیا دھماکا کر دے۔

"تیار ہو جاؤ فٹافٹ، ہاں یہ جیولری ہے اور یہ میک اپ کا سامان۔ اگر میری ضرورت ہو تو بلا لینا۔" امی نے کہا۔

"لیکن امی آپ کو تو پتا ہے کہ مجھے میک اپ وغیرہ کرنا نہیں آتا کبھی کیا جو نہیں ہے۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔

"تو اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹی کو تیار کروں گی۔ تم کپڑے تبدیل کر لو تو مجھے آواز دے لینا۔" امی نے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام کر کہا اور ان کی آواز بھرا گئی اور میں امی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

امی نے میرا میک اپ کیا جیولری پہنائی اور بے ساختہ ان کے لبوں سے ماشاء اللہ نکل گیا۔ امی کی آنکھیں بار بار بھر آ رہی تھیں۔ امی کمال ہوشیاری سے اپنے آنسو چھپا رہی تھیں۔

ذرا دیر بعد کرنل مشتاق کی وائف اور بیٹی امی کے ساتھ کمرے میں آ گئیں۔ اس کے بعد مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ پھر باہر تھوڑی ہلچل مچی پتا چلا کہ طلال انکل وغیرہ بھی آ گئے ہیں۔ مجھے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ میں کس طرح ایک مشرقی لڑکی کی طرح شرم و حیا کا پیکر بنی بیٹھی ہوں۔ حشام جس کے ساتھ میری بے انتہا لڑائی ہوتی تھی کس طرح اس کے تصور سے بھی مجھے شرم آ رہی تھی۔ دل کی دھڑکن تھی کہ قابو میں ہی نہیں آ رہی تھی۔

آنٹی اندر آئیں اور انہوں نے مجھے دیکھا تو بے حد تعریف کی۔ کچھ دعائیں پڑھ کر میرے چہرے پر پھونک ماری کہ مجھے کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

"آنٹی آپ سرمئی پر یہ پڑھ کر دم کریں کہ حشام بھائی کی نظر نہ لگے۔" آصف کی بہن ثمینہ نے کہا تو وہ ہنس پڑیں۔

پھر تھوڑی دیر بعد میرا کمرہ بھر گیا، طلال انکل، مشتاق انکل اور آصف اندر آ گئے۔ مشتاق انکل میرے وکیل تھے۔ ولدیت کے خانے میں مجبوراً نواب سطوت کا نام تحریر کیا گیا آصف کا نام گواہان میں شامل تھا۔

اور پھر ایجاب و قبول کے بعد میرا نکاح حشام کے ساتھ ہو گیا۔ اس وقت میرے دل کی کیفیت تھی وہ

لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ ہمیشہ کے لیے میں اور حسام شرعی اور قانونی طور پر ایک دوسرے کے ہو گئے تھے۔ میرا دل اپنے رب کے آگے سجدہ ریز تھا تو دوسری طرف ایک عجیب سا دکھ اور ملال تھا۔ میں یتیم نہیں تھی میرا باپ اس دنیا میں موجود تھا لیکن آج ایک باپ کی حیثیت سے کرنل مشتاق نے میرے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ انہوں نے حسام کی جانب سے شرکت نہیں کی تھی بلکہ وہ اور ان کی فیملی میری جانب سے شریک ہوئے تھے۔

باہر مبارک سلامت کا شور اٹھا پھر تھوڑی دیر بعد مجھے باہر لے جایا گیا۔ لاؤنج میں صوفے تھے لیکن مہمانوں کے لیے مزید کرسیاں لگائی گئی تھی۔ یہیں ایک صوفے پر حسام آف وائٹ لباس میں بیٹھے تھے گلے میں سرخ گلابوں کا ہار تھا۔ میں نے ایک نگاہ حسام پر ڈالی پھر نگاہیں جھکالیں مجھے حسام کے برابر میں بٹھا دیا گیا۔ مہمانوں کو کھانے کے لیے لان میں لے جایا گیا۔ لاؤنج میں تھوڑے لوگ رہ گئے تب ہی میری نگاہ آصف پر پڑی وہ ہاتھ میں کیمرہ لیے میری اور حسام کی تصاویر اتار رہا تھا۔

”خدا کی قسم آج تو تم جنت سے اتری ہوئی حور لگ رہی ہو۔ میرا دل تو بے قابو ہوا جا رہا ہے۔“ حسام نے میری جانب جھک کر سرگوشی میں کہا تو میں کچھ بھی نہ کہہ سکی' اف اللہ کس قدر شرم آ رہی تھی۔ مجھے یہ سب بہت عجیب لگ رہا تھا اپنا اس طرح بیٹھنا اور اتنی شرم آنا۔

وہ مسلسل میرے کان میں سرگوشیاں کیے جا رہا تھا آصف مسلسل سامنے کھڑے تھا اس کی گہری نگاہیں میرے چہرے ہی کا طواف کر رہی تھیں۔

پھر سب لوگ کھانے سے فارغ ہو کر آ گئے کسی نے کہا بھئی ان دونوں کو تو کھانا کھلا دو' لیکن حسام نے منع کر دیا کہ مجھے بالکل بھی بھوک نہیں ہے۔ ”یہ کہو کہ اپنی دلہن کے پاس سے اٹھنے کا دل ہی نہیں چاہ رہا ہے۔“ مسز مشتاق نے کہا تو سب ہنس پڑے۔

”آنٹی یو آر گریٹ۔“ حسام نے چہک کر کہا ”اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ اس کو چھوڑ کر میں کھانا کھانے نہیں گیا تو پھر اکیلا گھر واپس کیسے جا سکتا ہوں۔“

”صبر میرے بچے' ابھی تو نکاح ہوا ہے رخصتی بھی ان شاء اللہ جلد ہی کر دیں گے۔“ اماں نے آگے بڑھ کر کہا۔

پھر سب میں ایک نئی بحث چھڑ گئی۔ وہی ہوا جس کا امی کو ڈر تھا۔ حسام ضد پر اڑ گیا کہ میں اکیلا نہیں جاؤ گا۔ طلال انکل' آنٹی' امی' اماں اور کرنل مشتاق اسے سمجھانے میں لگ گئے سب لوگوں کی توجہ ان لوگوں کی جانب ہو گئی تو آصف میرے نزدیک چلا آیا اور صرف میرے پوز کیمرے میں مقید کرنے لگا۔

”آپ اپنا چہرہ پلیز تھوڑا سا اونچا کریں۔“ اس نے لرزتے ہاتھوں سے میری تھوڑی کو تھوڑا سا اونچا کیا اور گھٹنوں کے بل میرے پیروں کے پاس بیٹھ گیا اور کیمرے کا لینس چہرے پر سیٹ کرنے لگا۔

مجھے آصف کی یہ حرکت بے حد ناگوار گزری لیکن میں خاموش رہی وہ کیمرے کی آنکھ سے مجھ پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ پھر بھاری لہجے میں بولا۔

”سرمئی میں نے آپ کو اپنے دل کی تمام تر گہرائیوں سے چاہا تھا لیکن آپ کے دل میں تو پہلے سے حسام موجود تھا۔ اس لیے آج میں پورے خلوص سے آپ کو دعا دیتا ہوں کہ آپ حسام کے ساتھ ہمیشہ خوش رہیں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے فلش آن کی اور میری تصویر اتار لی۔

مجھے یہ بات بعد میں پتا چلی کہ آج میرے اس گھر کی سیکیورٹی کا بہت زیادہ خیال رکھا گیا تھا۔ باہر جو لوگ باراتی دکھائی دے رہے تھے حقیقت میں سیکیورٹی ایجنسی کے بندے تھے۔

مجھ سے ایک جملے میں اپنے دل کا حال بیان کر کے آصف میرے پاس سے ہٹ گیا اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں اس نے کیمرہ ایک دوسرے شخص کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ تم تصاویر اتارو میری آنکھ میں کچھ چلا گیا ہے اور وہ وہاں سے چلا گیا اور نجانے کیوں پہلی مرتبہ میرا دل آصف کے لیے دکھی ہوا۔ میں اس کے بارے سوچنے لگی۔ ہوش اس وقت آیا جب امی نے مجھے اپنی بانہوں کا سہارا دے کر کھڑا کیا اور گلوگیر لہجے میں بولیں۔

”جاؤ میری جان خیر سے اپنے گھر سدھارو۔ ابھی میرا ارادہ تمہاری رخصتی کا نہیں تھا لیکن حسام کی ضد نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔“ اور یہ کہہ کر انہوں نے مجھے گلے لگا لیا۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے امی اتنے تھوڑے عرصے کے لیے مجھے ملی تھیں۔

یہ سب اتنا اچانک ہو گیا کہ میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ صبح تک تو کچھ بھی نہیں تھا اور اب نکاح اور رخصتی' پتا نہیں امی کس طرح قائل ہو گئیں۔ شاید کرنل مشتاق نے امی کو علیحدگی میں لے جا کر کچھ سمجھایا تھا۔

میں بلیک شیشوں والی بلیک سوک میں حسام کے پہلو میں بیٹھی تب مجھے یقین آیا ڈرائیونگ سیٹ ضد کر کے آصف نے ہی سنبھال لی اور میں گاڑیوں کے جلوس میں اپنے حسام کے گھر روانہ ہو گئی۔

❀......❀......❀

میٹنگ سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرے میں آیا تو مسلسل مہ وش کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

راجہ صاحب کی اکلوتی بیٹی اتنی زمین اور جائیداد کی تنہا وارث۔ وہ مہ وش کو اتنا زیادہ چاہتے تھے کہ اس کی ماں کے مرنے کے بعد بھی انہوں نے دوسری شادی نہیں کی۔ اس کی ہر آرزو اور ہر خواہش کو پورا کرنا وہ اپنا ایمان سمجھتے تھے لیکن جب اس نے میرا ساتھ مانگا تو وہ ایک سرمایہ دار بن گئے۔ اپنی امارت کا غرور ہو گیا اور غرور سے تنی اس گردن نے اپنی بیٹی کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کے آگے بھی سر نہیں جھکایا اس کا پیار اس سے چھین لیا اور اسے تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا۔

مہ وش نے اچھی بیٹی ہونے کا ثبوت دیا اور مرتے ہوئے باپ کی خواہش پر سر جھکا دیا۔ جس کا زندگی بھر کا ساتھ انہوں نے اسے دیا وہ اس نے بنا سوچے سمجھے قبول کر لیا۔

پھر وہ مر گئے اور بیٹی کو ایک ایسی سرد جہنم میں جھلنے کے لیے چھوڑ گئے کہ جس کی آگ کسی اور کو دکھائی نہیں دیتی بس جلنے والا اس کی تپش کو محسوس کرتا ہے اور مرغ بسمل کی طرح تڑپتا رہتا ہے۔

اور آج اپنے شوہر کے گناہ کی سزا وہ بھگت رہی تھی۔ ایجنسی والوں نے اسے قید کر رکھا تھا۔ اسے شدید ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ اس بارے میں کیا بتائے گی جس کے بارے میں اسے علم ہی نہیں ہے۔ وہ تو رئیس خان کے قفس میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔

اللہ کا شکر ہے کہ یہ بات میرے سامنے آ گئی اور میں نے انہیں ساری حقیقت بتا دی۔ اب میری اللہ سے یہ دعا ہے کہ یہ لوگ میری مہ وش سے ایک ملاقات کروا دیں۔

اس رات میں لمحہ بھر بھی نہ سوسکا نرم وملائم بستر بھی کانٹوں بھرا محسوس ہو رہا تھا میں بار بار تڑپ کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور ٹہلنے لگتا۔ مہ وش کا نجانے کیا حال ہوگا۔ میری وہ نرم ونازک گڑیا کہیں زنجیروں میں قید نہ ہو۔ کہیں سچ اگلوانے کے لیے اسے بھی تشدد کا نشانہ نہ بنایا گیا ہو میں یہ سب کچھ سہہ کر آیا تھا میں مرد تھا سب کچھ برداشت کر گیا لیکن میری مہ وش......! اس نے کس طرح یہ سب سہا ہوگا میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں تمام پابندیاں توڑ کر اس تک جا پہنچوں۔

پھر میں نواب کے بارے میں سوچنے لگا کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا۔ یا پھر یہ کہ اب یہ ایجنسی والے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ اب تو اس کے بارے میں ساری معلومات انہیں مل گئی ہیں اور رئیس خان کا کیا انجام ہوگا۔ یہ وہ دیو ہے جس نے میری پری میری شہزادی کو اپنے محل میں قید کر رکھا تھا۔ ایسا محل جو سب سے اونچی پہاڑی پر تھا اور جس پر پہنچنا میرے لیے بہت مشکل تھا میں کس طرح اپنی شہزادی کو اس کی قید سے رہائی دلواؤں۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا لگتا تھا دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ بس ایک ہی راستا سجھائی دیا کہ میں اپنے رب کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو کر اس کی منتیں کروں کہ وہ مہ وش کو اس سے رہائی دلوادے۔

پھر میں وضو کر کے بارگاہ ایزدی میں کھڑا ہو گیا میرا سارا جسم لرز رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ دو رکعت نفل حاجت پڑھ کر میں سجدہ ریز ہو گیا اور نجانے کب تک اپنے رب سے التجائیں کرتا رہا۔

اگلا دن میرا چپ چاپ گزر گیا۔ یہ اس سے اگلا روز تھا جب کرنل احتشام نے مجھے بلوایا انہوں نے مجھے اپنے روم میں بلوایا تھا جو شخص مجھے بلانے کے لیے آیا تھا وہی اپنے ہمراہ مجھے ان کے روم تک لے گیا اور مجھے دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا میں نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے کرنل احتشام کی بھاری آواز آئی۔

"یس......کم آن۔"

وہ ٹیبل کے پیچھے کرسی پر بیٹھے کسی فائل کی ورق گردانی میں مصروف تھے قریب کی نگاہ کا چشمہ انہوں نے لگایا ہوا تھا مجھے چشمے کے اوپر سے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ پھر چشمہ اتار کر ٹیبل پر رکھا اور فائل بند کر کے مجھے آنے کا اشارہ کیا میں قریب گیا تو میز کی دوسری جانب پڑی ہوئی کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھو۔" تو میں بیٹھ گیا۔

"کیسے ہو شمروز؟" انہوں نے دوستانہ مسکراہٹ کے بعد پوچھا۔

"شکر الحمدللہ سر آئی ایم پرفیکٹلی فائن۔" میں نے بیٹھتے ہوئے سر کر ہلکا سا خم دیتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔" انہوں نے ہلکی سی ہنکاری بھری پھر کچھ سوچنے لگے جیسے کچھ کہنے کے لیے الفاظ جمع کر رہے ہوں۔ میں خاموشی سے ان کے بولنے کا منتظر تھا۔ پھر وہ بولے۔

"تم نے رئیس خان کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا صرف اتنا ہی جانتے یا کچھ باقی ہے۔"

"سر آپ کو مجھ سے یہ سوال کرنا ہی نہیں چاہیے تھا کیونکہ میرے علم میں جو کچھ اور جتنا تھا وہ ایک ایک بات میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ میں تو اس بات سے بھی لاعلم تھا کہ یہ شخص پاکستان میں ایک دہری شخصیت کے ساتھ پہچانا جاتا ہے کچھ اسی کے بارے میں مجھے مہ وش نے بتایا تھا اور کچھ اس سے ایک ملاقات میں میں نے جانا تھا لیکن جو شخص مجھ سے رئیس خان بن

کر ملا تھا وہ اس حبیب سلطان سے یکسر مختلف ہے۔ اس نے بڑی چالاکی سے اپنے رئیس خان کے کردار اور حبیب سلطان کے کردار کو علیحدہ کر رکھا ہے اور شاید اس دہری شخصیت کو اپنانے کی وجہ بھی یہی ہو کہ اگر کبھی یہ رئیس خان کو ہمیشہ کے لیے غائب کر کے صرف حبیب سلطان بن کر آزاد گھومتا پھرے مجھے آپ کا سوال سن کر ایسا لگ رہا ہے جیسے ابھی بھی آپ کو میرے اوپر مکمل بھروسا اور یقین نہیں ہوا ہے۔" میں نے آخری جملہ دکھی انداز میں کہہ کر سر جھکا لیا۔ میری سچائی کا گواہ سوائے میرے اللہ کے کوئی نہیں تھا۔ میں اس وقت اپنے آپ کو بے حد بے بس محسوس کر رہا تھا اور اپنے دل کی سچائی کا یقین نہیں دلا سکتا تھا چاہے کچھ بھی ہو جائے میں مجرم کی حیثیت سے ان کے ہاتھ لگا تھا اور مشتبہ کی حیثیت سے رہوں گا۔

"ارے یار تم تو دل پر لے گئے۔" انہوں نے اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"دراصل ہماری فیلڈ ہی ایسی ہے کیا کریں اپنی عادت سے مجبور ہیں اینی وے میں نے تمہاری اور مہ وش کی ملاقات کا بندوبست کر دیا ہے۔"

انہوں نے کہا تو میں نے تیزی سے چونک کر سر اٹھایا اور پرمسرت لہجے میں کہا۔ "کیا واقعی سر؟" تو وہ اثبات میں سر ہلانے لگے۔

"کہاں ہے وہ؟" میں نے بے قراری سے سوال کیا۔

"تمہارے لیے اسے یہیں بلوالیا ہے بس چند منٹ صبر کرو لیکن......!" اتنا کہہ کر وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگے۔

"لیکن کیا سر۔" میں بھی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پوچھا۔

"یہ یاد رہے کہ تمہاری یہ ملاقات اس وقت ہمارے نمائندے کی حیثیت سے ہو رہی ہے اور اسے اس بات کا قطعی پتا نہ چلے تم اس سے جو کچھ بھی اگلوا سکتے ہو اگلواؤ۔ یہ بہت ضروری ہے جوان۔" انہوں نے سختی کے ساتھ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ بے فکر رہیں سر' میرے لیے سب سے زیادہ اہم اپنے وطن کی عزت ہے مجھے یہ بات تو بہرحال معلوم کرنی ہی ہے کہ رئیس خان اسے کس لیے یہاں لایا تھا۔ یقیناً کوئی بہت اہم وجہ ہی ہوگی۔"

"گڈ۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا پھر میز پر رکھی ہوئی بیل پر ہاتھ مارا تو باہر سے ایک شخص اندر آ گیا تو کرنل احتشام نے اس سے کہا کہ انہیں سیل نمبر تین میں لے جاؤ۔

میں اس کے ساتھ جا تو رہا تھا لیکن میرا دل ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے دھڑک رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں مہ وش کو نجانے کس حال میں دیکھوں گا۔

میں ایک بار پھر اس وسیع میدان سے گزر رہا تھا جہاں سے میں آیا تھا یہاں کافی سارے کمرے بنے ہوئے تھے ایک کمرے کے دروازے پر جا کر اس نے باہر سے دروازہ کھولا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں اندر داخل ہو گیا تو اس نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

اندر بہت ہلکی روشنی تھی مجھے مہ وش دکھائی ہی نہیں دی لیکن مہ وش کی نگاہ جیسے ہی مجھ پر پڑی وہ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ اٹھی اور دوڑتی ہوئی آ کر میرے سینے سے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونا

شروع کردیا۔
خود میرا دل غم واذیت سے پھٹا جارہا تھا لیکن میں نے کمال ضبط سے خود کو سنبھال لیا۔ بس میرے ہاتھوں کی گرفت خود بخود مہہ وش کے گرد مضبوط ہوتی چلی گئی۔

مہہ وش دیر تک میرے سینے سے لگی روتی رہی میں نے جی بھر کر اسے رونے دیا۔ بس آہستہ آہستہ اس کی سسکیاں تھمتی چلی گئیں تو وہ مجھ سے ہٹ کر کھڑی ہوگئی اور اپنے دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے بولی۔

"شاہ زمان یہاں کیسے آ گئے؟"

"بس مجھے پتا چل گیا کہ میری مہہ وش مشکل میں ہے اور دیکھو میں آ گیا۔" میں نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ اس وقت مہہ وش کے چہرے پر میری نگاہ پڑی تو میرا دل کٹ کے کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا۔ یہ مہہ وش اس مہہ وش سے یکسر مختلف تھی جو میری محبت تھی کہاں وہ گلاب کے پھول جیسا نرم و ملائم سرخ و سفید چہرہ' اس وقت سوکھا ہوا تھا وہ آنکھیں جن میں ہر وقت قندیلیں روشن رہتی تھی۔ اس وقت بجھی ہوئی تھیں۔ پھول کی پنکھڑیوں جیسے لب تھے جن پر اس وقت سوکھی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ الجھے ہوئے پراگندہ بال۔ میلا اور مسلا ہوا لباس۔

"کیا دیکھ رہے ہو شاہ زمان' شاید ہمارے نصیب میں یہ ملاقات لکھی تھی اس لیے میں تمہیں زندہ مل گئی ہوں ورنہ جو اذیت میں نے رئیس کی وجہ سے اٹھائی ہے اس ذلت سے تو بہتر تھا کہ اللہ مجھے موت ہی دے دیتا۔"

"مجھے یہ بتاؤ مہہ وش کہ رئیس خان تمہیں اپنے ساتھ پاکستان کیوں لایا تھا۔ جبکہ پچھلی ملاقات میں تو تم نے مجھے یہ بتایا تھا کہ تمہارے اس کے ساتھ تعلقات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس نے تمہیں صرف اس وجہ سے طلاق نہیں دی تھی کہ وہ تمہیں آزاد کر کے تمہاری من پسند زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دینا چاہتا تھا۔ پھر اسے تمہیں اپنے ساتھ پاکستان لانے کا خیال کیوں آیا؟" میں مہہ وش کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے فرش پر بیٹھ گیا جہاں ایک چٹائی پڑی ہوئی تھی۔

"مجھے نہیں پتا شاہ زمان' میں تو خود حیران تھی۔ بلکہ مجھے پاکستان آنے کی کوئی خوشی بھی نہیں تھی اس لیے کہ میرا یہاں تھا ہی کون' ایک تم تھے جس کا مجھے یہ پتا تھا کہ وہ بھی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اس نے مجھے اس ہوٹل میں ٹھہرا دیا تھا۔ یہاں میں تنہا تھی۔ جیسے دبئی میں اپنے کمرے میں تنہا رہتی تھی ویسے ہی یہاں رہ رہی تھی لیکن تم سے ملاقات کے بعد میرے اندر جینے کی امنگ پیدا ہوگئی تھی اور میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اب دبئی جا کر رئیس سے علیحدگی کی بات کروں گی اور اگر وہ مجھے آزاد کردیتا تو تمہارا کانٹیکٹ نمبر تو تھا ہی میرے پاس لیکن اللہ جانے رئیس نے ایسا کون سا کام کیا ہے کہ مجھے ان لوگوں نے ہوٹل سے اٹھالیا اور یہاں لا کر صرف رئیس کے بارے میں مجھ سے پوچھ گچھ کررہے ہیں یہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ میں رئیس کی ساتھی ہوں۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں یہ یقین دلایا ہے کہ میں اس کی بیوی ہوں اور وہ کیا کرتا ہے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں پتا لیکن یہ لوگ اس بات کا یقین ہی نہیں کررہے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ناممکن ہے کہ ایک بیوی کو پتا ہی نہ ہو کہ اس کا شوہر کیا کرتا ہے۔ مجھے تم یہ بتاؤ۔" اس نے میرا بازو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں مضبوطی سے تھام لیا اور بولی۔

"کیا تمہارا تعلق بھی ان لوگوں سے ہی ہے میں نہیں کیا بتاتی شاہ زمان کہ میرے تعلقات اپنے شوہر سے پہلے دن ہی سے خوش گوار نہیں تھے وہ جب تک میری بے اعتنائیوں کو برداشت کرتا رہا جب تک اس نے میری ساری جائیداد نہیں ہتھیالی جائیداد حاصل کرنے کے بعد اس نے مجھے اپنی اصلیت دکھائی۔ آدھی جائیداد تو اس رزیل سردار شیر افضل نے لی ہے اس نے پاپا سے یہ جھوٹ بول کر رئیس سے میری شادی کروائی تھی کہ وہ اس کا بھتیجا ہے مجھے صرف اتنی سن گن تھی کہ یہ دونوں غیر قانونی دھندوں میں ملوث ہیں۔ لیکن وہ غیر قانونی کام کیا ہیں اس کا مجھے بالکل نہیں معلوم۔ میں اپنے اللہ کی قسم کھاتی ہوں شاہ زمان میں بالکل لاعلم ہوں۔"

اتنا کہہ کر اس نے ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا تب میں نے اسے رئیس خان کی دوہری شخصیت اور اس کی وطن دشمنی کی ساری داستان مختصر الفاظ میں سنائی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ چند لمحے منہ کھولے میری جانب دیکھتی رہی پھر بھڑک کر بولی۔

"یہ لوگ اسے گرفتار کر کے گولی کیوں نہیں مارتے ایسے غدار وطن کو تو ایک سانس بھی لینے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔"

"ہاں دیکھو اب اس کے بارے میں کیا فیصلہ ہوتا ہے اس پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں ہے اگر اس کو گرفتار کیا تو اس کے اوپر جو بڑے بیٹھے ہیں وہ اسے ایک منٹ بھی اندر رہنے نہیں دیں گے۔ الٹا ہتک عزت کا دعویٰ کردیں گے۔" میں نے مہہ وش کو بتایا۔

"مجھے یہاں سے باہر نکالو شاہ زمان' میرا یہاں دم گھٹتا ہے میں مرجاؤں گی۔" اس نے کہا۔

"میں بات کروں گا...... تم فکر نہ کرو...... ان شاء اللہ سب کچھ اچھا ہوگا۔ بس تم اللہ سے دعا کرو اور اس کی رحمتوں سے مایوس نہ ہو' جب انسان سب طرف سے مایوس ہوجاتا ہے تو ایک اللہ کی ذات ہی سہارا دیتی ہے۔ وہ بہت مہربان ہے۔ اپنے بندوں کو کبھی بھی اپنی رحمت سے مایوس نہیں کرتا۔" میں نے اسے سمجھایا اور جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ابھی مت جاؤ شاہ زمان تھوڑی دیر تو اور بیٹھو۔ اتنے دنوں کے بعد آج تو یہ احساس ہوا ہے کہ میں نے کھل کر سانس لی ہے۔ تمہاری صورت میں مجھے ایک روشنی کی کرن دکھائی دی ہے۔ ورنہ تو میرے چاروں جانب گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔" مہہ وش نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔

"میں نے کہا ہے نا' اللہ پر بھروسہ رکھو...... وہ سب ٹھیک کردے گا۔" میں نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"تم بہت بدل گئے ہو شاہ زمان تم نے داڑھی رکھ لی ہے، تم پر داڑھی بہت اچھی لگ رہی ہے۔" اس نے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو' میں واقعی بہت بدل گیا ہوں۔ جن حالات کا میں شکار رہا ہوں انہوں نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کردیا ہے کہ اگر ہم جیسے مسلمانوں کے پاس اپنے دین اور قرآن کا علم نہ ہو تو ہم اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر جب طاغوتی طاقت کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتے ہیں تو ہمارا کیا انجام ہوتا ہے۔ یہاں اتنے دن ان لوگوں کی قید میں رہ کر میں نے اللہ سے اپنے گناہوں کی توبہ کی اور قرآن پاک کی تفسیر پڑھی اور خود کو اللہ کے قریب کرلیا۔"

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو' تم نے کون سے گناہ کیے ہیں اور تم بھی کیا یہاں قید تھے۔ مجھے بتاؤ شاہ زمان تم پر کیا گزری۔ تم نے پہلے بھی مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔'' مہہ وش نے شدید حیرانی سے پوچھا۔

''زندگی نے کبھی ہمیں مل کر بیٹھنے کا موقع دیا تو ضرور سناؤں گا۔ بس اتنا جان لو کہ میں صراط مستقیم سے بھٹک گیا تھا۔ شیطانی راستوں پر چل نکلا تھا دنیا سے انتقام لینے نکلا تھا اپنی ذات سے ہی انتقام لے لیا۔ غلط طریقہ اپنایا' اللہ اور قانون کا مجرم بن گیا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''اوہ مائی گاڈ۔'' مہہ وش نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ''مجھے یقین ہی نہیں آ رہا ہے۔''

تب ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور اس شخص کی شکل دکھائی دی جو مجھے یہاں لایا تھا۔ وہ بولا آپ کو کرنل صاحب بلا رہے ہیں۔'' تو میں مہہ وش کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ بمشکل چھڑاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا۔

کرنل صاحب کے روم میں پہنچا تو وہ ایک اسکرین پر نگاہ جمائے بیٹھے تھے ان کے کمرے میں بڑی سی ٹیبل پر کئی کمپیوٹر رکھے تھے پہلے جب میں یہاں آیا تھا تب یہ آف تھے لیکن اس وقت ایک کمپیوٹر کی اسکرین روشن تھی اور اس پر نگاہ پڑی تو میں بری طرح چونک گیا اس پر مہہ وش کے کمرے کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مہہ وش گھٹنوں میں منہ دیے سسکیاں لے رہی تھی۔

یعنی میں نے مہہ وش سے جو بھی باتیں کیں وہ کرنل صاحب یہاں بیٹھے ہوئے سب سن رہے تھے اور شاید مجھے یہ بات باور کرانے ہی کے لیے وہ ہر بات سے واقف ہیں انہوں نے اس اسکرین کو آن رہنے دیا پھر میری جانب مسکراتے ہوئے دیکھا اور میز پر موجود کوئی بٹن دبایا تو اسکرین آف ہوگئی۔ وہ مجھے معنی خیز انداز میں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ مجھ سے بولے۔

''مجھے تم سے کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے تم نے دیکھ ہی لیا اس کمرے میں ہونے والی ہر بات اور ہر منظر میں نے اسی کمرے میں بیٹھے بیٹھے دیکھ لیا ہے۔ اب تم بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو مہہ وش کو یہاں سے کہاں بھیجا جائے۔''

''کیا آپ واقعی مہہ وش کو یہاں سے جانے دیں گے۔ آپ کو اس کی بے گناہی کا یقین آ گیا۔'' میں نے غیر یقینی سے پوچھا۔

''ہاں۔'' انہوں نے مختصر جواب دیا تو میں سوچنے لگا۔ مہہ وش کو یہاں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ کیونکہ یہاں صرف مرد رہتے ہیں پھر مجھے سرمئی کا خیال آیا کہ ایک اسی کا گھر میرے لیے قابل اعتبار ہے۔ اس لیے میں نے کہا۔

''سر محترمہ سرمئی صاحبہ کا گھر ایسا ہے جہاں میں یہ اعتبار کر سکتا ہوں کہ مہہ وش وہاں باعزت طریقے سے رہ سکتی ہے وہ بھی اگر ان کی اجازت ہو ورنہ پھر جو آپ بہتر سمجھیں۔'' میں نے کہا۔

''بھئی سرمئی کا تم نے نام لیا ہے تو وہ تو خود اپنے گھر کی ہوگئی ہے۔ تین چار دن ہوئے اس کی شادی حشام کے ساتھ ہوگئی ہے۔'' کرنل صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا میری فائزہ کی شادی ہوگئی۔ میری گڑیا اپنے گھر چلی گئی۔'' میں خوشی سے بے اختیار ہو کر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے اپنے ہاتھ فضا میں اٹھا دیے۔ ''اس دن حشام نے بتایا ہی نہیں

کہ ان کی شادی ہے۔''

''ارے بس سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ سب ہی حیران تھے اس دن تو منگنی کی رسم ادا ہونی تھی۔ حشام نے ضد کی کہ منگنی نہیں نکاح کروں گا۔ پھر رات کو رخصتی کی ضد کر بیٹھا۔ سو یہ شادی انجام پذیر ہوئی۔''

''اللہ ہمیشہ خوش و خرم اور آباد رکھے دونوں کو' جو ہوا اچھا ہی ہوا۔'' میں نے ایک پرسکون اور مطمئن مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ میں اس سلسلے میں بات کرتا ہوں۔ اگر سرمئی کی اجازت ہوئی تو مہہ وش کو وہاں بھیج دیں گے لیکن تم البتہ یہیں رہو گے تمہارا ابھی باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔'' کرنل صاحب نے کہا۔

''بہت بہت شکریہ سر' آپ کا یہ احسان ہوگا ہم پر۔'' میں نے کہا اور مطمئن ہو کر باہر نکل آیا۔

❀......❀......❀

میں اپنے بیڈ پر لیٹی سوچوں میں گم تھی ابھی ابھی حشام کی کوئی ضروری کال آئی تھی وہ فون لے کر کمرے سے باہر چلے گئے ہیں۔ زندگی حشام کی سنگت میں اتنی حسین اور دلربا ہو جائے گی میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا ابھی میری شادی کو صرف چار ہی دن ہوئے تھے لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم برسوں سے ساتھ ہیں۔

حشام نے محبتوں کی انتہا کر دی ہے میں اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں سوچنے لگی کہ میرا رویہ حشام کے ساتھ کیسا تھا لیکن یہ حشام کی محبت اور استقامت ہی تھی کہ محبت کا یہ گداز جذبہ میرے دل کی سنگلاخ زمین سے ایک سرکش چشمے کی مانند پھوٹ نکلا۔ ہمارے درمیان ایک غیر مرئی سی ڈور تھی جس نے ہماری روحوں کو ایک بے عنوان سے بندھن میں باندھ دیا۔ اپنی پچھلی زندگی اور میرا وہ رویہ اب مجھے ایک خواب سا لگ رہا تھا۔

انکل اور آنٹی کی محبت سونے پر سہاگہ تھی آنٹی تو مجھے کمرے سے باہر آنے ہی نہیں دیتی تھیں کہ حشام ابھی گھر پر ہی ہے تم زیادہ سے زیادہ اس کے ساتھ وقت گزارو اور حشام بھی تو......! وہ تو کھانے کے لیے بھی بڑی مشکل سے باہر نکلتے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور حشام اندر آئے تو میں سوچوں کے حصار سے باہر نکل آئی۔ حشام خاصے سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے۔ موبائل انہوں نے ٹیبل پر رکھا اور بیڈ سے ٹانگیں لٹکائے ہوئے آدھے بیڈ پر لیٹ گئے۔ دونوں ہاتھ سر کے نیچے تھے اور نگاہیں چھت پر تھیں۔

''کس کا فون تھا؟'' میں نے ان کو سنجیدہ دیکھتے ہوئے قدرے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

''کرنل مشتاق کا۔'' حشام نے اسی طرح لیٹے لیٹے بغیر میری جانب دیکھے جواب دیا۔

''کیا کہہ رہے تھے' سب خیریت تو ہے ناں۔'' میں مزید تشویش سے حشام کے اوپر جھک کر بولی۔

''سب ٹھیک ہے میری جان' لیکن آج میری خیریت نہیں ہے کیونکہ تم اس گلابی نائٹی میں بہت قیامت لگ رہی ہو۔'' حشام نے تیزی سے اٹھ کر مجھے اپنی بانہوں میں لے کر شوخ لہجے میں کہا۔

''توبہ ہے حشام آپ نے تو میری جان ہی نکال دی۔'' میں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''خبردار اس جان کو یوں بات بات پر نکالا اب یہ جان میری امانت ہے۔'' حشام نے مجھے زور سے بھینچ ڈالا اور میری ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

''کیا کر رہی ہو امی بے دھڑک کمرے میں گھس آئیں گی کہ میں پتا نہیں تمہارا کیا حشر کر رہا ہوں'

ویسے بھی وہ میری جانب سے مشکوک ہی رہتی ہیں کہ میں ان کی پیاری بہو کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کر بیٹھوں۔" حشام نے جھٹ مجھے چھوڑ دیا اور معصوم سی شکل بنا کر بولے تو میرا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا اور حشام کی شوخی اور شرارت عروج پر پہنچ گئیں۔

"حشام اگر آپ باز نہیں آئیں گے تو میں آنٹی کے کمرے میں جا کر سو جاؤں گی۔" میں نے دھمکی دی تو سیدھے بیٹھ گئے اور بچوں کی طرح منہ پھلا لیا۔

چند منٹ انہیں منانے میں لگے پھر وہ بولے۔

"ابھی تم پوچھ رہی تھیں نا کہ کس کا فون تھا تو کرنل مشتاق نے فون کیا تھا اور وہ کہہ رہے ہیں کہ ایک لڑکی پکڑی گئی تھی اس کی لمبی کہانی ہے کبھی بعد میں سناؤں گا بس اتنا جان لو کہ وہ بے گناہ ثابت ہو رہی ہے لیکن پھر بھی اس کی جانب سے وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔ یہاں پاکستان میں اس کا کوئی گھر اور ٹھکانہ نہیں ہے اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ وہ یہاں ہمارے گھر آ کر رہے۔"

"کون ہے وہ؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہ محترمہ آپ کے نام نہاد بھائی ڈاکٹر شاہ زمان کی محبت ہیں۔ اس کا شوہر راوالوں کا آلہ کار نکلا ہے فی الحال تو وہ ہاتھ نہیں آیا۔ یہ محترمہ ہاتھ لگی ہیں اب شاہ زمان نے کرنل احتشام سے گزارش کی ہے کہ اس کو سرمئی کے گھر بھیج دیا جائے وہ وہاں محفوظ رہے گی۔ یہی بات پوچھنے کے لیے انہوں نے فون کیا تھا اب تم بتاؤ میں انہیں کیا جواب دوں۔" حشام نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"آپ کا کیا خیال ہے وہ بے گناہ ثابت ہو گئے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"ایک لحاظ سے کہہ سکتے ہیں لیکن وہ گناہ گار تو ہے قاتل بھی ہے ایک عالم دین کا قتل تو ثابت ہو گیا ہے اس کے علاوہ اس نے نواب سطوت کے کہنے پر اور بھی نجانے کتنے گناہ کیے ہوں گے اور وہ را کا آلہ کار بھی بنا یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس سے ملک کی سلامتی کے خلاف کام لیا جا رہا ہے اس نے وہ کام کیا۔ تمہیں پتا ہے جس وقت اسے پکڑا گیا تھا اس کے پاس سے کیا برآمد ہوا تھا۔ کہوٹہ پلانٹ کا نقشہ جو وہ را کے ایک ایجنٹ کے حوالے کرنے جا رہا تھا۔ اگر وہ یہ کام کر گزرتا تو تم خود سوچو کہ آگے کیا ہوتا۔" حشام انتہائی حد تک سنجیدہ تھے۔

"آپ نے ان سے ملاقات کی تھی نا۔" میرے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا تو حشام چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔ دیکھتے رہے کچھ بولے نہیں، میں نے نگاہیں جھکا لیں تو حشام بھاری لہجے میں بولے۔

"تمہارے ذہن میں یہ خیال کیسے آیا؟"

"وہ...... وہ...... حشام...... وہ...... میں اس رات آپ کو...... فو...... فون کر رہی تھی تو آپ کا فون بند آ رہا تھا تو میں سمجھ گئی کہ آپ شمروز بھائی سے ملاقات کے لیے گئے ہیں۔" میں نے گھبرائے ہوئے انداز میں اٹک اٹک کر جواب دیا۔

میرا جواب سن کر حشام خاموش رہے۔ چند لمحے سوچتے رہے پھر ایک گہری سانس لی اور بولے۔

"تم تو یہ بات جان چکی ہو کہ میرا تعلق ایک خفیہ ایجنسی سے ہے۔"

"جی۔" میں نے جھوٹ بولنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ میں حشام کے سامنے جھوٹ بولنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ شادی شدہ زندگی کامیاب ہی اس وقت ہوتی ہے جب دونوں ایک دوسرے سے کبھی بھی اور کسی بھی حالت میں جھوٹ نہ بولیں۔

"تمہیں کب اس بات کا علم ہوا؟" حشام بدستور سنجیدہ تھے۔

تو میں نے تمام باتیں انہیں بتا دیں تو وہ بولے۔

"تم نے مجھ سے پوچھا کیوں نہیں کہ میں نے تم سے یہ بات کیوں چھپائی۔"

"میں نے سوچا کہ آپ جب مناسب سمجھیں گے مجھے بتا دیں گے۔ اگر آپ کبھی نہ بتاتے تو میں کبھی آپ سے کہتی بھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"اف، میری فرمانبردار بیگم، آئی پراؤڈ آف یو، تم واقعی سمجھدار ہو۔" حشام میری جانب مسکراتے ہوئے بڑھے تو میں نے جھٹ ہاتھ سے انہیں روکتے ہوئے کہا۔

"دور بیٹھ کر بات کریں نہایت سنجیدہ موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے۔" تو وہ ہنس پڑے۔

"تو پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کرنل احتشام کا مشورہ بھی یہی ہے کہ فی الحال ہم اسے اپنے گھر میں رکھ لیں لیکن یہاں بھی اس کی حیثیت ایک مشتبہ کی ہوگی تمہیں اس پر گہری نگاہ رکھنی ہوگی۔ امی سے یہ سب کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

پھر حشام مجھے رئیس خان کے بارے میں بتانے لگے کہ کس طرح وہ پاکستان میں ایک دوسرا بہروپ بھر کر زندگی گزار رہا ہے۔

"اچھا جانو آج رات مجھے جانا ہوگا کرنل احتشام نے ایک اہم میٹنگ کال کی ہے کچھ اہم فیصلے کرنے ہیں اجازت ہے جناب کی۔" حشام نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا تو میں نے ہنس کر کہا۔

"اجازت ہے۔"

❀......❀......❀

سفیان کئی دنوں سے بے حد مصروف تھا ذرا دیر کے لیے سوتا تھا لیکن دماغ بے دار رہتا تھا۔ اس وقت حالات کچھ قابو میں آ گئے تھے تو وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ بستر پر لیٹا تو ایک بار پھر دل میں غزالہ کی یاد نے چٹکی لی۔ وہ لاکھ اپنے دل کو سمجھا رہا تھا کہ اب اس کے ہاتھوں میں کسی اور کے نام کی انگوٹھی سج گئی ہے وہ کسی اور کے نام سے اپنی ہتھیلیوں کو حنا کے رنگ سے سجائے گی لیکن وہ اپنے دل کے بے قابو جذبوں کے آگے ان منہ زور دھاروں میں بہے جا رہا تھا آج بھی......!

اس کا دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ وہ کسی اور کی کیسے ہو سکتی ہے۔ ایک دن پھر اس کا ملیح چہرہ ہنستا مسکراتا ہوا اسے گدگدا کے بے دار کرے گا۔ وہ کوئی بہت چمکیلی صبح ہوگی۔ یا کوئی سرمئی سی شام جب وہ کھلکھلاتی ہوئی اچانک سامنے آ جائے گی۔ یا پھر...... یا پھر...... وہ کوئی تاریک رات ہوگی وہ چاند کی مانند روشن روشن اسے دکھائی دے گی۔ ہو سکتا ہے کہ جب پورے چاند کی چاندنی میں ساری رات بھیگ رہی ہو اور وہ چاند سے اتر آئے۔

ایک دیوانی سی آس ہی تو تھی وہ سوچے جا رہا تھا غزالہ کی یاد کچھ اس طرح سے اسے ستا رہی تھی کہ اسے اپنے دل کی رگیں تناؤ کے باعث چٹختی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ دل کی بے تابی کچھ اس طرح بڑھی کہ اس کے منہ سے ایک کراہ کی صورت میں غزالہ کا نام نکل گیا تو وہ اس کے سامنے آن موجود ہوئی۔

اس کے لب خاموش تھے لیکن اداس آنکھیں دل کا سارا افسانہ بیان کر رہی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح اس کی کلائیوں میں کانچ کی ست رنگ چوڑیاں تھیں۔ وہ اپنے دودھیا ہاتھوں کی حنائی انگلیاں بے دردی کے ساتھ مروڑ رہی تھی۔ اس کی چوڑیوں کی مدہم اور مدھر

کھنک اسے وہ بھولے بسرے نغمے یاد دلا رہی تھی وہ نغمے ان کی تنہائیوں کے ساتھی تھے۔ ان کے بولوں میں ملن کی گھڑی کی چاپ تھی اور انتظار کی میٹھی میٹھی سی کسک تھی۔ کبھی اسے شہنائیوں کی گونج بھی سنائی دیتی۔ پھر اس کے گلابی ہونٹ دھیرے سے لرزے کانپے اور ان میں سے مدہم آواز نکلی وہ کہہ رہی تھی۔

''تم میری مجبوریاں نہیں سمجھ سکتے۔ میرے بس میں تو کچھ بھی نہیں رہا۔ اپنی بے بسی نے مجھے بہت رلایا ہے سفیان، تمہاری ان گہری نگاہوں نے تو ہمیشہ مجھے ایک ہی پیغام دیا کہ ''تم میری ہو؟''

تو پھر آج تم مجھے کسی اور کی اتنی آسانی سے کیسے ہونے دے سکتے ہو، آؤ سفیان آجاؤ...... آجاؤ نا...... آؤ سفیان۔

اور پھر ایک کرخت آواز گونجی اور لمحہ بھر میں سب کچھ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا اب وہاں نہ غزالہ تھی اور نہ ہی اس کی التجا تھی۔ بس فون کی کرخت بیل تھی جو مسلسل بجے جا رہی تھی۔

دوسری جانب کرنل احتشام کال پر تھے۔ اسے فوری طور پر بلایا گیا تھا۔ وہ سب کچھ بھول کر پوری طرح الرٹ ہوگیا۔ جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تولیہ سے رگڑ کر چہرہ صاف کیا لیکن آنکھوں کی سرخی نہ کم ہوئی پھر بالوں میں برش پھیرا ر تیز قدموں سے چلتا ہوا میٹنگ روم میں پہنچ گیا۔

وہاں اس سے پہلے ہی کافی سارے لوگ موجود تھے۔ حشام بھی آچکا تھا اور اسے آج کافی دنوں کے مد کرنل جاوید بھی دکھائی دیئے۔ سفیان انہیں اس قت یہاں دیکھ کر حیران تو ہوا لیکن کچھ کہا نہیں اس نے باآواز بلند سلام کیا اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گیا۔

''میرا خیال ہے سب لوگ آچکے ہیں اب ہم باقاعدہ اپنی میٹنگ کا آغاز کریں گے۔ ایک بات بتا دوں یہ بہت اہم میٹنگ ہے اس لیے آپ سب اپنے دماغوں کو پوری طرح حاضر رکھیں۔'' کرنل احتشام نے سفیان کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ شاید وہ کچی نیند سے بے دار ہو کر آیا ہے۔

''یس سر۔'' سب نے ایک آواز میں کہا۔

''جیسا کہ تمام حالات آپ سب کے سامنے ہیں ہمارے ملک میں بیرونی دہشت گردوں نے کتنی دہشت گردی پھیلا رکھی ہے یہ بات بھی آپ سب کے علم میں ہے کہ بیرونی طور پر اگر ہم دیکھیں تو یہود و نصاریٰ اور مشرکین آپ میں ایک دوسرے کے دشمن دکھائی دیتے ہیں لیکن جب بات اسلام کی آتی ہے تو یہ ساری طاغوتی قوتیں مل کر ایک ہو جاتی ہیں اور یہ بات آج کی نہیں ہے عرب میں جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کا نور پھیلانا شروع کیا تھا اس وقت سے یہ تینوں طاغوتی قوتیں اسلام کے خلاف بر سرپیکار ہیں۔ آج بھی جہاں بھی اور جب بھی انہیں اسلام اور اسلامی مملکت زور پکڑتی دکھائی دیتی ہے یہ اس کے خلاف ایک دوسرے کا ساتھ دیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔

آج پاکستان میں انہیں جب بھی یہ دکھائی دیتا ہے کہ یہاں مسلمان متحد ہو رہے ہیں تو یہ اپنے پھیلائے ہوئے ایجنٹوں کے ذریعے ملک میں بد امنی پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں معیشت میں نقصان پہنچایا، یہ ان کا سب سے پہلا حربہ تھا کچھ کمزور مسلمان ان کے دکھائے ہوئے ڈالرز اور نوٹوں کے لالچ میں آکر اپنے ملک میں ان کا آلہ کار بن گئے۔

بھارت کی بدنام تنظیم را جس کو بنایا ہی اسلام کے خلاف ہے یہودیوں کی تنظیم موساد درپردہ ایک ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں بھی موساد اور را کے بہت سے ایجنٹ ہیں۔ ہمارے ملک کے بہت سے شعبوں میں ایک مسلمان اور پاکستانی کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

جیسا کہ ابھی ہم نے را کے بہت سے ایجنٹ اور ان کے آلہ کاروں کو گرفتار کیا ہے۔

امریکا کی ایک تنظیم جس کا ہیڈ ایک یہودی ہے یہ بھی تمام اسلامی ممالک میں مسلمانوں کے خلاف ان کو سبوتاژ کرنے کی پلاننگ میں مصروف ہے۔ تمام تر دہشت گردی کی پلاننگ جو بھی اسلامی ممالک میں ہو رہی ہے وہ اسی کا کارنامہ ہے۔''

اتنا کہہ کر کرنل احتشام سانس لینے کو رکے اور سب کے اوپر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر بولے۔

''یقیناً یہ سب باتیں آپ لوگوں کے علم میں ہیں لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ بات کی تمہید باندھنا، آپ سب کو اس لیے بلایا ہے کہ ہم نے یہ جو مجرم پکڑے ہیں تمام تر ثبوتوں کے ساتھ تو آپ سب کا خیال ہے انہیں حکومت کے حوالے کرنا ہے یا......!''

''جہاں تک اس سارے معاملے کو میں نے دیکھا ہے اور سمجھا ہے بلکہ دیکھ رہا ہوں انہیں جیل بھیجنا بے کار ہے ان پر مقدمہ چلے گا۔ یہ جیل میں ہر طرح کی سہولتیں حاصل کر کے مزے سے رہیں گے اور پھر ایک دن......!'' حشام نے معنی خیز انداز میں ادھوری بات چھوڑ دی۔ اس لیے ان کا قصہ ہمیں ہی پاک کرنا ہوگا۔''

''اور رئیس خان عرف حبیب سلطان کے بارے میں آپ سب کا کیا خیال ہے۔ وہ آج صبح پانچ بجے کی فلائٹ سے دبئی واپس جا رہا ہے۔ پاکستان میں اس شخص کا اتنا اثر و رسوخ ہے کہ ہم اس پر کوئی بھی الزام ثابت کر بھی دیں تب بھی یہ صاف بچ نکلے گا لیکن کیونکہ یہ گناہ گار ہے تو......!'' کرنل احتشام نے پھر بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہاں بیٹھے سارے ہی لوگ سمجھدار تھے۔ ادھوری بات کا بھی مطلب بخوبی سمجھتے تھے۔ مکمل بات یہاں بھی نہیں کہی جاتی اس لیے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں کرنل احتشام نے سب کے چہروں پر نگاہ ڈالی۔ وہاں موجود ہر شخص کی آنکھیں انہیں یہ پیغام دے رہی تھیں کہ ہم آپ کا مطلب بخوبی سمجھ رہے ہیں اور آپ کے خیال سے متفق بھی ہیں۔

''ٹھیک ہے اس کا فیصلہ تو ہوگیا۔'' کرنل مشتاق نے مسکراتے ہوئے کہا اب بات آجاتی ہے ہمارے ملک کے نامی گرامی روحانی پیشوا جناب عزت مآب......!'' کرنل مشتاق کے لہجے میں طنز اتر آیا۔

''نواب سطوت صاحب کی، ان کے بارے میں کیا خیال ہے۔''

''ایک منٹ کرنل مشتاق۔'' کرنل جاوید نے پہلی مرتبہ لب کشائی کی تو سب ان کی جانب متوجہ ہوگئے۔

''ہم سب ان کے بارے میں یہاں بیٹھ کر فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے ہمیں وزارت داخلہ سے بات کرنا ہوگی اور ان کا فیصلہ وہیں ہوگا کیونکہ وہ لاکھوں لوگوں کا روحانی پیشوا ہے لاکھوں مریدین ہیں اگر ہم نے اس پر یوں ہاتھ ڈالا تو ملک میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا لوگ سڑکوں پر احتجاجاً نکل آئیں گے۔ ہڑتالیں ہوں گی ملک کی املاک کو نقصان پہنچایا جائے گا اور سارا ملک بند ہو جائے گا۔''

"اوکے۔" کرنل احتشام نے بھاری لہجے میں کہا۔ ان کے چہرے پر پھیلی ناگواری کسی سے چھپی نہ رہ سکی۔

چند لمحوں تک اس میٹنگ ہال میں خاموشی چھائی رہی پھر کرنل احتشام بولے۔

"آج کے اس آپریشن میں کون کون حصہ لے رہا ہے۔" انہوں نے ایک طائرانہ نگاہ سب پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ پھر کچھ وہاں موجود افراد کا نام لیا کچھ جو اس وقت میٹنگ میں حاضر نہیں تھے انہیں فوری طور پر بلوانے کا آرڈر دیا۔

ان کی اطلاع کے مطابق رئیس خان اپنی کلفٹن والی کوٹھی میں نہیں بلکہ ملیر کینٹ میں اپنے ایک دوست کے گھر موجود تھا اور آج صبح اسے وہیں سے ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہونا تھا شاید وہ وہاں اس لیے گیا ہو کہ ملیر کینٹ سے ایئرپورٹ زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔

آدھے گھنٹے کے اندر اس آپریشن میں حصہ لینے والے سب ہی افراد وہاں موجود تھے۔ ان سب کو سفیان کمانڈ کر رہا تھا حشام اور آصف کے علاوہ تقریباً پانچ دوسرے افراد تھے۔

سفیان نے آپریشن کا مکمل پلان سب کے سامنے رکھا ہر ایک نے اپنی ڈیوٹی سمجھ لی۔ پھر یہ لوگ ضروری تیاریوں کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگئے۔

ائرپورٹ کے قبرستان کی دیوار کے ساتھ سب نے دونوں اطراف سے اپنی اپنی پوزیشنز سنبھال لیں۔ دو بندے اس موڑ پر موجود تھے جہاں سے ایک سڑک جناح ایونیو کی جانب مڑتی ہے اس کو جیسے ہی رئیس خان کی گاڑی اس جانب آتی دکھائی دیتی وہ فوراً آگے موجود اپنے ساتھیوں کو اطلاع کر دیتا۔ صبح کے چار بجے تھے جب سفیان کے کان میں لگے آلے میں تھرتھراہٹ پیدا ہوئی اور اسے اس بات کا سگنل ملا کہ رئیس خان کی گاڑی جناح ایونیو پر مڑ چکی ہے۔ اس کے ساتھ ایک گاڑی میں اس کا سیکیورٹی دستہ ہے اور رئیس خان بلیک شیشوں والی گاڑی میں موجود تھے۔

رئیس خان کی گاڑی قبرستان کی دیوار کے ساتھ والے روڈ پر آئی اس پر دونوں جانب سے شدید ترین فائرنگ کی گئی۔ گارڈ کی گاڑی لڑکھڑائی اور رک گئی۔ اسے بھی گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔

رات کے اس پہر جب ساری دنیا خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی۔ شدید فائرنگ کی آوازیں سن کر لوگ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ لیکن خوف اور دہشت کے ان حالات میں کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اپنے گھر کے دروازے کھول کر باہر نکلتا۔

رئیس خان کی گاڑی کی باڈی گولیوں کے سوراخوں سے چھلنی ہو چکی تھی اور ساتھ ہی اس کے اندر بیٹھا ہوا رئیس خان اور ڈرائیور ملک عدم روانہ ہو چکا تھا۔

"آپریشن کمپلیٹ۔" سفیان کی آواز آئی اور پھر وہ سب تیزی کے ساتھ اپنی اپنی طے کردہ جگہوں پر روانہ ہوگئے۔

اس خونی واردات کے بیس منٹ کے بعد سائرن بجاتی ہوئی پولیس کی کئی گاڑیاں موقع واردات پر پہنچ گئیں ساتھ ہی نیوز چینل کے بہت سے نمائندے اپنے کمرے لے کر پہنچ گئے اور فوری طور پر ہر چینل پر یہ بریکنگ نیوز چلنے لگی۔

"ملک کے مایہ ناز صنعت کار حبیب سلطان ایک قاتلانہ حملے میں جاں بحق ہوگئے وہ دبئی جانے

کے لیے ایئرپورٹ جا رہے تھے کہ ائرپورٹ کے قریب قبرستان کے پاس ان کی کار پر اندھا دھند فائرنگ کی گئی۔ دہشت گردوں نے انہیں باقاعدہ گھیر کر پلاننگ کے تحت نشانہ بنایا ان کے حفاظتی دستہ کا بھی کوئی فرد زندہ نہیں بچا۔ جناب حبیب سلطان......وغیرہ وغیرہ۔

❀......❀......❀

میں فجر کی نماز کی ادائیگی کے لیے اٹھی برابر میں نگاہ پڑی تو حشام کی جگہ خالی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں وضو کر کے جائے نماز بچھا رہی تھی تب حشام کمرے میں داخل ہوئے۔

"اٹھ گئیں تم' سوری ڈیئر مجھے دیر ہوگئی تم پریشان تو نہیں ہوئیں۔" حشام نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔

"مجھے پتا ہی نہیں چلا میں تو گہری نیند سوگئی تھی۔" میں نے حشام کے چہرے پر نگاہ ڈالی جہاں ڈھیر ساری تھکاوٹ نمایاں تھی۔

"چلو اچھی بات ہے تم نماز سے فارغ ہو جاؤ تو ایک کپ اچھی سی چائے پلوا دو۔" حشام بیڈ پر پاؤں پھیلا کر لیٹتے ہوئے بولے۔

"بس تھوڑی دیر میں لائی۔" میں نے جواب دیا پھر حشام کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔

"رات مشتاق انکل مہ وش کو بھی لے کر آ گئے تھے۔"

"مہ وش۔" حشام نے غائب دماغی سے کہا پھر خود ہی انہیں یاد آ گیا تو بولے۔ "اوہ' اچھا اچھا وہ لڑکی' کس کمرے میں ٹھہرایا ہے اسے؟"

"امی کے برابر والے کمرے میں۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہیں یاد تو ہے نا اس کے سلسلے میں' میں نے تمہیں کیا ہدایات دی ہیں۔ کرنل مشتاق نے سخت تاکید کی ہے۔"

"مجھے یاد ہے حشام آپ بالکل بھی فکر نہ کریں۔" میں نے جواب دیا اور نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔ نماز سے فارغ ہو کر میں کچن میں جانے لگی تو حشام آنکھیں بند کیے لیٹے تھے میں نے اس خیال سے کہ کہیں وہ سو تو نہیں گئے تو انہیں دھیرے سے آواز دی میری آواز سن کر وہ چونک اٹھے۔

"نیند آ رہی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں فی الحال ابھی میرا سونے کا پروگرام نہیں ہے تم چائے پلواؤ۔" حشام نے کہا اور ٹی وی کا ریموٹ ہاتھ میں اٹھا لیا اور نیوز چینل لگا لیا۔ میں مزید وہاں نہیں رکی اور باہر آ گئی۔

حشام کے کہنے پر میں نے اپنے نیوز چینل پر جہاں میں اتنے دنوں سے چھٹیوں پر تھی اپنا استعفیٰ بھیج دیا تھا۔ فی الحال اس خبر کو میری اور حشام کی شادی ہوگئی ہے ہم نے نیوز چینل والوں سے پوشیدہ ہی رکھا تھا۔

میں باہر آئی تو آنٹی اور انکل بھی جاگ چکے تھے۔ آنٹی باہر تخت پر بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں اور انکل کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ وہ لان کی جانب سے آ رہے تھے کچن میں زینب بی موجود تھیں وہ چائے کی تیاری کر رہی تھیں۔ میں نے ان سے دو کپ چائے تیار کرنے کے لیے کہا تو انکل میری جانب چلے آئے انہوں نے حشام کے متعلق پوچھا پھر بولے۔

"بیٹا میں ایک ضروری بات تم سے کرنا چاہ رہا تھا۔" انکل کی بات سن کر آنٹی نے قرآن پاک بند

کردیا پھر میرے نزدیک آئیں اور میرے اوپر پھونک ماردی۔
"کبھی یہ عنایت ہم پر بھی کردیا کریں۔" انکل نے مذاق کیا تو آنٹی مسکرانے لگیں اور وہیں کرسی پر بیٹھ گئیں۔ شاید وہ بھی انکل کی بات میں حصہ لینے کے لیے آ گئی تھیں۔
"جی انکل آپ کچھ کہہ رہے تھے۔" میں نے کہا۔
"بیٹا میں اور تمہاری آنٹی یہ چاہتے ہیں کہ تم اب روشن بہن اور حمیدہ بہن کو یہیں بلالو۔ تمہارے آنے کے بعد اب دونوں گھر میں بالکل تنہا رہ گئی ہیں اور اب تو کرنل مشتاق نے آصف اور عثمان کو بھی وہاں سے بلوالیا ہے۔ میرا مطلب ہے وہاں کوئی سیکیورٹی بھی نہیں ہے۔ تمہیں بلیک میل کرنے کے لیے کہیں انہیں کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے اور ویسے بھی ان کا خیال وہاں اب کون رکھے گا۔ ہمارا اتنا بڑا گھر ہے وہ یہاں رہیں گی تو تمہاری آنکھوں کے سامنے رہیں گی اور تم بھی ان کی آنکھوں کے سامنے رہو گی اور ویسے بھی تمہاری آنٹی کو بھی ڈھیر ساری باتیں کرنے کے لیے دو سہیلیاں مل جائیں گی۔"
"تمہارے انکل بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیٹی میری بھی شدید خواہش ہے کہ وہ یہاں آجائیں۔ تم انہیں فون کردو وہ تیار رہیں میں گاڑی بھیج دوں گی۔" آنٹی نے کہا۔
میں انکل اور آنٹی کے اس خلوص اور محبت پر حیران رہ گئی۔ اس بات کا خیال تو مجھے رہ رہ کر ستا رہا تھا کہ امی اور اماں وہاں تنہا رہ گئیں ہیں۔ دونوں کو بلڈ پریشر اور شوگر کی بیماریاں ہیں کون ان کا خیال رکھے گا۔ مارے تشکر کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکی۔ میں اللہ کی دی ہوئی کس کس نعمت کا شکر ادا کروں میں تو ناشکری تھی۔ صرف ایک بات کو لے کر اللہ سے شکوہ کرتی رہتی تھی لیکن اس مہربان رب نے صرف ایک رشتے کے عوض اتنے پیار کرنے والے اور خیال کرنے والے لوگ مجھے عطا کردیے جنہیں میری چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا کتنا احساس ہے۔ میں اللہ کا جتنا شکر بھی ادا کروں کم ہے۔
"کیا سوچنے لگیں بیٹا۔" انکل نے میرا جھکا ہوا سر اور لب خاموش دیکھے تو بولے۔
"انکل...... آنٹی......!" میں بس کپکپاتے لبوں اور بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ اتنا ہی کہہ سکی۔
"آج سے تم ہمیں انکل آنٹی نہیں بلکہ حشام کی طرح ڈیڈی اور ممی کہو گی۔" انکل نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔
"لیکن میں آپ کو ڈیڈی نہیں کہوں گی مجھے ڈیڈی اچھا نہیں لگتا۔" میں نے کہا تو انکل ہنس پڑے اور بولے "بالکل ٹھیک تم آج سے مجھے ابو ہی کہنا۔"
پھر میں نے امی کو بڑی مشکل سے یہاں آنے کے لیے راضی کیا۔ انہیں فکر تھی کہ گھر کے سامان کا کیا ہوگا تو میں نے کہا سامان وغیرہ سارا بند کردیں اپنی ضروری چیزیں سمیٹ لیں میں ڈرائیور کو بھیج دوں گی۔
پھر خیال آیا کہ حشام چائے کا انتظار کررہے ہوں گے میں چائے لے کر گئی تو وہ نیوز چینل لگا کر اس خونی واردات کی تفصیلات دیکھ رہے تھے۔ جس میں دہشت گردوں نے ایک صنعت کار کو اس کے ڈرائیور اور گارڈز سمیت ہلاک کرڈالا تھا۔

❀....❀....❀

جب یہ بات میرے علم میں آئی کہ حبیب سلطان کو ایئر پورٹ جاتے ہوئے ہلاک کردیا گیا ہے تو میں نے سکون کا سانس لیا اب میری مہہ وش آزاد تھی۔ میں نے لمحہ بھر میں اپنی زندگی کے کئی حسین خواب بن لیے۔ میں بھی بھاگتے بھاگتے تھک گیا تھا۔ اب میرا ارادہ تھا کہ مہہ وش کو اپنے ساتھ لے کر کسی دور افتادہ مقام پر چلا جاؤں گا اور ہم اپنی ایک پیار بھری زندگی کا آغاز کریں گے۔ میرے بینک اکاؤنٹ میں اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ میں کوئی چھوٹا موٹا بزنس شروع کردوں گا۔ یا پھر اپنا کلینک کھول لوں گا جس طرح بھی اللہ نے میرے روزگار کا ذریعہ میری تقدیر میں لکھا ہوگا میں ویسے ہی روزی کماؤں گا لیکن ایمانداری کے ساتھ حق حلال کھاؤں گا۔ ہمیں اب کسی دشمنی کا خوف نہ ہوگا نہ وہاں کوئی راجہ ہوگا نہ رئیس خان اور شیر افضل۔
مہہ وش مجھ سے میری زندگی کے بارے میں پوچھ رہی تھی کہ اتنے عرصہ میں کیا کرتا رہا کس طرح زندگی گزاری لیکن میرے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنے منہ سے وہ سب اس کے آگے بیان کردوں۔ میں یہاں دن رات فارغ رہتا تھا میرے ذمہ کوئی بھی کام نہیں تھا تو سوچا کہ کیوں نہ اپنی زندگی کے بارے میں سارا کچھ تحریر کردوں۔ میں اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی اپنی داستان اپنے جرائم اور گناہوں کا اقرار نامہ اسے دکھاؤں گا۔ وہ چاہے تو مجھ سے شادی کرلے نہ چاہے تو ایک مجرم اور گناہ گار سمجھ کر مجھے دھتکار دے۔ مجھے اس کا ہر فیصلہ منظور ہوگا اور پھر میں نے اپنی داستان لکھنے کا آغاز کردیا۔

❀....❀....❀

کرنل احتشام سے کرنل جاوید نے کہا کہ انہوں نے وزیر داخلہ سے ٹائم لے لیا ہے۔ کل رات نو بجے کا وقت طے ہوا ہے ملاقات کے لیے۔ آپ اپنی ٹیم ممبران کے نام بتادیں جو آپ کے ساتھ ہوں گے تاکہ انہیں انفارم کیا جاسکے۔
کرنل احتشام نے اپنے ساتھ کرنل مشتاق، حشام اور سفیان کو لے جانے کا فیصلہ کیا اور کرنل جاوید کو تینوں نام دے دیے۔
کرنل جاوید اصل میں حکومت کے نامزد کردہ شخص تھے۔ اس بات کا علم کرنل احتشام سمیت کسی کو بھی نہیں تھا کہ اصل میں کرنل جاوید حکومت کے آدمی ہیں۔
مقررہ وقت پر چاروں افراد وزیر داخلہ رسول بخش صاحب کے آفس پہنچے اور پھر اس اہم میٹنگ کا آغاز ہوا۔
کرنل احتشام نے کھل کر نواب سطوت کی سرگرمیوں سے آگاہ کیا۔ دوران گفتگو اہم شخص شمروز خان کا نام بھی آیا۔ جو نواب سطوت کے خلاف اہم گواہ تھا۔ جو رنگے ہاتھوں کہوٹہ کے نقشے سمیت پکڑا گیا تھا جو وہ کمل راؤ عرف اشرف علی کو دینے کے لیے جارہا تھا۔
وزیر داخلہ نے کرنل احتشام کی ساری گفتگو پورے اطمینان سے سنی پھر مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہا۔
"آپ کو حبیب سلطان کے خلاف کارروائی کرنے سے پہلے ہمیں اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔ لیکن خیر......!" کرنل احتشام جواب میں خاموش رہے۔
حشام نے بھی اپنی مرتب کردہ رپورٹ وزیر داخلہ کے سامنے پیش کی اور یہ بھی بتایا کہ اس رپورٹ کی تیاری کے سلسلے میں اسے کس قسم کا اور کتنا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔
را کے ایجنٹوں سے تفتیش کے بعد جو رپورٹ

سفیان نے مرتب کی تھی وہ بھی وزیر داخلہ کے سامنے پیش کی۔

تمام گفتگو سننے کے بعد رسول بخش نے جواب دیا کہ ہم اس سلسلے میں بہت سوچ سمجھ کر ایک پلان مرتب کریں گے اور سوچ سمجھ کر نواب سطوت پر ہاتھ ڈالیں گے کیونکہ نواب سطوت کوئی عام شخص نہیں ہے اگر اس کے خلاف کوئی کھلی کارروائی کی گئی تو اس کے نتائج ملک کی اندرونی صورت حال کے لیے بہتر نہیں ہوں گے۔"

یہ اہم میٹنگ پورے تین گھنٹے جاری رہی جب یہ لوگ وہاں سے اٹھے تو ذہنی طور پر مطمئن نہیں تھے وزیر داخلہ کی جانب سے انہیں بہت حوصلہ افزا جواب نہیں ملا تھا۔

میٹنگ برخاست ہوگئی۔ آنے والے افراد وہاں سے جا چکے تھے۔ اس وقت اپنے دفتر میں صرف رسول بخش تنہا تھے۔ اس کے باہر کھڑے سیکیورٹی گارڈ کو بلا کر ہدایت کی کہ مجھے فی الحال ڈسٹرب نہ کیا جائے میں بہت اہم کام میں مصروف ہوں۔ پھر اس نے فون اٹھا کر اہم اور خاص نمبر ڈائل کیا۔ یہ وہ فون لائن تھی جس کی گفتگو کہیں اور سنی نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے نواب سطوت کے خاص نمبر پر ڈائل کیا تھا۔

❀......❀......❀

ان دنوں حشام اور سفیان کی مصروفیات کافی بڑھ گئی تھیں۔ ملک دشمن عناصر ان لوگوں کے قبضے میں بمعہ ثبوتوں کے لیکن وزیر داخلہ نجانے کن مصلحتوں کی بنا پر کہہ رہے تھے کہ ابھی یہ بات میڈیا پر ظاہر نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ جو لوگ را کے ایجنٹ اور موساد کے آلہ کار پکڑے گئے تھے وہ سب کے سب اس ملک میں ایک معزز شہری بن کر زندگی گزار رہے تھے۔ دوران تفتیش ان لوگوں کے اور بھی پردہ نشینوں کے چہروں سے نقاب اٹھائے تھے۔ سونالی عرف فیروزہ...... خاص طور پر اس بدکردار عورت کے پاس تو بہت ہی اہم شخصیات کی بدکرداریوں کے ثبوت تھے۔ وزیر داخلہ اس کے معاملے میں بھی چپ سادھ گئے۔

"اس ملک کے حالات کیوں کر سدھر سکتے ہیں جن کے کرتا دھرتا خود اپنے ملک کو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر تھالی میں رکھ کر دوسروں کو پیش کر رہے ہوں۔ وہ نام لیتے ہیں اسلام کی اور وطن پرستی کی۔ غریبوں کے ہمدرد اور خیر خواہ ہونے کی۔ وہ غریب جن کے ووٹ لے کر وہ ایوان اقتدار میں براجمان ہیں آج ان کی مٹی کا سودا کر بیٹھے ہیں۔"

کرنل احتشام بے قراری کے عالم میں ٹہلتے ہوئے شدید غصے کے عالم میں کہہ رہے تھے۔

"ہمارے تو ہاتھ باندھ دیے گئے ہیں۔ اب بتاؤ ہم کیا کریں۔" انہوں نے اپنے ایک ہاتھ کی مٹھی دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر سختی کے ساتھ مارتے ہوئے کہا۔

"سر ان کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ لوگ ہمارے قبضے میں ہیں۔" سفیان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"تمہارا مطلب کیا ہے؟" انہوں نے کہا۔

"سر نواب سطوت کے بارے میں تو ہم میڈیا پر چند ثبوت دے سکتے ہیں۔ اس کی اصلیت لوگوں کے سامنے آئے گی تو وہ لوگ خود اس سے منحرف ہو جائیں گے۔ ہمارا روشنیوں کا شہر کراچی جس میں آج لوٹ مار، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے کہیں امن و چین نہیں ہے۔ ہم جان چکے ہیں کہ اس تمام بدامنی اور قتل و غارت، بم بلاسٹ، ٹارگٹ کلنگ کا ماسٹر

مائنڈ کون ہے تو پھر ہم انہیں کیسے زندہ چھوڑ سکتے ہیں۔ آج لوگ برملا یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ان تمام کارروائیوں کے پیچھے خود ایجنسیوں کا ہاتھ ہے۔ پولیس میں جب راہول شرما عرف بابر جمالی جیسے لوگ ہوں گے تو خود سوچیں کہ پولیس کیسے قابل اعتماد ہو سکتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ محکمہ پولیس کے حمام میں سب ہی ننگے ہیں۔ ان میں فرض شناس افسران بھی ہیں لیکن وہ بے چارے ان مفاد پرستوں اور جرائم کے فروغ میں ملوث افسران کے آگے اپنی نوکری بچانے کے لیے مجبور اور بے بس ہو جاتے ہیں۔

یہاں آئے دن لوگ نامعلوم افراد کی گولیوں کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ بہت سی لاشیں اِدھر اُدھر پڑی مل جاتی ہیں تو پھر ان کو بھی نامعلوم افراد کی گولیوں کا نشانہ بنا کر ان کی لاشیں بھی کسی کچرا کنڈی میں پھینک دیتے ہیں۔ ڈھونڈ ہی لے گی پولیس کل سویرے ان تشدد زدہ ناقابل شناخت لاشوں کو اور لاوارث سمجھ کر خیراتی ادارے ان کا کریا کرم کر دیں گے۔'' حشام زہر خند لہجے میں بول رہا تھا۔

حشام کی بات سن کر کرنل احتشام اور سفیان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک اور لبوں پر ایک پر اسرار مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

''او کے بوائز۔ پھر اس سارے گیم کا جلد ہی دی اینڈ ہو جانا چاہیے۔'' کرنل احتشام نے کہا۔

''میرا خیال ہے سر اس کام کو ہیبت خان بہت بہتر طریقے سے انجام دے سکتا ہے۔ جس طرح ہم نے اپنی عدالت میں حبیب سلطان کی موت کا فیصلہ سنایا تھا اسی طرح آج ہماری عدالت ان کی موت کا فیصلہ بھی سناتی ہے۔'' سفیان نے کہا۔

اور پھر دو تین دن پھر پولیس کو لاوارث لاشیں کچرا کنڈیوں میں ملتی رہیں۔ ان کے چہرے ناقابل شناخت تھے۔ بہرحال ان کے بارے میں یہ پتا چلا ہے کہ وہ ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔

حشام نے نواب سطوت کے بارے میں بھی خفیہ ذرائع سے اپنی چند رپورٹس بھجوائیں جن کا میڈیا پر چلتے ہی ہر جانب ہاہا کار مچ گئی۔ اس سلسلے میں جب نواب سطوت سے بات کی گئی تو اس نے ٹی وی پر آ کر بیان دیا۔

''یہ اس کے خلاف بہت بڑی سازش کی گئی ہے۔ کیونکہ بہت سی خفیہ ایجنسیوں کے افراد اس کے پاس آئے اسے بہت بڑے بڑے لالچ دیے گئے لیکن اس کا تعلق پیروں کے خاندان سے ہے اس کی جڑیں اور بنیاد اسی وطن کی مٹی میں ہے۔ اس کی اپنی ذاتی جاگیر اور جائیداد اتنی زیادہ ہے کہ وہ اس کو استعمال بھی نہیں کر سکتا بلکہ اس کا ایک روحانی سینٹر خود اس کے اپنے پیسے سے چل رہا ہے۔ کیا کوئی فرد ایسا ہے جو میڈیا پر آ کر یہ کہہ دے کہ اس نے نواب سطوت کے روحانی سینٹر کے لیے کبھی کوئی چندہ دیا ہے سیکڑوں نہیں ہزاروں خاندانوں کو نواب سطوت کی ذاتی جیب سے ایک خطیر رقم ماہانہ دی جاتی ہے۔ کوئی اس پر کتنے ہی اوچھے الزامات لگائے اس کے کردار پر کتنے ہی گندے چھینٹے اڑاتے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے تو جان سے مارنے کی دھمکیاں بھی دی جاتی ہیں۔ لیکن میں کسی سے نہیں ڈرتا موت اپنے وقت پر آئے گی۔''

میڈیا پر نواب سطوت کے اس انٹرویو کے بعد اگلے دن نواب سطوت اور رسول بخش کی ایک اہم اور خفیہ ملاقات ہوئی اور مزید آگے کا لائحہ عمل طے کیا گیا۔

شاہ زمان کو تو جیسے سب بھول ہی گئے تھے۔ اسے

چیدہ چیدہ خبریں ملتی رہتی تھیں۔ وہ دن رات اپنی سوانح حیات لکھنے میں مصروف تھا۔ تب کرنل مشتاق اور کرنل احتشام نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے یہاں سے جانے کی اجازت دے دی جائے۔ اسے جب اپنی آزادی کی نوید ملی تو اس نے کہا کہ سر میں کہاں جاؤں میرا تو کوئی گھر بھی نہیں ہے اور ویسے بھی مجھے ابھی چند دن اور درکار ہیں میں اپنی زندگی کے حالات لکھ رہا ہوں تا کہ مہہ وش کو میرے بارے میں ساری آگہی ہو اور وہ خود فیصلہ کر سکے کہ آیا وہ میرے جیسے شخص کے ساتھ شادی کے لیے تیار ہے یا نہیں کیونکہ اس نے تو ڈاکٹر شاہ زمان سے محبت کی تھی لیکن آج اس کے سامنے شمروز خان ہے۔ جس کے دامن پر خون کے داغ بھی ہیں اور بدکرداری کے بھی۔''

حشام نے شاہ زمان کی داستان مکمل ہونے کے بعد سب سے پہلے اس کی اجازت سے پڑھی اور فیصلہ کیا کہ وہ شاہ زمان کو اپنے گھر لے جائے گا اور خود اپنے ہاتھوں اس کی اور مہہ وش کی شادی کرے گا۔

ابھی شاہ زمان ہیڈ کوارٹر میں تھا کہ وزیر داخلہ کا کرنل احتشام کے پاس فون آیا اور انہوں نے حکم دیا کہ شمروز نامی شخص کو آپ نے کیوں ابھی تک قید کر رکھا ہے۔ اس نے وطن عزیز کے لیے بہت اہم کارنامہ سر انجام دیا ہے حکومت کی جانب سے اسے انعام کے لیے فرنشڈ فلیٹ دیا جا رہا ہے جہاں رہ کر وہ اپنی ایک آزاد خود مختار نئی زندگی کا آغاز کر سکتا ہے۔

کرنل احتشام نے یہ خوش خبری شاہ زمان کو سنائی تو اس نے اللہ کے آگے سجدہ شکر ادا کیا۔

پھر ایک سرکاری محکمہ کا بندہ ایک فلیٹ کی چابی ایک سوزوکی کار اور ایک خطیر رقم کا تھیلا لے کر کرنل صاحب کے پاس آیا۔

شاہ زمان بہت زیادہ خوش تھا اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے فلیٹ میں منتقل ہونے سے پہلے مہہ وش سے ایک ملاقات کرے اور اپنی لفظ لفظ حقائق پر مبنی زندگی کی داستان اسے پیش کرے اور پھر آگے جو بھی فیصلہ مہہ وش کا ہو۔

شاہ زمان حشام کے ہمراہ اس کے گھر گیا۔ جہاں دو ماہ کے بعد وہ مہہ وش کو دیکھ رہا تھا اسے یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ مہہ وش کا سابقہ حسن لوٹ آیا تھا۔ شاہ زمان نے جب اس کے آگے یہ شرط رکھی کہ تم میری داستان حیات پڑھ کر فیصلہ کرو کہ میں تمہارے قابل ہوں یا نہیں تو اس نے پہلے ہی شاہ زمان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

وہ آج بے حد خوش تھا اسے اپنی کھوئی ہوئی خوشیاں اور خاندان پھر سے مل گیا تھا۔ بہن بھائی اور ماں باپ کے روپ میں حشام کی فیملی تھی اور مہہ وش اس کا پیار اسے دوبارہ مل جائے گا وہ سوچ سوچ کر ہی خوشی سے کانپ رہا تھا۔

وہ رات کو خوشی خوشی اپنے نئے فلیٹ میں شفٹ ہو گیا۔ اسے آج اتنی گہری نیند آئی تھی جیسے وہ بھی ماں کی آغوش میں سر رکھ کر مطمئن ہو کر سوتا تھا۔

❀ ❀ ❀

وہ اسلامی مہینے کی تیسری جمعرات تھی اس رات نواب سطوت اپنے روحانی سینٹر میں محفل کرتا تھا بہت سے سائل اپنی اپنی مرادیں لے کر آیا کرتے تھے۔ آج کی رات نواب سطوت نے اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے میڈیا والوں کو بھی دعوت دی تھی۔

محفل اپنے عروج پر تھی نواب سطوت تصوف پر پر اثر تقریر کر رہا تھا کہ اچانک ہی ایک زوردار دھماکہ ہوا اور ہر جانب چیخ و پکار مچ گئی۔ دھوئیں کے بادل اور

بارود کی بوفضا میں پھیل گئی۔ فضا آہ وفغاں سے لرزنے لگی۔ جس کا جس جانب منہ اٹھ رہا تھا وہ بھاگ رہا تھا۔

معلوم ہوا کہ نواب سطوت کے روحانی سینٹر پر بم بلاسٹ ہوا ہے۔ عمارت کا پچھلا حصہ دھماکے سے زمین پر آ گیا۔ اس سمت جتنے لوگ تھے وہ سب لقمہ بن گئے بہت سے زخمی ہوئے۔

ہر زبان پر تھا ”سرکار سائیں کیسے ہیں۔“ لیکن یہ کسی کو پتا نہیں چل رہا تھا تقریباً چار گھنٹوں کے بعد نواب سرکار سائیں کی خیریت کی اطلاع ملی کہ وہ معمولی زخمی ہوئے ہیں۔ اللہ نے اپنے نیک اور خدا ترس انسان کو بچالیا۔

ساری سرکار حرکت میں آ گئی۔ میڈیا ایک بار پھر زخمی نواب سطوت کو ٹی وی پر دکھا رہا تھا کہ نواب صاحب کو مارنے کی کوششیں کی جارہی ہیں لیکن وہ کسی کی بھی دھمکیوں میں آنے والے نہیں ہیں۔ ماضی میں بھی کئی مرتبہ ان پر قاتلانہ حملے ہوئے ہیں لیکن اللہ انہیں ہمیشہ بچالیتا ہے۔

ایک بار پھر کلفٹن والی کوٹھی پر رسول بخش خفیہ طور پر پہنچا وہ نواب سطوت کے خاص کمرے میں اس کے ساتھ مے نوشی میں مصروف تھا اور کہہ رہا تھا۔

”دیکھی نواب صاحب آپ نے میری پلاننگ‘ اب چاہے کوئی آپ کے خلاف کتنے ہی ثبوت اکٹھے کر لائے عوام کی ٹوٹل ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ تو خود مظلوم ہیں۔ ظلم کے معنی کیا جانیں۔“ اور وزیر داخلہ کی تمام باتیں سن کر نواب سطوت مسکراتا ہوا سر ہلاتا رہا پھر گہرے پراسرار لہجے میں بولا۔

”میرا شکار کہاں ہے؟ شیر کچھار سے نکلا یا نہیں؟“

”آپ کی ہدایت کے مطابق تمام کام ہوگیا ہے۔“ رسول بخش نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

”بس یار تمہاری یہی سعادت مندی تو مجھے اچھی لگتی ہے میں نے یوں ہی تو تمہیں اس جگہ نہیں لا بٹھایا ہے ایک وہ احمق تھا اس کے سر پر وطن پرستی کا بھوت سوار ہوگیا۔ چلو جو ہوا اچھا ہی ہوا‘ ورنہ میں نے تو اس کے لیے بہت کچھ سوچ رکھا تھا بڑا اچھا لگتا تھا یار وہ مجھے۔“ نواب سطوت نے گہرے نشے میں ڈوبے ہوئے کہا۔

”پھر شیر کا کیا کرنا ہے قید کرنا ہے یا آزاد؟“ رسول بخش کا لہجہ کسی خادم کا سا تھا۔

”شیروں کو آزاد ہی کردو تو بہتر ہے۔“ نواب سطوت نے اپنی گہری سرخ آنکھیں بمشکل کھول کر کہا اور دھیرے سے ہنس دیا۔

❀……❀……❀

سفیان ابھی میٹنگ سے ہو کر آیا تھا وہ سب حیران تھے کہ نواب سطوت کے روحانی سینٹر پر بم بلاسٹ کس نے کروایا۔

”ہوسکتا ہے کہ را والوں نے یہ کارستانی کی ہو انہوں نے سوچا ہوگا کہ کہیں نواب کے ہاتھ آتے ہی مزید راز نہ فاش ہوجائیں لیکن انہیں کیا پتا کہ……!“ سفیان نے غصہ سے کہا۔

بہت سے کام سمٹ گئے تھے۔ فی الحال کوئی ٹینشن نہیں تھی وہ شاہ زمان کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اتنے عرصہ کے بعد اسے اس کی محبت مل گئی ہے۔ نصیب میں جن کے ملنا لکھا ہوتا ہے وہ یوں بھی مل جایا کرتے ہیں۔ حشام نے بتایا تھا کہ شاہ زمان اور مہہ وش کی ذات اب تمام شک و شبے سے آزاد ہے وہ اور سرمئی ان دونوں کی جلد ہی شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ شاہ زمان کو ایسا لگ رہا ہوگا جیسے جلتے صحرا میں ننگے پاؤں چلنے کے بعد اسے ٹھنڈی اور پرسکون چھاؤں مل گئی ہو‘ ایک وہ بدنصیب ہے وہ بچپن سے ہی اپنی آنکھوں میں اس کے خواب دیکھتا آیا تھا۔ اسے آج بھی یاد تھا کہ جب وہ اور سب بچے مل کر کھیلا کرتے تھے تو وہ اور غزالہ مل کر ایک گھر بنایا کرتے تھے اور غزالہ ہمیشہ اس کی گھر والی بنا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ محلے کے ایک بچے نے یہ کہہ دیا تھا کہ سفیان تم ہمیشہ غزالہ کو اپنی گھر والی بناتے ہو آج میں غزالہ کا گھر والا بنوں گا اور پینو تمہاری گھر والی تو سفیان کو یہ سن کر بے حد غصہ آیا تھا کہ غزالہ اس کے سوا کسی اور کی گھر والی کیسے بن سکتی ہے اور غصے میں اس نے اس بچے کا مار مار کر بھرکس نکال دیا تھا پھر اس کو ابا نے ایک ٹانگ پر آدھے گھنٹے کھڑے رہنے کی سزا دی تھی اور ایک وقت کا کھانا بند کردیا تھا لیکن اسے اتنی ذرا سی سزا سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا وہ تو یہ سوچ کر خوش تھا کہ اس نے اس لڑکے کو ایسی بات کہنے کی سزا دے دی تھی پھر آئندہ سے ابا اور بے بے نے انہیں ایسے کھیل کھیلنے سے منع کردیا تھا اور یہ بات آج تک اس کے دل و دماغ میں رچ بس گئی تھی کہ غزالہ صرف اس کی ہے اور صرف اس کی گھر والی بنے گی۔

وہ کس طرح یہ سوچ کر جیے گا کہ اس کی غزالہ کا گھر والا کوئی اور ہو۔ وہ کسی اور کے بچوں کی ماں بنے‘ کوئی اور اس کے غزالہ کے سیب جیسے رخساروں کو چھوئے کوئی اور اس کے گھنے بالوں کی چھاؤں میں سوئے۔

وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ پھر سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ دماغ کی رگیں پھٹی جارہی تھیں۔ یہ ظالم سوچیں کیوں نہیں اس کا پیچھا چھوڑ دیتیں۔ مجھے کیا حق ہے اب اس کے بارے میں سوچنے کا اس نے اپنے بال اپنی مٹھیوں میں سختی کے ساتھ جکڑ لیے۔ وہ کسی اور کا نصیب ہے۔ دماغ بار بار سرزنش کررہا تھا۔

نصیب……تقدیر……کیا ہے یہ نصیب……کون لکھتا ہے یہ تقدیر؟ اندر سے آواز آئی……اللہ۔

اگر اللہ تقدیر لکھتا ہے تو کیا وہ تقدیر بدلنے پر قادر نہیں ہے ہاں وہ ہر شے پر قادر ہے۔ قرآن پاک میں پڑھی ہوئی یہ آیت بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آرہی تھی کہ ان اللہ علی کل شئی قدیر۔

اور تقدیر کو کیا چیز بدل دیتی ہے۔ پھر اندر سے آواز آئی۔ ”دعا“ دعا مومن کا ہتھیار ہے۔ یہ اللہ کے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ وہ پرامید ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ آدھی رات کو اللہ بھی اپنا ہاتھ زمین کی جانب پھیلا دیتا ہے کہ کوئی ہے جو مجھ سے مانگے اور میں اسے عطا کروں۔

وہ ایک نئے عزم اور یقین کے ساتھ اٹھا۔ وضو کیا اور نفل نماز حاجت کی نیت باندھ کر عاجزی اور انکساری سے اپنے آقا‘ مالک اور معبود کے آگے کھڑا ہوگیا۔

سلام پھیر کر وہ بے ساختہ سجدے میں گر پڑا۔ وہ رو رہا تھا مچل رہا تھا تڑپ رہا تھا اپنے رب سے فریاد کررہا تھا۔

”یارب اگر غزالہ میرے نصیب میں نہیں ہے تو اس کا خیال بھی میرے دل و دماغ سے نکال دے۔ ورنہ اسے مجھے عطا کردے۔ تو مجھ سے زیادہ میرے دل کا حال جانتا ہے۔ یا قادر تو ہر شے پر قادر ہے۔ تقدیر لکھی بھی تو نے ہے اور اس کو بدلنے پر بھی تو ہی قادر ہے۔“

نجانے کتنی دیر وہ فریاد کرتا رہا۔ حد یہ کہ اذان فجر

کان میں آئی تو وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اتنا رو لینے سے اور اللہ کو اپنا وکیل بنا لینے کے بعد اسے قلبی اطمینان حاصل ہوا تھا۔ اس نے پوری توجہ سے اذان سنی اور اذان کا جواب دیا۔ پھر اذان کی دعا کر کے وہ مسجد چلا آیا۔

نماز کے بعد وہ آ کر سو گیا۔ پھر فون کی بیل سے اس کی آنکھ کھلی۔ دیکھا تو سفینہ کا فون تھا۔

''ہاں سیفی بولو۔'' اس نے نیند کے خمار سے بوجھل لہجے میں کہا۔

''کیا بھائی ابھی تک سو رہے ہو آج تمہیں کوئی کام نہیں ہے۔'' اس نے حیرت سے کہا۔

''ہاں آج فارغ ہوں۔ تم سناؤ گھر میں سب خیریت ہے نا بے بے کیسی ہیں؟'' وہ کہنی کے بل اٹھ کے بیٹھ گیا۔

''بھائی وہ...... وہ بھائی......!'' سفینہ بات کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

''کیا بات ہے سفینہ...... تم کچھ پریشان ہو۔'' اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''وہ بھائی بات دراصل یہ ہے۔'' وہ پھر رک گئی۔

''بتاؤ نا سیفی میں پریشان ہو رہا ہوں۔'' وہ پوری طرح سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''اچھا بھائی یہ بتاؤ تم چھٹی لے کر گھر آ سکتے ہو کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''کیوں، گھر میں سب خیریت تو ہے ناں؟''

''بے بے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ تمہیں بہت یاد کر رہی ہیں۔ آج ہو سکے تو تم چھٹی لے کر فوراً گھر آ جاؤ۔'' سفینہ نے کہا۔

ماں کی بیماری کا سن کر سفیان تڑپ اٹھا اور اس نے سفینہ سے کہا کہ وہ کرنل صاحب سے چھٹی کی بات کرے گا اور آج ہی کرے گا۔ اگر چھٹی مل گئی تو وہ کل ہی یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔

دوپہر کو سفیان نے کرنل صاحب کے آفس میں جا کر ملاقات کی اور انہیں اپنا مسئلہ بتایا۔

کرنل صاحب چند لمحے تک کچھ سوچتے رہے پھر بولے۔ ''ٹھیک ہے تم جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ کوئی ایمرجنسی ہوئی تو تمہیں کال کر لی جائے گی۔ ویسے بھی تم کافی عرصہ سے اپنے گھر نہیں گئے ہو اور اس وقت تمہاری ماں کو تمہاری شدید ضرورت ہے۔ یہاں کے مسئلے مسائل ہم دیکھ لیں گے۔ اپنی ماں کی خوب خدمت کرو۔ انہیں خوش رکھو۔ تمہیں جنت کمانے کا یہ موقع قطعی نہیں کھونا چاہیے۔''

''تھینک یو سر، تھینک یو ویری مچ سر۔'' سفیان نے پرمسرت لہجے میں کہا اور اپنے روم میں آ گیا۔ اپنا ضروری سامان پیک کیا۔ پھر بازار آ گیا۔ سفینہ اور بے بے کے لیے کچھ چیزیں خریدیں اور سفینہ کو فون کر کے اطلاع دے دی کہ وہ کل رات یا صبح تک گھر پہنچ جائے گا۔

سفیان بس کے اڈے پر اترا تو اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بیگ ہاتھ میں اٹھائے دوڑتا ہوا گھر کی جانب چل دے لیکن اسے فوراً ہی دینو چاچا اپنے تانگے سمیت نظر آئے۔ اس نے انہیں سلام کیا۔ یہ وہی دینو چاچا تھے جن کے تانگے میں سوار ہو کر وہ اسکول جایا کرتا تھا اور آج وہ بوڑھے ہو گئے تھے لیکن سفیان کو اچھی طرح سے پہچانتے تھے اور گاؤں کے سارے لوگوں کی طرح اس کی عزت بھی کرتے تھے۔

انہوں نے اسے گلے لگا کر درازی عمر کی دعا دی اور زبردستی اپنے تانگے میں بٹھا لیا راستے میں وہ دیگر گاؤں والوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔

گھر کے دروازے پر دینو چاچا اسے اتار کر آگے بڑھ گئے تو وہ بے تابی سے دروازے پر پڑے بھاری پردے کو اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔

سامنے ہی نیم کے تلے چارپائی پر بیٹھی اسے بے بے دکھائی دے گئیں۔ وہ ساگ بنا رہی تھیں۔

''بے بے!'' اس نے دروازے سے ہی پکارا۔

بے بے نے اس کی آواز پر سر اٹھا کر دیکھا اور اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔

''آ گیا میرا سوہنا پتر۔ رب تینوں لمبی حیاتی دے۔ میں ابھی تجھے یاد کر رہی تھی۔'' وہ بھاگتا ہوا گیا اور بے بے کی پھیلی ہوئی بانہوں میں سما گیا۔ مامتا کی پرسکون آغوش کی گرمی ملی تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ بے ساختہ سسک پڑا۔

''بے بے اب کیسی طبیعت ہے؟''

''شکر ہے سوہنے رب دا...... میں ٹھیک آں......!'' انہوں نے اسے خود سے علیحدہ کر کے اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما ایک محبت بھری نگاہ اس پر ڈالی اور پیشانی کو چوم لیا۔

اتنے میں سفینہ بھی کچن سے نکل آئی اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھے مسکراتی ہوئی بھائی کو دیکھنے لگی۔

''کیا ہو گیا تھا بے بے......؟'' اس نے پوچھا۔

''لے مینوں کی ہویا...... چنگی بھلی آں...... بلکہ اب پہلے سے بھی زیادہ چنگی ہوں۔'' انہوں نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔

''لیکن بے بے سیفی نے تو مجھے فون کیا تھا کہ آپ کی طبیعت خراب ہے اور آپ مجھے یاد کر رہی ہیں۔'' سفیان نے کہا۔

''یاد تو اپنے پتر نو کریا سی پر......!'' انہوں نے مسکراتے ہوئے سفینہ کو دیکھا تو اس نے جھٹ کانوں کو ہاتھ لگا لیے اور سفیان نے محبت سے بہن کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ''بے بے کی بیماری کی خبر دے کر مجھے پریشان کرنا ضروری تھا۔''

''اگر یہ خبر آپ کو نہ دیتی تو آپ اس طرح تھوڑی ناں دوڑے چلے آتے۔'' اس نے شرارت سے آنکھیں نچائیں۔

''بس بہت ہو گیا بے بے اب اس کو اس کے سسرال چلتا کریں۔ یہ بہت تنگ کرنے لگی ہے۔'' سفیان نے کہا تو سفینہ جھٹ بولی۔

''جی نہیں پہلے میں نہیں جاؤں گی پہلے اس گھر میں بھابی صاحبہ آئیں گی۔''

لفظ بھابی سن کو سفیان بالکل خاموش ہو گیا۔ اس کو اتنا سنجیدہ دیکھا تو بے بے اور سفینہ ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگیں اور اشاروں سے ایک دوسرے سے کچھ کہنے لگیں سفیان نے سر اٹھا کر انہیں ایسا کرتے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تو بے بے بولی۔

''پتر تجھے ایک اہم بات بتانی تھی۔''

''کوئی پریشانی والی بات ہے۔'' سفیان نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

''پریشانی والی......!'' بے بے نے آہستہ سے زیرلب دہرایا۔

''ہمارے لیے تو نہیں ہے البتہ بھائی کے لیے ضرور ہے۔'' بے بے نے کہا اور خاموش ہو گئیں۔

''ان کے گھر ایسا کیا ہوا ہے؟'' سفیان کی آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر غزالہ کا پورا سراپا آ گیا۔ بے بے تھوڑی دیر سر جھکا کر کچھ دیر سوچتی رہیں پھر بولیں۔

''پتر بات یہ ہے کہ تیرے چاچے کا بیٹا توصیف جس کی غزالہ کے ساتھ شادی طے ہو چکی تھی اور اگلے

دو ماہ بعد شادی تھی۔ اس کا زمینوں کے پانی پر ساتھ کے گاؤں کے زمیندار سے جھگڑا ہوگیا۔ دونوں جانب سے گولیاں چلیں۔ ان کا تو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ پر توصیف کے ہاتھوں ان کو بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ توصیف کے ہاتھوں ایک بندہ تو موقع پر ہی مرگیا اور دوسرا اسپتال جاکر مرگیا۔ ان لوگوں نے توصیف کے نام پرچہ کٹوادیا۔ پولیس نے توصیف کو گرفتار کرلیا اور وہ پستول بھی برآمد کرلیا جس کی گولی سے بندے مرے ہیں۔ اب توصیف جیل میں ہے تیرے چاچے کے گھر تو ماتم پڑا ہے۔ بھائی کے گھر میں بھی سب پریشان ہیں کل رات کو بھائی عنایت آیا تھا تو وہ بتا رہا تھا کہ توصیف جیل سے نہیں چھوٹ رہا۔ ضمانت بھی نہیں ہو رہی اس کو سزا لمبی ہوگی یا تو پھانسی یا پھر عمر قید۔ بھائی عنایت پریشان ہو رہا تھا کہ اب دھی غزالہ کا کیا ہوگا۔“

سفیان دم بخود یہ ساری کہانی سن رہا تھا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا وہ حیران تھا کہ اللہ تعالیٰ کیا یوں بھی دعائیں سنتا ہے اور اتنی جلدی۔ بے شک وہ ہر شے پر قادر ہے۔ تقدیریں بدلنے پر بھی۔

”ماما عنایت تو خوامخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ غزالہ باجی کو کیا فرق پڑتا ہے کوئی ان کا توصیف بھائی سے نکاح تھوڑی نا ہوا تھا اور ویسے بھی غزالہ باجی تو اتنی پیاری ہیں انہیں کوئی اور بیاہ لے جائے گا...... کیوں بھائی......؟“ سفینہ نے جھٹ کہا۔

”تیری بات ٹھیک ہے دھیے پر توصیف چاچے کا اکلوتا پتر تھا۔ بس مزاج کا ذرا تیز اور اکھڑ تھا۔ ٹھنڈے دماغ سے کام لیتا تو ایسی مصیبت میں کیوں پڑتا۔“ بے بے نے کہا تو سفینہ بولی۔

”بے بے تم آج ہی ماما عنایت کے گھر جاؤ اور انہیں تسلی دو کہ وہ چاچا کے گھر جاکر غزالہ باجی کی منگنی توڑ دیں۔ غزالہ باجی کو ہم اپنے گھر کی بہو بنائیں گے۔“

”نہ دھیے، یہ رشتہ داری کا معاملہ ہے۔ ہمیں اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ تیرا چاچا کیا سوچے گا ہمارے بارے میں۔“ بے بے نے کہا۔

”تو ٹھیک ہے۔“ سفینہ نے سفیان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے شان بے نیازی سے کہا

”تم ماما سے بات تو کرلو۔ توصیف بھائی کو اپنے انجام کو پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی۔ ہم پھر اپنی خوشی کرلیں گے۔ ادھر ماما کی فکر بھی دور ہوجائے گی۔ اچھا ہی ہو رہا ہے۔ توصیف بھائی کے ساتھ۔ انہیں غرور بھی بہت تھا اپنی زمینداری کا۔ غریب کو تو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔“

”نہ دھیے نہ، کسی کی تکلیف پر خوش نہیں ہوتے۔ رب سوہنا ناراض ہوتا ہے۔ مجھے تو بس تیرے چاچا چاچی کا خیال آرہا ہے۔ جوان اولاد کا دکھ رب سوہنا کسی کو نہ دے۔“ بے بے نے ایک دکھ بھری ٹھنڈی اور گہری سانس لی اور سفیان بے ساختہ بے بے کی گود میں منہ چھپا کر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو رواں تھے۔

❀......❀......❀

اس رات آہستہ آہستہ حشام نے مجھے شاہ زمان بھائی اور مہہ وش کے متعلق ساری باتیں بتائیں انہوں نے بتایا کہ وہ دونوں کب سے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور مہہ وش کے باپ نے ان کے ساتھ کتنا ظلم کیا ہے اور شاہ زمان بھائی انتقام لینے کی خاطر کس طرح انجانے میں ان لوگوں کا آلہ کار بن گئے۔

”تمہیں پتا ہے سرمئی جب میں نے شاہ زمان کے ہاتھوں خود اس کی لکھی ہوئی کہانی پڑھی اور مجھے شاہ زمان کی محبت کی شدت کا احساس ہوا تو میرا دل تڑپ اٹھا اور میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ میں ان دونوں کو ضرور ملواؤں گا کیونکہ ایک پیار کرنے والا دل ہی کسی دوسرے پیار کرنے والے کے دل کی شدتوں کا احساس کرسکتا ہے وہ واقعی بہت بہادر ہے کہ مہہ وش کی محبت کو کھو کر بھی اتنے عرصہ زندہ رہا۔ اگر اللہ نہ کرے میرے ساتھ ایسا ہوا ہوتا تو میں تو ایک دن بھی زندہ نہ رہ پاتا۔ مرجاتا تمہارے بغیر۔“ حشام نے جذباتی لہجے میں کہا تو میں نے بے ساختہ حشام کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”آپ کو میری عمر بھی لگ جائے اتنی فضول باتیں کیوں کر رہے ہیں۔“ میں بے ساختہ حشام کے سینے میں منہ چھپا کر سسک پڑی تو حشام نے مزید شدت سے مجھے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔

”میں نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے نا۔“ حشام نے میرے بالوں کو چومتے ہوئے کہا پھر بولے۔

”یار تم کون سا شیمپو استعمال کرتی ہو۔ اس کی خوشبو سے دیوانہ ہوکر میں تمہارے بالوں کو ہی چومتا رہتا ہوں۔“

”حشام کے بچے۔“ میں نے اس کے سینے پر ہلکا سا مکا رسید کرتے ہوئے کہا تو وہ شرارت سے ہنس پڑے اور بولے۔

”آؤ ہم جلدی جلدی کوشش کرتے ہیں تاکہ گھر میں ڈھیر سارے ننھے ننھے بچے شور مچاتے پھریں۔“ اس کی آنکھوں کی شرارت اور ان کے خطرناک عزائم کا احساس ہوتے ہی میں بیڈ سے چھلانگ مار کر اتری اور تیزی سے باہر نکل آئی اور حشام کا قہقہہ میرا پیچھا کرتا رہا۔

باہر آئی تو مہہ وش امی کے پاس بیٹھی تھی۔ مجھے اس طرح ہنستے ہوئے بھاگ کر آتے دیکھ کر امی معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔ جبکہ مہہ وش نے معصومیت سے پوچھا۔

”کیا ہوا، تم کس بات پر ہنس رہی ہو؟“

”بس تھوڑے دنوں کی بات ہے پھر تم بھی اسی طرح ہنستے ہوئے اپنے کمرے سے باہر آؤ گی تو تمہیں خود اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔“ امی نے مسکراتے ہوئے سر جھکا کر کہا تو میرا چہرہ شرم سے گلنار ہوگیا تو مہہ وش بھی مسکرانے لگی۔

میرے پوچھنے پر مہہ وش نے مجھے اپنی اور شاہ زمان بھائی کی محبت کی داستان سنائی۔ وہ ہماری شادی کا واقعہ سن کر حیران ہوئی اور ہنستی ہوئی بولی۔

”حشام بھائی بھی حشام بھائی ہیں۔ ان جیسا کوئی دوسرا کہاں۔ اللہ آپ دونوں کی محبت کو سلامت رکھے اور کبھی کسی کی نظر نہ لگے۔“

میں نے اس کی اور رئیس خان کی زندگی کی کوئی بات نہیں نکالی کیا فائدہ اس کے زخموں کو کریدنے کا۔ حشام بتا رہے تھے کہ ابھی ان کی شادی میں تھوڑا ٹائم لگے گا اس لیے کہ مہہ وش کا نکاح رئیس خان سے ہوا ہے رئیس خان منظر سے غائب ہے یہ بات تو ہم جانتے ہیں کہ حبیب سلطان ہی رئیس خان تھا اور وہ مرچکا ہے مہہ وش بیوہ ہے اب یہ بات ثابت ہے کہ دراصل حبیب سلطان ہی رئیس خان تھا تاکہ نکاح میں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ ہو۔

اس دوران شاہ زمان بھائی کبھی کبھار ہمارے گھر آجاتے۔ بلکہ ایک دن حشام نے فکر مند لہجے میں مجھے بتایا کہ شاہ زمان کے فلیٹ کے اردگرد کچھ مشکوک

لوگ دیکھے جارہے ہیں اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ انہیں اپنے گھر میں بلالوں پھر شادی کے بعد انہیں کراچی سے سعودی عرب بجھوادیں گے۔

پھر شاہ زمان بھائی ہمارے گھر آگئے۔ ان دنوں گھر میں بہت رونق تھی۔ امی کا کہنا تھا کہ حشام نے تو ایک ہی دن میں جھٹ پٹ سب کچھ کرلیا کوئی رونق ہی نہیں لگی۔ اب ہم شاہ زمان اور مہہ وش کی شادی میں اپنے ارمان نکالیں گے۔

ایک دن حشام نے یہ خوش خبری سنائی کہ یہ بات ثابت اور کنفرم ہوگئی ہے کہ دبئی کا بزنس مین اور کراچی کا صنعت کار حبیب سلطان دراصل ایک ہی شخص تھا جو ہلاک ہوچکا ہے اور اس کی ساری جائیداد کی وارث اس کی بیوی مہہ وش ہے لیکن وہ منظر سے غائب ہے اس کے وکیل نے ٹی وی کے ایک پروگرام میں آ کر رئیس خان کی بیوہ مہہ وش سے گزارش کی کہ وہ ان فون نمبرز پر رابطہ کرے۔ ساتھ ہی اسکرین پر فون نمبرز بھی دکھائے جارہے تھے۔

لیکن مہہ وش نے صاف انکار کردیا کہ مجھے رئیس خان کی دولت اور جائیداد سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں سامنے نہیں آنا چاہتی۔ اس دولت اور جائیدار کے اوپر نجانے کتنے لالچی لوگوں کی نگاہیں ہوں گی اور وہ یوں آسانی سے مجھے اس کا مالک نہیں بننے دیں گے میں صرف شاہ زمان کے ساتھ ایک پرسکون زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔

مہہ وش کے اس فیصلے کو سب نے سراہا۔ خاص طور پر شاہ زمان بھائی نے۔ وہ بھی ایسا نہیں چاہتے تھے۔ اب حالات بہت پرسکون تھے۔ کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا اور نہ ہی ان دونوں کی خوشیوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ رہی تھی۔ اس لیے جمعہ کا مبارک دن طے ہوگیا کہ ان دونوں کا نکاح کردیا جائے گا۔

شاہ زمان بھائی نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ مہہ وش کو بیاہ کر اپنے فلیٹ میں لے جائیں گے۔ ہمیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ لوگ پرائیویسی چاہتے تھے۔

میری دونوں امیاں مل کر مہہ وش کے لیے شادی کے جوڑے کی خریداری کررہی تھیں۔ البتہ شاہ زمان بھائی نے شیروانی وغیرہ پہننے سے صاف انکار کردیا ان کا کہنا تھا کہ وہ سفید شلوار قمیص پہنیں گے۔

اس روز جمعہ تھا بعد نماز جمعہ دونوں کا نکاح مسجد میں ہوا پھر سب گھر آگئے امی نے بیوٹیشن کو گھر پر ہی بلوالیا تھا۔

حشام بار بار مجھے چھیڑ رہے تھے کہ تم بھی تو سرخ جوڑا پہن کر اپنا خالص دلہن کا روپ مجھے دکھادو۔ تم تو منگنی کے جوڑے میں دلہن بنی تھی اور میں نے انہیں انگوٹھا دکھاتے ہوئے کہا کہ اب کیا فائدہ وہ خاص وقت تو گزر گیا آپ کو ہی جلدی پڑی......!"

"تو کیا ہوا جان من ہم دوبارہ نئے سرے سے سہاگ رات منائیں گے۔ میں تمہاری رونمائی۔"

"چپ ہوجائیں حشام' توبہ ہے کتنا بولتے ہیں آپ...... سر میں درد کردیا۔ ابھی ویسے بھی ڈھیروں کام پڑے ہیں۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"اچھا تمہارے سر میں درد ہورہا ہے ابھی ٹھیک کرتا ہوں تمہارے سر کا درد۔" حشام میری جانب بڑھے تو میں ایک چیخ مار کر بھاگی۔ "امی بچائیں۔"

"یہ فاؤل ہے سرمئی تم بات بات پر امی کو کیوں آواز لگاتی ہو۔" وہ اپنی جگہ کھڑے کھڑے بچوں کی طرح منہ پھلا کر بولے۔

"آپ اسی طرح ہی سدھرتے ہیں۔" میں نے کہا تو وہ سر کھجانے لگے اور بولے۔ "کسی نے بالکل سچ کہا ہے شادی کرو اور پھنسو۔"

"ارے بھئی میری تو آج ہی شادی ہوئی ہے اتنا تو نہ ڈراؤ۔" شاہ زمان بھائی نے اندر آتے ہوئے حشام کی بات سنی تو ہنستے ہوئے کہا۔

"اللہ تعالیٰ تم دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے اور ڈھیر ساری خوشیاں دے یہ تو میری اور سرمئی کی نوک جھونک چلتی رہتی ہے۔" حشام نے پرخلوص لہجے میں شاہ زمان بھائی سے کہا تو میں حشام کو دیکھتی رہ گئی۔ لمحہ بھر میں حشام کا موڈ بدل جاتا ہے۔ کتنا بڑا اداکار ہے یہ شخص۔ میں نے سوچا اور ہزار جان سے قربان ہونے والی میری نگاہیں حشام کے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔

"حشام ذرا میرے ساتھ آنا تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" شاہ زمان بھائی حشام کو اپنے ساتھ لے گئے تو میں بھی کپڑے چینج کرنے چلی گئی۔ تیار ہو کر میں مہہ وش کو دیکھنے کے لیے گئی۔ ہم نے خاص خاص لوگوں کو اس شادی میں مدعو کیا تھا مہمان لان میں بیٹھے تھے کھانے کا انتظام بھی وہیں تھا۔

میں مہہ وش کے کمرے میں پہنچی تو بیوٹیشن میک اپ کمپلیٹ کر کے مہہ وش کو دوپٹا اوڑھا رہی تھی۔ مہہ وش بلاشبہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اتنی کہ اس پر نگاہ ہی نہیں ٹھہر رہی تھی میں نے اس کی تعریف کی اور اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔

بیوٹیشن اپنا کام مکمل کر کے جاچکی تھی جیسا کہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جب دلہن کو دلہا کے نام سے چھیڑا جاتا ہے تو وہ شرماتی ہے مسکراتی ہے لیکن مہہ وش خلاف توقع بہت سنجیدہ تھی وہ بار بار گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

aanchal.com.pk

تازہ شمارہ شائع ہوگیا ھے

آج ھی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

آنچل

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں دفتر سے رابطہ کریں۔ فون 35620771/2

"کیا بات ہے مہ وش تم پریشان ہو؟" میں نے اس بات کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں کیا بات ہے سرمئی میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ کچھ برا ہونے والا ہے۔ آج میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی کا دن ہے اور میں خوش نہیں ہو پا رہی ہوں۔ اللہ کرے کچھ برا نہ ہو۔" بات کرتے کرتے مہ وش کی آواز بھرا گئی تو میں نے آگے بڑھ کہ اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور کہا۔

"میں سمجھ سکتی ہوں کہ تمہیں ایسا کیوں لگ رہا ہے سب سے بڑی وجہ تمہاری اداسی کی جو میری سمجھ میں آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ آج تم کہو یا نہ کہو تم اپنے والدین کو یاد کر رہی ہو اور دوسری بات یہ کہ تم نے اپنی زندگی میں اتنی تلخیاں جھیلی ہیں کہ تمہیں خوشی کے ان لمحات کا یقین نہیں آ رہا ہے اور تم خوامخواہ کے وہموں اور وسوسوں کا شکار ہو رہی ہو میری اچھی بہن۔ ہر بری بات اور برے وقت کو ایک برے خواب کی مانند بھلا دو اور آنے والی اس نئی اور خوشیوں بھری زندگی کے بارے میں سوچو وہ زندگی جس کے خواب تم نے اور شاہ زمان بھائی نے مل کے دیکھے تھے۔ انشاء اللہ سب اچھا ہوگا۔ تم دونوں کے پاسپورٹ اور ویزے تیار ہیں۔ ایک ہفتے کے بعد تم دونوں سعودی عرب چلے جاؤ گے پہلے حرم پاک میں جا کر عمرہ ادا کرنا پھر جدہ آ جانا' وہاں ابو کے دوست تمہیں خوش آمدید کہنے کے لیے منتظر ملیں گے۔

اچھا اب مسکراؤ' شاہ زمان بھائی کو پتا چلا کہ ان کی دلہن بجائے خوش ہونے کے اداس ہو رہی ہے تو انہیں کیسا لگے گا۔" میں نے اس کی جھیل جیسی آنکھوں سے بہہ آنے والے نمکین پانی کو اپنی انگلی کی پور سے صاف کیا تو وہ مسکرا دی۔ اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں سختی سے تھام لیا اور بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تم نے اور حشام بھائی نے ہمارے لیے جو بھی کیا ہے ہم تا حیات اس کا احسان نہیں اتار سکتے۔ بس دل سے ہر لمحے تمہاری خوشیوں کے لیے دعائیں کرتے رہیں گے۔"

"ایسی باتیں کر کے مجھے شرمندہ مت کرو۔ ہم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ تمہیں تمہارے نصیب کی خوشیاں مل رہی ہیں اور ویسے بھی شاہ زمان تو مجھے اپنی بہن فائزہ ہی سمجھتے ہیں۔ تو سمجھ لو کہ یہ جو کچھ بھی کیا ہے ایک بہن نے اپنے بھائی کے لیے کیا ہے۔"

میری باتوں اور تسلی سے وہ بہل گئی اور مسکرانے لگی پھر میں نے کہا آؤ میں تمہیں باہر لے چلتی ہوں سب لوگ اتنی پیاری دلہن کو دیکھنا چاہتے ہیں۔

پھر میں نے اسے کھڑا کیا اور اسے کمرے سے باہر لاؤنج میں لے آئی۔ ساری خواتین وہیں موجود تھیں۔

پھر شاہ زمان بھائی کو بھی وہیں بلوا لیا۔ دونوں کو ساتھ ساتھ صوفے پر بٹھا دیا۔ میں نے اپنے موبائل کے کیمرے پر اس حسین جوڑے کی کئی تصاویر قید کر لیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر مہمان چلے گئے۔ میں نے شاہ زمان بھائی کو بھی بے چینی سے بار بار پہلو بدلتے ہوئے دیکھا تو سمجھ گئی کہ وہ خود منہ سے نہیں کہہ رہے ہیں کہ وہ اب اپنی دلہن کو اپنے گھر لے کر جانا چاہ رہے ہیں۔

میں نے حشام سے کہا کہ اب ہمیں دلہا دلہن کو روانہ کر دینا چاہیے تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے پھر سب نے مہ وش کو گلے لگا کر ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ کار میں بٹھا دیا تو شاہ زمان بھائی نے ضد کی کہ مہ وش کو آگے بٹھاؤ اپنی کار میں خود ڈرائیو کروں گا۔ سب نے سمجھایا کہ ہمارا ڈرائیور آپ کی کار ڈرائیو کرے گا۔ تب وہ مشکل سے راضی ہوئے۔

کار روانہ ہو گئی تو ہم لوگ بھی گیٹ بند کر کے اندر آ گئے۔ امی نے زبردستی مجھے کمرے میں بھیج دیا کہ تم آرام کرو میں ملازموں کے ساتھ مل کر صفائی کروا لیتی ہوں۔

حشام کو شوخیاں سوجھ رہی تھیں اور میں مہ وش اور شاہ زمان بھائی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

ابھی انہیں روانہ ہوئے آدھا گھنٹہ ہوا تھا میں تصور کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی کہ وہ لوگ اپنے فلیٹ پر پہنچ گئے ہوں گے شاہ زمان بھائی مہ وش کو لے کر اپنے گھر میں خوشیوں سے بھرا قدم رکھ رہے ہوں گے۔

اتنے میں حشام کے فون کی بیل بجنے لگی۔

حشام نے جو اس وقت کسی اور موڈ میں تھے۔ جھنجلا کر فون کی جانب دیکھا۔ انہیں اس وقت فون کی بیل سخت ناگوار گزر رہی تھی۔ انہوں نے نمبر دیکھا ان کے ڈرائیور عبدالستار کا فون تھا۔ نمبر دیکھ کر حشام بولے۔

"لو بھئی وہ لوگ پہنچ گئے عبدالستار کا فون ہے میں نے کہا تھا کہ وہاں پہنچ جاؤ تو کال کر دینا۔" انہوں نے ریسیو کا بٹن پش کیا اور بولے۔

"ہاں عبدالستار پہنچ گئے خیریت سے۔"

اور پھر چند لمحے انہوں نے خاموشی سے کچھ سنا ان کی پیشانی پر گہری شکنیں نمودار ہوئیں اور وہ تیزی سے بیڈ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"کیا کہہ رہے ہو' کہاں...... کون سے اسپتال میں......؟"

"کک...... کیا ہوا حشام؟" اسپتال کا نام سنتے ہی میرے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے۔

"بہت برا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ عبدالستار بھی زخمی ہے لیکن ہوش میں ہے اور وہ دونوں...... وہ دونوں...... پتا نہیں زندہ بھی ہیں یا......!" حشام نے کہا اور تیزی سے اٹھ کر باہر بھاگے اور میرے تو قدموں نے کھڑا رہنے سے ہی انکار کر دیا اور میں نیچے بیٹھتی چلی گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دل سے بس ایک ہی دعا نکل رہی تھی کہ "یا اللہ ان دونوں کو سلامت رکھنا۔"

پھر میں حشام اور انکل جناح اسپتال کی جانب بھاگے۔ وہاں جا کر پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ گاڑی میں سوار مرد اور عورت ہلاک ہو چکے ہیں۔ صرف ڈرائیور زندہ بچا ہے اور وہ زخمی ہے۔

عبدالستار کا ایک ہاتھ کلائی سے ٹوٹ گیا تھا سر اور پیروں پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔ اس کے بیان کے مطابق اچانک ہی ایک ہیوی ٹرک اندرونی سڑک سے نکل کر آ گیا اور اس نے سائیڈ سے کار کو ٹکر ماری۔ ٹرک کا اگلا حصہ کار میں گھس گیا تھا۔ کار میں سے جب ڈیڈ باڈیز کو نکالا گیا تو دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے میں سختی کے ساتھ پیوست تھے۔ انہیں علیحدہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ سینہ اور پیٹ اتنا زیادہ زخمی ہوا ہے کہ سانسوں کی رفتار رک گئی۔ چہرے سلامت تھے۔

میں تو ان کے چہرے دیکھ کر ہی حشام کے ہاتھوں میں بے ہوش ہو کر جھول گئی مجھے کچھ بھی ہوش نہیں رہا۔

ہوش آیا تو امی کی بانہوں میں تھی سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ضروری کارروائی کے بعد میتیں ہم گھر لے آئے۔ دو ہنسوں کا جوڑا بچھڑ کر ایسے ملا کہ اب

انہیں کوئی جدا نہیں کرسکتا تھا۔ ان کے چہروں پرسکون تھا۔ جس کو میں نے سرخ سہاگ کے جوڑے میں روانہ کیا تھا۔ اس وقت سفید کفن میں اس روپ سے زیادہ سج رہی تھی۔

میں بہت عرصہ تک اس صدمے سے نڈھال رہی۔ حشام‘ کرنل مشتاق اور احتشام نے اس بات کی تحقیقات کیں جیسا کہ ہم سمجھ رہے تھے یہ محض ایک حادثہ نہیں تھا بلکہ سوچا سمجھا قتل کا منصوبہ تھا۔ جس پر عمل کیا گیا اور ان دونوں کا قاتل کون ہوسکتا ہے یہ بھی ہم سمجھ سکتے تھے۔ وہی شخص جس کے جرائم کے مکمل ثبوت کے طور پر میرے بھائی شاہ زمان کی ذات تھی۔

میرے دل میں اس شخص کے لیے نفرت کے جو جذبات تھے ان میں مزید اضافہ ہوچکا تھا۔ اب وہ میرے بھائی بھابی کا بھی قاتل تھا اور آج بھی آزاد ہے۔ یوں ہی باعزت بنا ہوا ہے۔ اس کے پیچھے بیرونی طاقتوں کا ہاتھ ہے۔ وہ کبھی نہیں پکڑا جائے گا۔ دنیا کے قانون میں ان جیسے لوگوں کے لیے کوئی سزا نہیں ہے۔ لیکن اللہ کی عدالت اسے ضرور سزا سنائے گی۔ اس روز جب وہ اپنا سیاہ نامہ اعمال اپنے بائیں ہاتھ میں تھامے اپنے اس اللہ کے حضور تنہا کھڑا ہوگا اس روز اس کے پیچھے نہ را ہوگی نہ موساد اور نہ بلیک واٹر۔

دس پندرہ دن کے بعد میں نے لرزتے قدموں سے اس کمرے میں قدم رکھا جو مہ وش کے زیر استعمال تھا۔ میں نے الماری کھولی اس میں اس کی استعمال کی چیزوں کے علاوہ مجھے ایک پیڈ ملا یہ وہ پیڈ تھا جس میں شاہ زمان بھائی نے اپنی سوانح حیات لکھی تھی۔

میں اس پیڈ کو لے کر خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اس سوانح حیات کو پڑھتی رہی۔ آج شاہ زمان بھائی کی گزری زندگی کا ایک ایک لمحہ ایک ایک سوچ میرے سامنے تھا۔

میں مانتی ہوں ان سے غلطیاں ہوئی تھیں۔ گناہ ہوئے تھے لیکن انہیں اپنی غلطیوں اور گناہوں کا شدت سے احساس تھا۔ وہ تائب ہوچکے تھے اور یقیناً غفور الرحیم نے انہیں معاف کردیا ہوگا۔ وہ سچی توبہ ضرور قبول کرتا ہے۔

آج وہ ہم میں نہیں ہیں لیکن میں انہیں کبھی نہیں بھولتی۔ ان کی زندگی میں میرے لیے بہت سبق پوشیدہ ہیں۔

آج چھ سال گزر چکے ہیں اس سانحے کو آج ہی کے دن وہ دونوں اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے اور آج ہی کے دن میں نے اپنا یہ ناول مکمل کیا ہے۔ میں تو صرف شاہ زمان بھائی کے اوپر لکھنا چاہ رہی تھی لیکن یہ حشام کی ضد تھی کہ تم اس میں ہماری محبت کی داستان بھی شامل کرو۔ کیونکہ اس کہانی میں ایک ایسا مشترکہ دشمن ہے جس نے تمہیں بھی دکھ دیے ہیں اور شاہ زمان کو بھی۔

نواب سطوت آج بھی زندہ ہے وہ اگر مر بھی جائے گا تو کل کسی اور نام سے زندہ ہوکر آ جائے گا۔ کیونکہ ابلیس قیامت تک کے لیے دنیا میں بھیجا گیا ہے‘ انسان اور شیطان کا ساتھ قیامت کے دن تک کا ہے۔

ختم شد

رادھیکا

اسعد علی

اسعد علی

دنیا میں ہمارے علاوہ بھی دیگر مخلوقات آباد ہیں‘ جن میں کچھ تو ہمارے سامنے اور کچھ ہماری نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کا اپنا ایک نظام اور دائرہ بنا رکھا ہے‘ یہ اپنے اپنے دائرے میں رہتی ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اگر اپنے دائرہ سے نکلتا ہے تو ایسے ہی سانحات جنم لیتے ہیں۔
ایک نوجوان کو پیش آنے والے خوفناک واقعات‘ جن کی ہر سطر حقیقت پر مبنی ہے۔

وہ چاروں ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ خانی کرتے ہوئے اس پگڈنڈی پر چلے جارہے تھے جو سیدھی جنگل میں جاکر ختم ہوتی تھی۔ کل چھٹی تھی اس لیے ہر ہفتے ویک اینڈ پر وہ چاروں شکار کا پروگرام بناتے تھے۔

رات کا وقت تھا‘ چاند اپنے پورے جوبن پر تھا اور بے دریغ زمین پر اپنی چاندنی لٹا رہا تھا‘ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جاتی ہوئی گرمیوں اور آتی ہوئی سردیوں کے دن تھے‘ اسی جنگل کی سب سے بڑی خوب صورتی اس جنگل کے بیچوں بیچ بہنے والی جھیل تھی۔ چاندنی رات میں تو اس جھیل کا حُسن اور دوبالا ہوجاتا تھا۔ جب پورے چاند کا عکس جھیل کے بہتے پانی اور آتی جاتی ہلکی ہلکی لہروں پر مچلتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

”یار عادل! شکار کو چھوڑ آج ہم جھیل کے کنارے پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھتے ہیں اور چاندنی رات کا لطف اٹھاتے ہیں۔“ شہزاد نے کہا۔

”کیوں بھئی کیا آج رات شکار کرنے کا پروگرام نہیں ہے۔ کیا ساری رات یوں ہی فالتو بیٹھ کر گنوادو گے۔“ کلیم اللہ نے کہا۔

”ارے یار مولانا تم تو بولو ہی مت‘ تم بس اللہ اللہ کرو‘ کیا بات ہے چاندنی رات کی اور چاند کے حسن کی‘ تم تو لڑکیوں سے بھی یوں دور بھاگتے ہو جیسے وہ کوئی بدروح یا چڑیل ہوں اور تمہیں چمٹ جائیں گی۔ میاں جی یہ تو ہم جیسے جوانوں کے شوق ہیں جو حسن اور حسن کے دلنواز نظاروں کو انجوائے کرتے ہیں۔“ رحمان نے کہا تو عادل اور شہزاد بھی رحمان کے ساتھ قہقہہ مار کر ہنس پڑے تو کلیم اللہ جھینپ گیا۔

ان چاروں کی بچپن ہی سے دوستی تھی‘ وہ ایک ہی اسکول میں اور ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے‘ میٹرک پاس کیا تو کالج میں داخلے کے لیے انہیں شہر جانا پڑتا۔ گھر سے اس بات کی سہولت نہیں تھی اور نہ ہی کسی کے پاس اتنا پیسہ تھا‘ صرف شہزاد کے گھر کے مالی حالات ایسے تھے کہ وہ شہر جا کر کالج میں داخلہ لے سکتا تھا لیکن وہ اپنے بچپن کے دوستوں کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا‘ اس لیے اس نے بھی آگے تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ موخر کردیا پھر سب اپنے اپنے دھندوں میں لگ گئے۔ مصروفیات بڑھیں تو ملاقاتیں بھی کم ہوگئیں لیکن ہر ویک اینڈ پر وہ ہر کام چھوڑ کر جمع ہوجاتے اور ساری رات ساتھ گزارتے تھے۔

پنجاب کا یہ علاقہ دیہاتی تھا لیکن یہاں بھی بہت سی شہری سہولتیں موجود تھیں‘ ایک ہائی اسکول تھا‘ اسپتال تھا‘ بازار بہت بڑا تھا جہاں ضروریات زندگی کی ہر شے باآسانی مل جاتی تھی۔

حکیم اللہ چوں کہ ایک سیدھا سادا اور شرمیلا سا لڑکا تھا، اس کے چہرے پر داڑھی بھی تھی کبھی کبھار پیار سے یہ دوست اسے چھیڑتے ہوئے مولانا کہہ کر پکارتے تھے، ان میں کسی کی منگنی ہوگئی تھی تو کوئی محبت کے چکر میں پھنسا ہوا تھا، صرف کلیم اللہ واحد تھا جس کا نہ کسی لڑکی سے چکر تھا اور نہ ہی اس کی منگنی ہوئی تھی۔ وہ اپنے قصبے کے اسپتال میں کمپاونڈر تھا، بہت سی خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ نماز کا بھی پابند تھا اور گاہے بگاہے اپنے دوستوں کو بھی نماز کی تلقین کرتا رہتا تھا۔ اس کے گھر میں صرف بیوہ ماں تھی، وہ اس وقت یتیم ہوگیا تھا جب وہ صرف چار سال کا تھا۔ اس کے بعد ایک بہن بھی پیدا ہوئی تھی لیکن وہ بھی چھ سال کی ہوکر ٹائیفائیڈ کا شکار ہوکر چل بسی تھی۔

ماں نے محنت مزدوری کر کے اسے پالا پوسا اور اس کی بہترین تربیت کی۔ تین کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا مکان ان کا ذاتی تھا، بہت اچھی گزر رہو رہی تھی، وہ اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن تھا۔

اسی رات وہ کھانا وغیرہ کھا کر اور نماز عشاء سے فارغ ہوکر اپنے دوستوں کا انتظار کر رہا تھا۔

اس کی ماں کو پتا تھا کہ آج رات کلیم اللہ اپنے دوستوں کے ساتھ جائے گا اس لیے وہ یہ کہہ کر سوگئی کہ وہ باہر سے دروازہ بند کر کے چابی اپنے ساتھ لے جائے تاکہ جب وہ واپس آئے تو ماں کی نیند خراب نہ ہو۔

یہ وہ دور تھا جب ملک میں امن وسکون تھا، چوری ڈکیتی یا قتل واغواء کی واردات بھی کبھی کبھار ہی سننے کے لیے ملتی تھی۔

باتیں کرتے اور ہنسی مذاق کرتے کرتے وہ لوگ جنگل کے وسط میں پہنچ گئے، چاندنی رات میں چاند کی روشنی میں ہلکورے لیتا جھیل کا پانی چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ چاروں ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کے جھیل کے کنارے پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھ گئے، وہ آپس میں لڑکیوں کی باتیں کر رہے تھے، کلیم اللہ کو ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا ماننا تھا کہ وہ تو محبت صرف اپنی بیوی سے ہی کرے گا اور اس کی بیوی بھی وہ لڑکی بنے گی جیسے اس کی ماں پسند کر کے لائے گی۔

آج شاید چاند کی چودہ تاریخ تھی روشنی اتنی زیادہ تھی کہ ہر شے صاف اور واضح دکھائی دے رہی تھی۔

کلیم اللہ بور ہوکر یوں ہی چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھا کر پانی میں پھینکنے لگا، جوں ہی پتھر پانی میں گرتا بہت سارے دائرے بننا شروع ہوجاتے۔ کلیم اللہ ان بنتے اور بگڑتے دائروں میں کھویا ہوا تھا یوں ہی بھٹکتے بھٹکتے اس کی نگاہ جھیل کے درمیانی حصے میں چلی گئی اسے وہاں کوئی چیز تیرتی ہوئی دکھائی دی تو وہ مزید توجہ اور غور سے دیکھنے لگا۔ غور اور توجہ سے دیکھنے پر اسے جو کچھ دکھائی دیا اس نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا اور وہ بے ساختہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور جھیل کے کنارے کنارے چلنے لگا وہ دوسری جانب سے جا کر اسے نزدیک سے دیکھ کر یقین کرنا چاہتا تھا کہ آیا جو وہ سمجھ رہا ہے حقیقت ہے یا اس کا خیال۔

اس کے دوستوں نے اسے اٹھ کر جاتے ہوئے دیکھا تو کوئی پروا نہیں کی کیوں کہ وہ یہ بات جانتے تھے کہ کلیم اللہ ان کی باتوں سے بور ہو رہا تھا وہ پھر زور و شور سے اپنی باتوں میں مصروف ہوگئے۔ ان کی نگاہ اس کی جانب گئی ہی نہیں جہاں دیکھ کر کلیم اللہ چونک کر کھڑا ہوگیا تھا۔

کلیم اللہ اب جھیل کے کنارے کھڑا تھا، یہ کنارہ

اس جگہ سے نزدیک تھا اور وہ بالکل صاف اور واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔

جھیل کے شفاف پانی پر ایک حسین وجمیل عورت تیر رہی تھی جس کا سارا جسم پانی کے اندر تھا صرف گردن تک چہرہ پانی کے اوپر تھا، لمبے سیاہ بال پانی پر اس کے ساتھ ساتھ تیر رہے تھے، بڑی بڑی روشن آنکھیں، خوب صورت بھرے بھرے ہونٹ اور ستواں ناک۔

کلیم اللہ کو جس چیز کو دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی وہ اس عورت کی ناک میں پہنی ہوئی بڑی سی نتھ تھی، جو سونے کی تھی اور پوری طرح چمک رہی تھی۔

وہ عورت تیرتی تیرتی کلیم اللہ کے بالکل نزدیک آ گئی تب کلیم اللہ نے اس کا چہرہ واضح طور پر دیکھا تھا۔ وہ کلیم اللہ کو دیکھ کر مسکرائی اور پھر تیزی سے مسکراتی ہوئی واپس پلٹ گئی اور پھر اس جگہ جا کر دائرے کی شکل میں تیرنے لگی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ صرف چہرے اور گردن کے علاوہ اس عورت کے جسم کا کوئی اور حصہ ذرا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

جیسے ہی وہ عورت جھیل کے وسط میں پہنچی کلیم اللہ تیزی کے ساتھ اپنے دوستوں کے پاس واپس آیا، اس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔

”کیا ہوا مولانا! کیا بات ہے تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟“ عادل نے کلیم اللہ کو تیزی سے پسینہ پونچھتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

”وہ...... وہ...... تم لوگ...... جھیل...... جھیل کے درمیان میں دیکھو تمہیں کچھ دکھائی دے رہا ہے؟“ کلیم اللہ نے بمشکل اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”کیا ہے وہاں؟“ سب نے ایک ساتھ پوچھا اور ان کی نگاہیں اس کی جانب اٹھ گئیں اور پھر غور

aanchal.com.pk
تازہ شمارہ شائع ہوگیا ھے
آج ھی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
حجاب
کراچی
پرچہ نہ ملنے کی صورت میں دفتر سے رابطہ کریں۔ فون 35620771/2

کرنے پرانہیں صاف دکھائی دینے لگا کہ یہاں جھیل میں کوئی عورت ہے جو پانی کے اندر تیر رہی ہے، جسم اندر ہے صرف چہرہ باہر ہے اور اس نے ایک بڑی سی نتھ پہن رکھی ہے جو بہت زیادہ چمک رہی ہے۔

"ابے لے......" عادل کے منہ سے تحیر زدہ لہجے میں نکلا۔

"ہاں یار وہاں تو کوئی عورت نہارہی ہے۔" شہزاد نے کہا۔

"ابے ہاں یار!" رحمان نے دیکھ کر کہا "یار میرے تو جسم میں گدگدیاں سی ہورہی ہیں، میں یہ سوچ کر کہ رات کے اس وقت جھیل میں تنہا ایک عورت نہارہی ہے اور ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔"

"ابے رہنے دے یار! کچھ بھی تو دکھائی نہیں دے رہا۔ سب کچھ تو پانی کے اندر ہے، صرف چہرہ ہی باہر ہے۔" شہزاد نے کہا۔

"بند کرو تم دونوں اپنی یہ بکواس......" عادل نے انہیں ڈانٹا۔ "ذرا یہ تو سوچو کہ جنگل میں آدھی رات کو کون عورت اتنی جی دار ہوگی جو تنہا یہاں آکر جھیل میں نہائے گی۔ پتا نہیں یہ کیا شے ہے، یار مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈرنے کی کیا بات ہے یار! یہ عورت ہی ہے تم دیکھ نہیں رہے، اس نے کتنی بڑی نتھ ناک میں پہنی ہوئی ہے۔" شہزاد نے کہا۔

ان لوگوں کی باتیں جاری تھیں جب کہ کلیم اللہ بالکل خاموش کھڑا تھا، اس نے ان سب سے کہا کہ بہتر یہی ہے کہ ہم لوگ اب گھر واپس چلتے ہیں۔

کلیم اللہ کے کہنے پر سب نے واپسی کا ارادہ کیا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ عورت مسلسل دائرے کی شکل میں جھیل میں تیر رہی تھی۔ وہ پلٹ پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے آرہے تھے، آج رات یوں ہی بے کار ہوگئی نہ شکار کیا اور نہ ہی تفریح۔ سب اگلے ہفتے ملنے کا وعدہ کرکے اپنے اپنے گھر جاکے سوگئے۔

اس رات ان سب ہی کے ذہنوں میں اس جھیل میں تیرنے والی عورت کا تصور رہا، پھر گزرتے دن کی مصروفیات میں گم ہوکر وہ ان کے ذہنوں سے محو ہوگئی حد یہ کہ سات روز گزر گئے اور پر اس سب کے اکٹھے ہوکر مل بیٹھنے کی رات آگئی۔

کلیم اللہ جب کھانے اور نماز عشاء سے فارغ ہوکر بیٹھا اور اپنے دوستوں کا انتظار کرنے لگا وہ سب ایک دوسرے کو لیتے ہوئے کلیم اللہ کے گھر آئے تھے اور پھر کلیم اللہ کو ساتھ لے کر جنگل کی جانب نکل جاتے تھے کیوں کہ کلیم اللہ کا گھر قصبے کے آخری سرے پر واقع تھا اور جنگل سے نزدیک بھی تھا۔

حسب عادت کلیم اللہ کی ماں سونے کے لیے لیٹ گئی اور کلیم اللہ نے گھر کو باہر سے تالا ڈالا اور چابی جیب میں ڈال کر ان کے ساتھ چل دیا۔

اس روز کلیم اللہ ہمیشہ سے زیادہ خاموش اور سنجیدہ تھا، تینوں دوستوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ کلیم اللہ ویسے تو خاموش طبع ہے لیکن اتنا بھی نہیں کہ بالکل ہی خاموشی اختیار کرے انہوں نے پوچھا بھی کہ کیا بات ہے مولانا کیا طبیعت خراب ہے تو کلیم اللہ نے ہنس کر جواب دیا کہ وہ ٹھیک ہے لیکن پتا نہیں کیا بات ہے اسے کچھ نیند آرہی ہے اور اس کا آج جنگل میں جانے کا دل نہیں چاہ رہا ہے۔

"کیا بات ہے مولانا! کہیں دل تو نہیں لگالیا کیا آج رات گھر کے صحن میں چارپائی بچھا کر تارے گننے کا پروگرام ہے۔" شہزاد نے چھیڑا۔

"جناب اس قسم کے شغل آپ ہی کو مبارک ہوں میں تو اس قسم کی خرافات سے کوسوں دور بھاگتا ہوں۔" کلیم اللہ نے جواب دیا۔

"یار اپنی تو یہ دعا ہے کہ تُو بھی جلد ہی کسی کی زلفوں کا اسیر ہوجائے تب تجھے مزہ آئے گا۔" عادل نے کلیم اللہ کی پیٹھ پر ہاتھ مارا تو سب ہنس پڑے۔

ابھی تک وہ سب مزے سے باتیں کرتے ہوئے جارہے تھے، شکار کا سارا سامان ان کے پاس تھا، اب تو گھٹتے ہوئے چاند کی تاریخ تھیں، اس لیے آج جنگل میں گزشتہ ہفتے کی طرح روشنی نہیں تھی بلکہ قدرے اندھیرا تھا۔

روشنی کے انتظام کے لیے ان کے ہاتھوں میں ٹارچ تھی، انہوں نے اپنی اپنی ٹارچ روشن کرلیں اور اسی کی روشنی میں آگے بڑھنے لگے۔ آج ان کا پروگرام جنگل میں پھندے لگانے کا تھا، وہ پھندے لگا کر جھیل کے کنارے بیٹھ جاتے اور ان کے لگائے ہوئے پھندے میں کوئی چھوٹا موٹا جانور پھنس جاتا۔ اصل میں اس جنگل میں موذی درندے نہیں تھے اس لیے وہ رات کو بھی بلاخوف وخطر یہاں آجاتے تھے۔

جھیل کے کنارے بیٹھتے ہی کلیم اللہ کی بے تاب نگاہیں بے قراری سے جھیل کے وسط میں جا پہنچیں۔ آج قدرے اندھیرا تھا اور وہ جس کو تلاش کر رہا تھا وہ اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

یکایک اسی جگہ ایک تیز چمک سی لہرائی تو کلیم اللہ نے اپنی آنکھیں مزید گاڑھ دیں تب اس نے دیکھا کہ یہ چمک اس عورت یا لڑکی کی ناک میں پہنی ہوئی نتھ کی ہے پھر وہ چمک گول دائرے میں چکر کاٹنے لگی۔

"یار کلیم اللہ! کیا دیکھ رہا ہے کیا آج بھی وہ چیز یہاں غسل فرمارہی ہے؟" شہزاد نے پوچھا۔

"ہاں......" کلیم اللہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"ابے کیا واقعی!" کلیم اللہ کے منہ سے ہاں سن کر تینوں کھڑے ہوگئے اور انہوں نے اپنی ٹارچ کی روشنی کا رخ جھیل کے وسط میں کردیا تب ایک بار پھر ان لوگوں نے اس ہوش ربا چیز کو پانی میں تیرتے ہوئے دیکھا، آج بھی اس کا سر اور گردن پانی سے باہر تھی باقی سارا جسم پانی کے اندر تھا وہ ان ہی کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"یار اس نے اس قدر بھاری اور وزنی سونے کی نتھ پہنی ہوئی ہے، پتا نہیں کیا چکر ہے ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی پتھر کی مورتی ہے جو مسلسل ایک ڈائریکشن میں گھوم رہی ہے۔ مجھے تو یہ کوئی انسان نہیں لگتی۔" عبد الرحمان نے کہا۔

"تُو ٹھیک کہہ رہا ہے یار! اگر یہ سونے کی نتھ ہمارے ہاتھ آجائے تو مزا آجائے، ہم اس نتھ کو سنار کے ہاتھوں بیچ دیں گے اور آپس میں چاروں تقسیم کرلیں گے۔" عادل نے کہا۔

"تو پھر ہم میں سے زیاد بہادر کون ہے جو جھیل میں اترے اور تیرتا ہوا اس تک جائے اور یہ نتھ اتار کر لے آئے۔" شہزاد بولا۔

"بھئی مجھے تو تم لوگ معاف ہی رکھو۔" عادل نے کہا۔

"ابے جا ڈرپوک کہیں کا، کہا تو ہے کوئی بے جان پتھر کی مورتی ہے۔" شہزاد بولا۔

"اچھا! اگر تم بہادر ہو تو تم کیوں نہیں چلے جاتے، تیرنا تو تم بھی جانتے ہو۔" عادل نے تلملا کر کہا تو باقی تینوں نے اس کی تائید کی۔

"اچھا اگر تم تینوں کی یہی مرضی ہے تو میں چلا جاتا

ہوں۔'' شہزاد نے سر کھجاتے ہوئے کہا تو وہ اس کو حوصلہ دینے لگے اور اسے پوری طرح تیار کرلیا۔

''مگر یار آج رات تو اتنا اندھیرا ہے میں وہاں تک کیسے پہنچوں گا' کہیں تیرتے ہوئے دوسری جانب نہ نکل جاؤں۔'' شہزاد نے آخری حربے کے طور پر عذر پیش کیا۔

''تم ایسا کرو یہ ٹارچ آن کرکے اپنے دانتوں میں دبالو تاکہ تمہیں راستہ دکھائی دیتا رہے۔'' عبد الرحمان نے مشورہ دیا۔

''اچھا اگر تم تینوں ضد کر ہی رہے ہو تو میں جاتا ہوں۔'' شہزاد نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا اور اپنے کپڑے اتار دیئے' وہ بنیان اور پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ اس نے ٹارچ کو دانتوں میں دبایا اور جھیل کے درمیان میں تیرتا ہوا جانے لگا۔

جیسے ہی وہ اس عورت کے قریب پہنچا اور اس نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اسے روکنا چاہا تو اس کی آنکھیں یک لخت سرخ ہوگئیں اور اس میں سے تیز روشنی نکل کر سیدھی شہزاد کی آنکھوں میں گھس کر اس کی بصارت سلب کرنے لگی۔

مارے گھبراہٹ اور خوف کے شہزاد نے اس کا چہرہ چھوڑ دیا' ٹارچ اس کے منہ سے چھوٹ کر جھیل میں گرگئی اور وہ تیزی کے ساتھ واپس آ گیا۔ وہ ڈر اور خوف سے بری طرح کانپ رہا تھا۔

''کیا ہوا؟ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو' نتھ نہیں لائے؟'' تینوں نے پوچھا۔

''بھاڑ میں گئی وہ نتھ...... ابے وہ تو کوئی بھوت یا چڑیل ہے جیسے ہی میں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھاما اس میں سے تیز روشنی نکلی اور میری آنکھوں کی روشنی جیسے بجھنے لگی' اس کی آنکھیں بالکل سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔'' شہزاد نے کہا۔

''ہاہاہا......'' تینوں قہقہے لگانے لگے۔ ''یار ہم نے تو کوئی روشنی نہیں دیکھی اگر روشنی ہوتی تو اس اندھیرے میں ہمیں ضرور دکھائی دیتی' بات یہ ہوئی ہوگی کہ تُو نے جو ٹارچ دانتوں میں دبائی ہوئی تھی اس کی روشنی ڈائریکٹ اس کی آنکھوں میں پڑی ہوگی۔ ہوسکتا ہے اس کی آنکھوں میں ہیرے جڑے ہوں' پاگل ہے تو بھی...... اچھا خاصا اس تک پہنچ جاتا' خالی ہاتھ میں واپس آ گیا۔''

''تم لوگ چاہے مجھے کچھ بھی کہہ لو' بہر حال میں تو نہیں جانے والا۔ اگر جانا ہے تو خود چلے جاؤ بلکہ اپنے مولانا صاحب کیوں نہیں چلے جاتے' یہ تو بڑے نمازی اور پرہیز گار ہیں۔'' دعائیں شعائیں پڑھتے ہوئے جائیں گے تو وہ انہیں کچھ نہیں کہے گی۔'' شہزاد نے طنزیہ لہجے میں کلیم اللہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

اور پھر سب کے اکسانے اور ایک چیلنج کے طور پر کلیم اللہ جانے کے لیے تیار ہوگیا' اس نے جھیل میں اترنے سے پہلے آیۃ الکرسی پڑھی اور اپنے گرد حصار کیا اور جھیل میں اتر گیا۔ وہ تیرتا ہوا اس تک پہنچ گیا' ٹارچ کلیم اللہ کے بھی دانتوں میں تھی۔

کلیم اللہ نے دیکھا کہ وہ ایک پتھر کی مورتی کا سر ہے جو پانی میں تیر رہا ہے' اس نے اطمینان سے اس کی ناک میں اٹکی ہوئی نتھ اتار لی اور تیزی کے ساتھ واپسی کا سفر شروع کردیا۔ حیرت انگیز طور پر کلیم اللہ نے جیسے ہی وہ نتھ اتاری اس مورتی کا چہرہ پانی کی سطح غائب ہوگیا۔

کلیم اللہ جب نتھ لے کر کنارے پر پہنچا تو سب نے اسے شاباشی دی اور اس کی پیٹھ ٹھونکی' کسی کو خیال نہیں رہا کہ وہ اس چہرے کو دیکھتے جو اَب پانی کی سطح پر موجود نہیں تھا۔

''ابے یار تم اس سر کو ہی ساتھ لے آتے' ہم اس کی آنکھوں میں دیکھتے کہیں واقعی اس کی آنکھوں میں ہیرے نہ ہوں۔'' عادل کے دل میں نتھ کو دیکھ کر مزید لالچ آ گیا۔

''چلو کوئی بات نہیں' آئندہ چکر میں یہ کام بھی کرلیں گے لیکن یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ اس بات کا ذکر کسی اور سے مت کرنا۔ میں کل ہی اس نتھ کو سنار کے پاس لے جاؤں اور اس کی قیمت معلوم کرواؤں گا' خاصی وزنی لگتی ہے۔ اچھی خاصی قیمت ملے گی۔'' کلیم اللہ نے کہا تو سب نے تائید کی۔

طے یہ پایا کہ اس وقت اس نتھ کو کلیم اللہ اپنے پاس رکھے گا پھر اگلے دو دنوں کے بعد ان لوگوں نے ملاقات کا وقت طے کیا اور چاروں بہت خوش اور مطمئن واپس آ گئے۔

سب سے پہلے کلیم اللہ اپنے گھر میں داخل ہوا اور وہ تینوں آگے بڑھ گئے' کلیم اللہ نے جیب سے چابی نکالی اور تالا کھول کر اندر داخل ہوگیا' اس نے احتیاط برتی کہ کوئی آہٹ اور شور پیدا نہ ہو ورنہ ماں کی نیند ٹوٹ جاتی۔

اس نے گیلے کپڑے اتار کر کمرے میں موجود کھونٹی پر لٹکا دیئے اور دوسرا خشک لباس پہن کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ نتھ اس کے گیلے لباس کی جیب میں موجود تھی۔ کلیم اللہ بہت خوش خوش اور مطمئن لیٹ گیا' اسے دو باتوں کی خوشی تھی ایک تو مفت کا سونا ہاتھ آنے کی اور دوسرے دوستوں پر اپنی بہادری کی دھاک بٹھانے کی۔

ابھی اس کی آنکھ ٹھیک طریقے سے لگ بھی نہیں پائی تھی کہ کسی کی تیز سسکیوں سے اس کی آنکھ کھل گئی' وہ چند لمحے آنکھیں کھول کر غور کرنے لگا کہ سسکیوں کی آواز حقیقت میں آ رہی ہے یا وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا لیکن بیداری میں بھی اس نے سسکیوں کی آوازوں کو سنا آوازیں واضح طور پر آ رہی تھیں۔

اسے لگا کہ کہیں اماں کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوگئی' وہ بے تابی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوتا یکایک وہ اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی' اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا اور وہ سسکیاں لے رہی تھی۔

یہ وہی چہرہ تھا جھیل میں تیرنے والا جس کی ناک سے اس نے نتھ اتاری تھی' اس وقت وہی چہرہ اپنے پورے وجود سمیت اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے تیز گلابی رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی اور اس کے لمبے لمبے بال کھلے ہوئے تھے اور گیلے تھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی نہا کر آئی ہو البتہ اس کی ناک کے پاس سے خون کے قطرے تواتر کے ساتھ گر رہے تھے۔

''تم......'' اسے دیکھ کر کلیم اللہ کے جسم میں خوف کی ایک تیز لہر دوڑ گئی اور اس کے منہ سے تحیر زدہ لہجے میں نکلا۔

''ہاں میں......'' اس نے کہا اور اس طرح ایک سسکی لی جیسے اسے تکلیف ہو رہی ہو۔

''تم کون ہو......؟'' کلیم اللہ نے خوف و دہشت سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''اتنی جلدی بھول گئے ابھی تو تم نے ڈاکہ ڈالا ہے اور پھر مزے سے گھر آ کر سو بھی گئے۔'' وہ دو قدم آگے بڑھ کے بولی۔

''مم...... میں...... وہ...... دراصل......'' وہ ہکلا رہا تھا اور الفاظ اس کے منہ سے نکل نہیں پا رہے تھے۔

''میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا تم نے میری نتھ کیوں اتاری۔ بولو......؟'' اس نے آگے بڑھ کر کلیم اللہ کے

سینے پر ہاتھ مارا تو کلیم اللہ چارپائی پر گر گیا۔ خوف سے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی، وہ اسے کیا بتاتا کہ وہ اپنے دوستوں سمیت لالچ کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ چارہ رہا تھا کہ وہ کوئی قرآنی آیت وغیرہ پڑھے لیکن وہ پڑھ نہیں پا رہا تھا۔ جیسے آج سب کچھ اس کے ذہن سے محو ہو گیا تھا کیوں کہ وہ جان چکا تھا کہ اس کے سامنے کوئی انسان نہیں کوئی اور مخلوق کھڑی ہے۔

اور پھر وہ چارپائی پر پڑے ہوئے کلیم اللہ پر چھا گئی اور کلیم اللہ کو کوئی ہوش نہ رہا۔ اس کو ہوش آیا تو اس کی ماں اس کے پاس بیٹھی اسے زور زور سے ہلاتے ہوئے آوازیں دے رہی تھی۔

"آنکھ کھول میرے بچے...... کیا ہوا تجھے، اٹھ کیوں نہیں رہا۔"

ماں کو دیکھ کر کلیم اللہ کی جان میں جان آئی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ اٹھ نہیں سکا اس کے جسم میں بہت شدید درد ہو رہا تھا اور سر بھی درد کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا۔

"کیا ہوا بیٹا کلیم اللہ! تُو ٹھیک تو ہے۔" ماں نے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا تو اس کی آنکھوں کے سامنے رات کا منظر آ گیا۔ وہ حسن و خوب صورتی کا مجسمہ اس کی سسکیاں اس کی ناک سے بہتے ہوئے خون کے قطرے اور پھر کیا ہوا تھا...... اس نے اپنے ذہن پر زور ڈالا، اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کے سینے پر بہت سارا وزن رکھ دیا ہو اور وہ اس وزن کے تلے دبا جا رہا تھا اس کا دم گھٹنے لگا تھا اور پھر جیسے اس کی سانسیں بند ہو گئی تھیں، سب کچھ یاد آتے ہی وہ ایک ہلکی سی چیخ مار کر اپنی ماں کے گلے لگ گیا۔

"اماں...... وہ...... وہ آ گئی...... اماں! میں نے تو صرف......" وہ مارے خوف کے گھگھیانے لگا۔ ماں نے بڑی مشکل سے اسے خود سے علیحدہ کر کے پوچھنا چاہا کہ وہ کس کے بارے میں کہہ رہا ہے کہ وہ آ گئی لیکن ذرا کی ذرا میں کلیم اللہ کا جسم بُری طرح کپکپانے لگا اور اسے دیکھتے ہی دیکھتے تیز بخار ہو گیا۔

بخار کے دوران بھی وہ اول فول بکتا رہا، اس کی ماں تنہا اس کی پٹی سے لگی بیٹھی اس پر قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر دم کر رہی تھی اور پھر آہستہ آہستہ کلیم اللہ نارمل حالت میں آ گیا۔ اس کا بخار بھی اتر گیا۔

اس کی ماں نے اسے خبردار کیا کہ اب سے آئندہ وہ رات کے وقت جنگل میں نہیں جائے گا۔ اللہ جانے کون سی بلائیں رات کے اندھیرے میں گھومتی پھرتی ہیں۔ ماں نے اٹھ کر اسے دودھ گرم کر کے پلایا اور ایک جگ میں پانی پر دم کر کے رکھ دیا کہ اسے وقفے وقفے سے پیتا رہے۔

شام تک کلیم اللہ بالکل ٹھیک تھا، طبیعت بحال ہونے پر اس نے اپنی رات والی اتاری جانے والی قمیص کھونٹی پر سے اتاری اور اس کی جیب میں میں ہاتھ ڈالا تاکہ اس نتھ کو وہ واپس اس جھیل میں جا کر ڈال آئے کہ جس کی چیز تھی اسے لوٹا دی جائے تاکہ اب وہ اسے دوبارہ تنگ نہ کرے لیکن وہ نتھ اسے کہیں نہ ملی، اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ رات کو اس نے گھر آ کر وہ نتھ دیکھی تھی اور جیب میں رکھ دی تھی لیکن اب وہ غائب ہے پھر اسے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ عورت اپنی چیز خود ہی واپس لے گئی ہو۔

اسے یہ خبر اپنے دوستوں کو دینی تھی اس لیے وہ شام کو گھر سے نکل کر شہزاد کے گھر کی جانب چلا، شہزاد کا گھر اس کے گھر کے نزدیک ہی تھا۔ شہزاد اسے غیر متوقع طور پر دیکھ کر حیران ہوا اور بولا۔

"کیا ہوا؟ کیا وہ نتھ سنار کے پاس بیچ دی ہے، کتنے میں بکی......؟" اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں یار ایسی بات نہیں ہے، تم سب سے مجھے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ آؤ پہلے عادل اور عبد الرحمان کے گھر چلتے ہیں، جب سب اکٹھے ہو جائیں گے تو میں تم سب کو ایک ساتھ وہی بات بتاؤں گا۔"

"معاملہ کیا ہے، کچھ تو بتاؤ۔" شہزاد نے اس کے چہرے پر پھیلی گمبھیر سنجیدگی دیکھتے ہوئے کہا۔

"سب پتا چل جائے گا، تھوڑا صبر کرو۔" کلیم اللہ نے جواب دیا پھر وہ باقی اپنے دوستوں کے گھر گئے اور انہیں ساتھ لے کر وہ باہر پیپل کے نیچے بنے مٹی کے ایک ٹیلے کے اوپر جا کر بیٹھ گئے۔ تینوں دوستوں کو بہت تجسس ہو رہا تھا کہ کلیم اللہ کیا بات بتانے والا ہے؟

لیکن جب اس نے اپنے دوستوں کو اپنے اوپر گزرنے والی کیفیت اور اس عورت کی آمد کے بارے میں بتایا تو خوف کی پرچھائیں سب ہی کے چہروں پر دکھائی دینے لگی۔

"لیکن اس سارے قصے میں سب سے اہم بات جو ہے وہ یہ ہے کہ وہ نتھ میرے پاس سے غائب ہو گئی ہے۔" کلیم اللہ نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ تینوں ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگے ذرا دیر پہلے عود کر آنے والا خوف ہوا ہو گیا تھا اس کی جگہ غصہ نے لے لی تھی۔

"اوہو اب سمجھ میں آیا کہ تم نے یہ اتنی لمبی چوڑی کہانی کیوں گھڑی ہے تاکہ تم اس نتھ کو اکیلے ہضم کر سکو لیکن ہم ایسا ہونے نہیں دیں گے۔" شہزاد نے عادل اور عبد الرحمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میرا کہا ہوا ایک ایک لفظ سچ ہے میں بھلا اپنے بھائیوں جیسے دوستوں کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہوں اور تم لوگ میرے بارے میں ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہو؟ کیا تم لوگ میرے مزاج اور میری فطرت سے واقف نہیں ہو۔" کلیم اللہ نے دکھی لہجے میں کہا۔

"دولت بہت بُری بلا ہے میرے دوست! اس کی خاطر بھائی بھائی کو، شوہر بیوی کو اور اولاد اپنے باپ تک کو نہیں چھوڑتی تو تم تو صرف ہمارے دوست ہو۔" عادل نے کہا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ تم لوگ بول رہے ہو۔" کلیم اللہ نے کہا۔

"اور ہمیں بھی یقین نہیں آ رہا کہ تم...... ایسا کر سکتے ہو۔"

وہ تینوں کلیم اللہ کے پیچھے پڑ گئے اسے بُرا بھلا کہہ رہے تھے، لعنت ملامت کر رہے تھے تب ہی انہیں آہٹ محسوس ہوئی۔ چاروں نے بے ساختہ پیپل کے موٹے اور چوڑے تنے کے پیچھے دیکھا جہاں سے وہ خراماں خراماں چلتی ہوئی ان کے سامنے آ گئی اس وقت بھی اس کی آنکھیں ہیروں کی مانند چمک رہی تھیں اور اس میں سے تیز روشنی نکل رہی تھی اس نے وہی تیز گلابی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ لمبے بال کھلے ہوئے تھے اور پیچھے سے دو حصوں میں تقسیم کر کے آگے ڈالے ہوئے تھے اور بالوں کے سروں سے پانی کے قطرے بوندوں کی مانند گر رہے تھے۔

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تو اس کے ہاتھ میں وہی نتھ تھی۔

"تم اسی کے لیے اپنے دوست پر الزام لگا رہے ہو، یہ چیز میری تھی اور میں نے لے لی۔ تم اس میں حصے دار کیسے ہو سکتے ہو۔" اس نے غصے سے بل کھا کر کہا۔

اس کو دیکھ کر عادل اور عبد الرحمان تو خوف کے

مارے بے ہوش ہو چکے تھے البتہ کلیم اللہ اور شہزاد بہت ہمت سے جمے بیٹھے تھے۔

"کون ہو تم......؟" کلیم اللہ نے بہت ہمت کر کے سوال کیا۔

"رادھیکا......" اس نے کہا اور ان کی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہوگئی۔ کلیم اللہ اور شہزاد نے عادل اور عبدالرحمان کو وہیں بے ہوشی کی حالت میں چھوڑا اور اپنے اپنے گھروں کی جانب دوڑ لگادی۔

راستے میں مغرب کی اذان سنائی دی لیکن پہلی مرتبہ کلیم اللہ مسجد جانے کے بجائے سیدھا گھر میں پہنچ گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ گھر جاکے نماز ادا کرے گا لیکن امی کو نماز میں مصروف دیکھا اور باتھ روم چلا گیا اس کے پیٹ میں رہ رہ کر ہول کے درد ہو رہے تھے۔

جب وہ باہر آیا اور ہر جانب رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا وہ نہ جانے کتنی دیر باتھ روم میں بیٹھا رہا تھا پھر بے دم سے ہو کر چارپائی پر گر پڑا۔

اس دن اس نے نماز عشاء بھی نہیں پڑھی، ماں نے ڈانٹ کر مسجد جانے کے لیے کہا تو وہ ادھر اُدھر گھوم کر اور وقت گزار کر گھر واپس آ گیا اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کا دل بس یہ چاہ رہا تھا کہ وہ سو جائے، ماں کو تو عادت ہی تھی کہ نماز عشاء ادا کرتے ہی وہ سونے کے لیے لیٹ جاتی تھی کیوں کہ اسے تہجد کے لیے اٹھنا ہوتا تھا۔ گھر میں گھپ اندھیرا تھا ابھی کلیم اللہ کی نیند گہری نہیں ہوئی تھی کہ اس کی ناک میں تیز خوشبو آئی اور ساتھ ہی کسی کے ہاتھ کا لمس اسے اپنے جسم پر محسوس ہوا اس نے جھٹ آنکھیں کھول دیں۔

جو کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اس نے اسے مبہوت کر دیا تھا اس کے دل کی دھڑکن کئی گناہ بڑھ گئی تھی، جسم کا درجہ حرارت کئی گناہ بڑھ گیا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو...... حیران ہو کہ میں کیسے آ گئی؟ تمہاری یاد اور تمہاری کشش مجھے یہاں کھینچ لاتی ہے، تم ہی تو محبوب ہو میرے......"

وہ بول کیا رہی تھی کلیم اللہ کو لگا اس کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں، اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا "محبوب......"

"تو اور کیا...... تم ہی تو میری تنہائی میں مخل ہوتے تھے، میرے چہرے کو چھوا تھا اور پھر میری نتھ اتار لی۔ کیا مطلب ہوا اس کا؟" وہ محبت سے چُور لہجے میں بولی۔

"پتا نہیں۔" اس نے خواب کی سی کیفیت میں کہا۔

"تمہارا یہ گھر اچھا نہیں ہے، میں شہزادی ہوں اور اپنے محل میں رہتی ہوں آؤ میرے ساتھ میرے محل میں چلو۔" اس نے کلیم اللہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔

کلیم اللہ کو زور کا چکر آیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور جب یہ اندھیرا چھٹا تو اس نے اپنے آپ کو ایک بہت عالی شان اور شاندار کمرے میں پایا۔ ایک انتہائی خوب صورت اور نفیس چھپر کھٹ تھا، جس پر بہت نرم و گداز بستر بچھا تھا اس نے رادھیکا کو دیکھا وہ سرخ رنگ کی بنارسی ساڑھی اور ڈھیروں سونے کے زیورات سے لدی بندھی اس کے نزدیک بیٹھی تھی۔ اس نے کلیم اللہ کے گلے میں اپنی بانہیں ڈالیں اور ایک ادا کافرانہ سے بولی۔

"دیکھو کتنی حسین رات ہے یہاں اس کمرے میں صرف تم ہو اور میں ہوں۔ آؤ ہم عشق و محبت کی باتیں کریں، سرتا پا ڈوب جائیں عشق کے اس سمندر میں، پھر تم تم نہ رہو اور میں میں نہ رہوں...... میرے محبوب!"

اور وہ کلیم اللہ پر چھاتی چلی گئی، وہ کیسی کیف و مستی کی کیفیت تھی جس میں کلیم اللہ ڈوب کر ابھر رہا تھا۔ لطف و انبساط کا یہ کھیل کئی گھنٹوں جاری رہا اور پھر کلیم اللہ کی آنکھوں کے سامنے پھر اندھیرا سا چھا گیا۔

آج بھی اس کی آنکھ ماں کے بُری طرح جھنجوڑنے پر کھلی تھی۔ وہ ماں کو اجنبی نگاہوں سے دیکھنے لگا، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کے سامنے صرف رادھیکا ہو، وہ ہو اور بس وہ ہی ہو۔ اس کی ماں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا تو چونک پڑی، اس کی رنگت بالکل زرد ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے یہ ایک ہی رات میں کلیم اللہ کو کیا ہو گیا۔

"کیسی طبیعت ہے میرے بچے! تُو تو صدیوں کا بیمار دکھائی دے رہا ہے۔"

"میں ٹھیک ہوں، تُو جا یہاں سے۔" اس نے دیکھا کہ کمرے میں رادھیکا موجود ہے لیکن کمرے کے کونے میں دیوار کے ساتھ لگی کھڑی ہے، وہ اشارے سے اس سے کہہ رہی تھی کہ ماں کو کمرے سے نکال دے۔

"اچھا بیٹا تُو نے یہ جگ کا دم کیا ہوا پانی بھی نہیں پیا، یوں ہی رکھا ہے۔" ماں نے کہا۔

تو رادھیکا نے اسے اشارہ کیا کہ ہاتھ مار کر پانی کا جگ گرادو اور ماں کو کمرے سے جانے کا کہو۔ کلیم اللہ نے غصے میں ہاتھ مار کر پانی کا جگ گرادیا اور ماں سے چیخ کر بولا کہ وہ کمرے سے چلی جائے۔

کلیم اللہ کی ماں اس کی حالت دیکھتے ہوئے سمجھ گئی کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے اس نے زور زور سے آیۃ الکرسی پڑھنا شروع کی تو رادھیکا غائب ہوگئی۔ یہ دیکھ کر کلیم اللہ کو بہت غصہ آیا، اس نے ماں کو زور سے دھکا دیا اور کہا کہ وہ کمرے سے دفع ہو جائے۔

کلیم اللہ چارپائی سے اٹھا تو اسے زور کا چکر آ گیا اور وہ بے دم سا ہو کر چارپائی پر گر پڑا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا اور پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

شہزاد جب اس رات گھر پہنچا تو اسے بھی بہت تیز بخار ہو گیا تھا اور وہ بخار کی حالت میں مسلسل بڑبڑا رہا تھا کہ وہ آ گئی۔ وہ ہمیں نہیں چھوڑے گی، مجھے بچالو...... اس کے گھر والوں نے فوراً محلے کی مسجد کے پیش امام صاحب کو گھر پر بلوایا، انہوں نے اس پر دم کیا اور بتایا کہ راہ چلتے ہوئے لمحہ بھر کو کسی "اوپری شے" کا اس کے ساتھ ہلکا سا ٹکراؤ ہو گیا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ بات زیادہ بگڑی نہیں ہے۔ دو تین دن میں وہ بالکل ٹھیک تو ہو گیا لیکن گھر سے باہر نکلتے ہوئے اسے اب بھی خوف آ رہا تھا، اس لیے وہ گھر پر ہی تھا اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے باقی تینوں دوستوں کے کیا حال ہیں۔

عادل اور عبدالرحمان بھی ہوش میں آ کر سرپٹ اپنے گھروں کی جانب دوڑے اور پھر شہزاد کی طرح بخار میں مبتلا ہو گئے اور پھر ٹھیک ہو گئے۔

لیکن کلیم اللہ کا حال ان تینوں سے مختلف تھا، وہ اپنے کمرے میں چارپائی پر تنہا لیٹا رہتا، ماں جیسے ہی کمرے میں آتی وہ بُری طرح چیخنے اور چلانے لگتا۔ وہ ایسا اس لیے کرتا تھا کہ رادھیکا اسے ایسا کرنے کے لیے کہتی تھی، وہ دن رات اس کے ساتھ ہی رہتی۔ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی وہ کلیم اللہ کو اپنے ساتھ لے جاتی۔ کلیم اللہ کا وقت اس کے حساب سے بہت اچھا گزرتا تھا، کیف، مستی اور سرور کا یہ دورانیہ طویل ہوتا جا رہا تھا۔

لیکن صبح کلیم اللہ جب بیدار ہوتا تو اسے اپنا جسم بالکل بے جان معلوم ہوتا۔ پورا ایک ہفتہ اسی کیفیت میں گزر گیا، تب کلیم اللہ کی ماں روتی پیٹتی پیش امام صبغت اللہ کے پاس پہنچی اور انہیں کلیم اللہ کی ساری

کیفیت بیان کی۔

کلیم اللہ کا حال سنا تو انہیں قصبے کے دوسرے لڑکوں کا خیال آیا کہ ان کے والدین بھی ان کے پاس آئے تھے اور انہیں یہی اندازہ ہوا تھا کہ دوسری مخلوق سے ان کا ذرا سا ٹکراؤ ہوا تھا' انہیں خیال آیا تو انہوں نے کلیم اللہ کی ماں سے پوچھا کہ کیا تم ان لڑکوں کو جانتی ہو تو اس نے بتایا کہ وہ تینوں اور میرا کلیم اللہ بچپن کے دوست ہیں۔ اب یہ سب جوان ہیں اور اپنے اپنے روزگار میں مصروف ہیں' اس لیے ہفتے کی رات کو چاروں جنگل میں شکار کے لیے یا جھیل کے کنارے بیٹھنے کے لیے جاتے ہیں۔

مولانا صبغت اللہ صاحب نے کچھ دیر تک پڑھا پھر اس طرح سر ہلایا جیسے وہ جان گئے ہوں کہ کلیم اللہ کے ساتھ کیا معاملہ ہے اس کی ماں کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ تمہارا لڑکا قوم جنات کے قبضے میں ہے۔

ماں یہ سن کر بُری طرح کانپنے لگی اس نے روتے ہوئے فریاد کی کہ کلیم اللہ میرے بڑھاپے کا آخری سہارا ہے' اللہ کے واسطے کچھ کریں تو وہ اس کے گھر آ گئے۔

وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے تو کلیم اللہ نے چیخنا اور چلانا شروع کر دیا' وہ مولانا صاحب کو ایسی گندی گالیاں دے رہا تھا جو شاید اس سے پہلے خود کلیم اللہ نے کبھی سنی بھی نہیں تھیں' جیسے ہی وہ دونوں کمرے میں داخل ہوتے تو ہڈیوں کا ڈھانچا کلیم اللہ بہت باریک آواز میں چیخ کر بولا۔

"بڑھیا یہ تو کس بڈھے کو لے کر آ گئی ہے' دفع ہو جاؤ تم دونوں۔"

کلیم اللہ کی حلقوں میں دھنسی آنکھیں سرخ انگارے کی مانند ہو رہی تھیں۔

"دیکھئے مولوی صاحب میرے جوان بیٹے کی اس ایک ہفتے میں حالت ہو گئی ہے۔" اس کی ماں نے روتے ہوئے کہا۔

مولانا صاحب کی نگاہیں کلیم اللہ کے اوپر گڑھی ہوئی تھیں' وہ تیزی کے ساتھ کچھ پڑھ رہے تھے۔

اچانک ہی مولانا صاحب زور سے پیچھے کی جانب گر پڑے ایسا لگا جیسے کسی نے ان کو پیچھے کی جانب دھکا دیا ہو' ابھی وہ اٹھ بھی نہیں پائے تھے کہ ایک بار پھر انہیں دھکا پڑا اور اس مرتبہ ان کا سر زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا ان کا سر پھٹ گیا اور اس سے خون بہنے لگا۔ وہ تڑپ کر تیزی سے اٹھے انہیں پھر دھکا پڑا وہ پھر دیوار سے ٹکراتے۔

کوئی نادیدہ وجود انہیں مسلسل دھکے دے رہا تھا ان کا سر بار بار دیوار سے ٹکراتا' وہ اس مرتبہ اٹھے کہ کمرے سے باہر نکل جائیں کہ پھر کسی نے ان کا بازو زور سے پکڑا اور انہیں دیوار پر دے مارا۔ مولوی صاحب کا بازو کندھے سے اتر گیا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔

کلیم اللہ کی ماں یہ سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مولانا صاحب کے ساتھ یہ ہو کیا رہا ہے۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہے بڑھیا! اب آئندہ اگر کسی مولوی کو یہاں لے کر آئی تو تیرا اس سے زیادہ بُرا حشر ہو گا۔" کلیم اللہ نے سرخ انگارہ سی آنکھیں نکال کر باریک سی آواز میں کہا۔

وہ تھر تھر کانپ رہی تھی اور اس حقیقت کو بھی سمجھ رہی تھی کہ اس کے بیٹے پر دوسری مخلوق کا قبضہ ہو گیا ہے' اس کے جسم میں وہی بول رہی ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ جوڑتے ہوئے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم جو بھی ہو میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ مجھ بیوہ پر رحم کرو اور اس کا پیچھا چھوڑ دو۔ میرا اس دنیا میں اس کے سوا کوئی نہیں ہے' یہ میرے جینے کا واحد سہارا ہے۔ اللہ کے لیے اس کے اوپر سے چلی جاؤ۔"

"تو نہیں جی سکتی تو مت جی' مر جا لیکن میں اسے نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ جب تک زندہ ہے میرا ہی رہے گا اور جو کوئی بھی اس کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا میں اسے مار ڈالوں گی' سمجھی بڑھیا۔" اس نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

کلیم اللہ کی ماں اب مولانا صاحب کی جانب متوجہ ہوئی' وہ بے ہوش پڑے تھے اور ان کے سر اور ناک سے بہت خون بہہ رہا تھا' وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکلی اور مٹکے سے پانی لے کر آئی اور مولانا صاحب کے چہرے پر چھڑکا۔ ان کے پپوٹوں نے ذرا سی حرکت کی پھر ساکت ہو گئیں۔ اس نے اپنا دوپٹہ گیلا کیا اور ان حصوں کو دبایا جہاں سے خون رس رہا تھا۔ بار بار پانی کے چھینٹے مارنے سے مولانا صاحب کو ہوش آنے لگا اور ان کے منہ سے کراہیں بلند ہونے لگیں۔

"اللہ کا شکر ہے مولانا صاحب آپ کو ہوش آ گیا۔" کلیم اللہ کی ماں نے روتے ہوئے کہا تو وہ بولے۔

"بہن اس کے اوپر ایک شیطان نے قبضہ کر رکھا ہے یہ میرے بس کا کام نہیں ہے۔" انہوں نے خاموش لیٹے کلیم اللہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

کلیم اللہ انہیں کھوئی کھوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا' یہ وہ لڑکا تھا جو پانچ وقت پابندی سے نماز کے لیے مسجد آیا کرتا تھا اور انہیں دیکھتے ہی سلام کیا کرتا تھا لیکن اس وقت اس کی آنکھوں میں کوئی شناسائی نہیں تھی۔

"تم اس کا حال دیکھ رہی ہو اس بدبخت نے اس کا کیا حال کر دیا ہے۔ ہڈیوں کا ڈھانچا بن گیا ہے

اقوال زرین

۱۔ پستی کو حقیر مت جانو کیونکہ اس نے بلندی کا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔

۲۔ دانا وہ ہے جو کم بولے اور زیادہ سنے۔

۳۔ ایمان کے بعد مخلص اور دانا دوست تلاش کرو یہ ایک پھل دار درخت ہے نیچے بیٹھو گے تو سایہ رہے گا اور اوپر چڑھو گے تو پھل دے گا۔

۴۔ پاک باطن رہنا چاہتے ہو تو حسد سے بچو۔

۵۔ نیک آدمی وہ نہیں جو نیکی کر سکتا ہو بلکہ نیک آدمی وہ ہے جو برائی نہیں کر سکتا۔

۶۔ جو صلح کا ہاتھ بڑھائے اس کا خیر مقدم خلوص اور گرمجوشی سے کرو۔

۷۔ رات کو آہستہ اور نرمی سے بات کرو اور دن کو چاروں طرف دیکھ کر بات کرو۔

۸۔ غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہ ہوا اور جس کا اللہ دوست ہو وہ دولت مند ہے۔

۹۔ مسلمان میں تین چیزوں سے محبت بڑھتی ہے۔ سلام کرنے سے' دوسروں کے لیے مجلس میں جگہ خالی کرنے سے اور مخاطب کو بہترین نام سے پکارنے سے۔

۱۰۔ سچا دوست وہی ہے جو تمہیں عیوب سے آگاہ کرے۔

۱۱۔ برے دوست سے بچو کہیں وہ تمہارا تعارف ہی نہ بن جائے کیونکہ آدمی اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔

(مرسلہ: **ارسلان علی وارثی**...... کراچی)

تمہارا بیٹا!'' مولانا صاحب نے کراہتے ہوئے کہا اور بمشکل اٹھ کر کھڑے ہوئے اور وہاں سے چلے گئے۔

اگلا پورا ہفتہ کلیم اللہ کا اس کیفیت میں گزرا۔ وہ بس بستر پر پڑا رہتا' نہ کھاتا نہ پیتا۔ اس کو دیکھنے سے یہ لگ رہا تھا کہ کلیم اللہ چند لمحوں کا مہمان ہے' دکھیا ماں کیا کرتی سوائے رو رو کے اللہ سے دعا کرنے کے۔

سارے محلے میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ کلیم اللہ پر کسی ڈائن کا اثر ہو گیا ہے جو مسلسل اس کا خون پی رہی ہے' اب کلیم اللہ مرنے والا ہے۔

اس روز جب کلیم اللہ کی ماں' بیٹے کے سرہانے بیٹھی رو رہی تھی اور اللہ سے اس کی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی وہ بار بار کلیم اللہ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کی دل کی دھڑکن چیک کرتی کہ اس کا بیٹا ابھی زندہ بھی ہے یا نہیں۔ اس وقت اس کے دوست شہزاد' عادل اور عبدالرحمان اس کے گھر آئے اور کلیم اللہ کو اس حال میں دیکھا تو اس کو گود میں اٹھا کر ڈاکٹر کے کلینک لے کر آئے۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد بتایا کہ اس کے جسم میں خون کی شدید ترین کمی ہے اور بلڈ پریشر خطرناک حد تک لو ہے' ڈاکٹر نے فوری طور پر خون چڑھانے کا مشورہ دیا۔

اس کے دوستوں نے ڈاکٹر سے کہا کہ جیسا آپ مناسب سمجھیں وہ کریں' ہم ہر طرح کے تعاون کے لیے حاضر ہیں' بس ہمارے دوست کی جان بچنی چاہیے۔

ڈاکٹر نے فوراً بلڈ ٹیسٹ کروا کر اس کا بلڈ گروپ معلوم کروایا اور اسے بلڈ چڑھایا۔ بلڈ چڑھا تو کلیم اللہ نے اپنی آنکھیں کھول دیں لیکن وہ اپنے دوستوں کو بھی اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا' وہ اپنی ماں سمیت ہر ایک کو بھول چکا تھا' اس کے ذہن اور نگاہوں میں اگر کوئی تھا تو وہ رادھیکا تھی۔

کلیم اللہ کو وقفے وقفے سے تین بوتلیں خون دیا گیا' ڈاکٹر کے مطابق ابھی اسے مزید خون چڑھانا تھا لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ بلڈ ٹیسٹ کرنے پر رزلٹ وہی پہلے دن والا آ رہا تھا۔

ڈاکٹر حیران تھے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر خون جا کہاں رہا ہے' کلیم اللہ کی حالت سدھر کیوں نہیں رہی ہے تب وہ تینوں دوست ایک بار پھر مولوی صاحب کے پاس گئے اور انہیں کلیم اللہ کا سارا حال سنایا تو انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کوئی شیطانی شے ہے میں اس کا علاج کرنے سے قاصر ہوں۔ البتہ حیدرآباد میں میرے استاد محترم رہتے ہیں' پیشے کے لحاظ سے وہ حکیم ہیں لیکن روحانی علوم کے بھی ماہر ہیں' خاص طور پر جنوں وغیرہ کو قابو میں کرنا اور ان کے اثرات سے انسان کو پاک کرنے کے علم پر بھی انہیں دسترس حاصل ہے' میں تمہیں ان کا پتا دے دیتا ہوں تم اگر جا سکتے ہو اور انہیں یہاں لا سکتے ہو تو لے آؤ ویسے وہ کہیں آتے جاتے نہیں ہیں' کافی عمر رسیدہ ہو چکے ہیں۔''

کلیم اللہ کے دوستوں نے مولانا صاحب سے ایڈریس لیا اور فوری طور پر حیدرآباد روانہ ہو گئے چند گھنٹوں میں وہ حکیم مولانا فراست اللہ کے مطب پر پہنچ گئے اور انہیں کلیم اللہ کا سارا حال بتایا۔ مولانا فراست نے سب کچھ خاموشی سے سنا پھر پانچ منٹ تک آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے پھر آنکھیں کھولیں اور بولے۔

''تم لوگوں نے اسے کیوں چھیڑا تھا اور خاص طور پر کلیم اللہ نے تو بہت ہی بری حرکت کی تھی' وہ ایک جنی ہے اور ہندو ہے۔ کلیم اللہ نے اس کی نتھ اتاری تھی اس لیے وہ روزانہ اسے اپنے ساتھ لے جاتی ہے' وہ

بدکار ہے۔ کلیم اللہ اس کو برداشت نہیں کر پا رہا ہے' وہ جسمانی طور پر بہت کمزور ہو چکا ہے۔ وہ مر جائے گا تو وہ اسے چھوڑ دے گی۔''

''حضرت ہم اپنی غلطی تسلیم کرتے ہیں واقعی ہم سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے لیکن جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا لیکن اگر اب بھی آپ کلیم اللہ کی جان اس سے چھڑا دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ کلیم اللہ اسپتال میں ہے اتنا لمبا سفر نہیں کر سکتا' آپ ہمارے ساتھ چلیں' ہم آپ کو خود چھوڑ جائیں گے۔'' شہزاد نے روہانسے لہجے میں کہا تو حکیم صاحب پھر مراقبے میں چلے گئے پھر آنکھیں کھول کر بولے۔

''چلو...... جلدی کرو۔''

شہزاد نے ایک پرائیوٹ گاڑی لی اور حکیم صاحب کو لے کر آ گئے' انہوں نے راستے میں ہی کہہ دیا تھا کہ کلیم اللہ کو اسپتال سے گھر لانا ہو گا۔ وہ کلیم اللہ کے گھر پر رکے کلیم اللہ کی ماں اور عادل گھر پر تھے' انہیں کچھ سامان کی ضرورت تھی جو عادل نے مہیا کر دیا۔

شہزاد اور عبدالرحمان زبردستی اپنی ذمہ داری پر کلیم اللہ کو اسپتال سے لے کر آئے کہ اسے شہر کے بڑے اسپتال لے جا رہے ہیں۔

حکیم صاحب نے لب دم کلیم اللہ کے سامنے بیٹھ کر عمل پڑھنا شروع کیا تو وہ کلیم اللہ پر حاضر ہو گئی لیکن جیسے جیسے وہ پڑھتے جاتے تھے کلیم اللہ کے منہ سے کرب و اذیت میں ڈوبی ہوئی نسوانی آوازیں بلند ہو رہی تھیں پھر وہ گڑگڑاتے ہوئے التجائیں کرنے لگی کہ اسے چھوڑ دیا جائے وہ اب کلیم اللہ کے پاس کبھی نہیں آئے گی لیکن حکیم صاحب نے اس کے جھوٹے وعدے کا اعتبار نہ کیا اور کہا کہ کلیم اللہ کے اوپر سے ہٹ کر ہمارے سامنے حاضر ہو۔

تب سب کی آنکھوں نے ایک نہایت حیرت انگیز منظر دیکھا' کلیم اللہ کے جسم میں تھرتھراہٹ ہوئی اور ایک دھوئیں کی لکیر سیدھی بلند ہوئی اور پھر اس دھوئیں نے ایک انسانی ہیولے کی شکل اختیار کر لی۔

وہ سب اسے دیکھ کر چونک پڑے کہاں تو انہوں نے ایک جوان اور انتہائی حسین و جمیل عورت دیکھی تھی اور کہاں یہ بدشکل سیاہ رنگت کی پوپلی بڑھیا' جس کے سر پر چند بال تھے۔ وہ گردن جھکائے مجرموں کی مانند دوزانو بیٹھی تھی' حکیم صاحب نے کڑک لہجے میں اس کا نام پوچھا تو اس نے رادھیکا بتایا۔

''کلیم اللہ کو کیوں تنگ کیا' تو ان کے سامنے آتی کیوں تھی؟'' انہوں نے گرجدار آواز میں پوچھا۔

''میں بوڑھی ہو گئی تھی اور مجھے اپنی جوانی دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ایک توانا اور جوان مرد کی ضرورت تھی اگر میں ان کے سامنے حسین اور جوان عورت بن کر نہ آتی تو یہ کبھی بھی میری جانب راغب نہ ہوتے۔ دوسرے یہ کہ میں انسانوں کی فطرت سے بھی واقف ہوں کہ سونا دیکھ کر ان کی رال ٹپک پڑتی ہے یہ میری سونے کی نتھ کی لالچ میں میرے نزدیک آیا اور مجھے چھوا اور میں نے اس پر قبضہ کر لیا۔''

''کیا تو اس پر عاشق ہو گئی ہے؟'' انہوں نے کہا۔

''نہیں جب یہ مر جاتا تو میں کوئی دوسرا جوان اور توانا مرد تلاش کر لیتی۔''

''اب تیرا کیا ارادہ ہے؟'' انہوں نے پھر پوچھا۔

''آپ کا حکم ہے تو میں اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہوں اور دوبارہ کبھی اس کے پاس نہیں آؤں گی۔'' اس نے کہا۔

''لیکن دوسرا انسان تلاش کر کے اس کو تنگ کرے گی۔'' انہوں نے کہا تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''جواب دے' بولتی کیوں نہیں تو ایسا ہی کرے گی

ناں۔'' انہوں نے ڈانٹ کر کہا لیکن وہ پھر بھی خاموش رہی۔

''تیری خاموشی مجھے یہ بتارہی ہے کہ تُو یہی کرے گی۔ اس لیے تجھے آزاد چھوڑنا خطرناک ہے۔'' انہوں نے کہا تو وہ ان کی منت کرنے لگی لیکن اب حکیم صاحب کے لب پھر تیزی سے ہلنے لگے ان کی آنکھیں بند تھیں اور سب ہی نے یہ محسوس کیا جیسے کوئی اس کو وہاں سے گھسیٹ کے لے جارہا ہو تھوڑی دیر بعد انہوں نے آنکھیں کھولی اور بولے۔

''اب وہ بد بخت کبھی کسی دوسرے انسان کو تنگ نہیں کرے گی۔''

''محترم آپ نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟'' عادل نے پوچھا۔

''اسے اس کی قوم کے حوالے کردیا۔ اس کی قوم کے بڑے بھی ہمارے بے دام غلام ہیں۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا پھر بولے ''بہن! اپنے بیٹے سے بات کروٗ یہ اب مکمل طور پر اس کے اثر سے آزاد ہوگیا ہے۔''

''کلیم اللہ...... میرے بیٹے تو اب کیسا ہے؟'' اس کی ماں تڑپ کر اس کے پاس گئی اور آنکھیں موندے لاغر وجود پر فرط محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''اماں......'' اس نے آنکھیں کھولیں اور کمزور آواز میں بولا۔

''میرا بچہ......'' اس نے محبت سے اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے کہا اور دونوں ہاتھ فضا میں ربّ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے انداز میں اٹھا کے بولی۔

''شکر ہے اللہ کا کہ میرے بچے نے اتنے عرصے بعد مجھے پہچانا ہے۔''

''کیا ہوا اماں! تم رو کیوں رہی ہو۔'' اس نے پوچھا پھر جب وہاں موجود اپنے دوستوں اور حکیم صاحب پھر نگاہ پڑی تو حیرانی سے بولا۔

''تم لوگ...... یہاں کیا کررہے ہوٗ میں تمہارے ہی پاس آنے والا تھا اور یہ کون ہیں؟''

''ہم تمہیں سب کچھ بتادیں گے' تم پریشان مت ہوٗ بس اللہ کا اور حکیم صاحب کا شکریہ ادا کرو کہ تمہیں اس بلا سے نجات مل گئی۔''

اور قارئین! کلیم اللہ کو پندرہ دن اسپتال میں داخل رہنا پڑا اس کے ایک بار پھر خون چڑھایا گیا' اس کے بعد وہ دن بدن صحت یاب ہوتا چلا گیا۔

صحت یاب ہونے کے بعد اسے کچھ کچھ دھندلا دھندلا یاد آتا تھا تو وہ مارے شرم کے زمین میں گڑ جاتا اور رو رو کر اللہ سے اس گناہ کی توبہ کرتا جس میں وہ اپنی مرضی کے خلاف مبتلا کردیا گیا تھا۔

وہ یہ بھی مانتا تھا کہ اس سے دو گناہ سرزد ہوئے ایک تو جوان اور حسین عورت دیکھ کر دل میں بار بار اس کا خیال آنا' دوسری بات یہ کہ کسی دوسرے کی چیز ناجائز ہتھیانا۔ اسے سونے کا لالچ آیا اور جب وہ اس کے سامنے حسین عورت کے روپ میں آئی اور اپنا آپ اس کو پیش کیا تو اسے کیوں نہیں اللہ کا خوف آیا' وہ کیوں بدکاری پر آمادہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے اطاعت گزار بندوں میں شامل فرمائے کہ ہم اللہ کے حرام کو حرام سمجھیں اور اس سے ہمیشہ بچیں۔

مکافاتِ عمل

بشیر احمد بھٹی

بشیر بھٹی
یہ دنیا ایک کمرہ امتحان ہے' جہاں ہم اللہ تعالیٰ کے دیئے گئے احکامات کے مطابق پرچا حل کرتے ہیں' اس کے رزلٹ کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے روز حشر میں دینے کا کر رکھا ہے یعنی جو اس کی ہدایت پر چلا وہ کامیاب ہوا اور جس نے من مانی کی اس نے اپنی دنیا اور آخرت خراب کی۔ مگر ''وہ'' کبھی کبھی اپنے رزلٹ کی جھلک دنیا میں بھی دکھا دیتا ہے۔
بے زبان جانوروں پر ظلم کا پہاڑ توڑنے والے ایک شخص کی داستان عبرت آموز

یہ ناقابل فراموش واقعہ مجھے چچا جعفر نے سنایا تھا۔ جعفر میرا حقیقی چچا نہیں تھا سارے جان پہچان کے لوگ اسے چچا کہتے تھے۔ اچھے رکھ رکھاؤ' سلام دعا کے باعث میں بھی اسے چچا کہنے لگا۔

جعفر چچا' اللہ بخش کی دودھ کی دکان پر کام کرتا تھا جس کا گاڑھا' بلائی والا دودھ اور سوہن حلوہ پورے علاقے میں مشہور تھا۔ اس کی دکان شہر کے وسط میں فرید گیٹ کے اندرونی حصہ میں تھی۔ چیز اچھی ہو تو کام کرنے والے کے حصے میں شہرت بھی آتی ہے اور دولت بھی۔

اللہ بخش نے ایمان داری سے اپنے کام کا آغاز کیا تھا۔ اس لیے ہر وقت اس کی دکان پر گاہکوں کا رش رہتا تھا۔ ''اللہ بخش دودھ والا'' سارے شہر میں مشہور ہوگیا۔ گوالوں کا مسئلہ بھی حل ہوگیا۔ وہ دودھ لے کر اِدھر اُدھر بھٹکنے سے بچ گئے۔ دودھ لے کر سیدھا اس کی دکان پر آتے۔ ڈرم خالی کرتے رقم لیتے اور چلے جاتے۔ اس طرح ان کا وقت بھی بچتا تھا۔ کام کی رفتار تیز ہونے کے باوجود بھی اس کے دل میں بے ایمانی نہ آئی۔ کچھ لوگ جب کام چل نکلتا ہے تو لالچ میں آکر سودے میں ہیر پھیر کرنے لگتے ہیں' جس دکان پر ناقص سودا ملتا ہے وہاں گاہکوں کی آمد و رفت کم ہوجاتی ہے۔

اللہ بخش تاعمر ایک کامیاب دکان دار رہا۔ اس نے دودھ لانے والوں کو بھی کہہ رکھا تھا۔

''جس دن میں نے دودھ میں ملاوٹ دیکھی تو اس گوالے کو اپنی دکان میں پیر نہیں رکھنے دوں گا۔''

اللہ بخش دودھ کا کافی تجربہ رکھتا تھا۔ ایک نظر میں ملاوٹ کا اندازہ لگا لیتا تھا۔ گوالے بھی ملاوٹ سے پرہیز کرتے تھے کیونکہ ان کو اس دکان سے رقم فوراً مل جاتی تھی۔ وہ کسی کے پیسے نہیں روکتا تھا۔

☆......☆......☆

چچا جعفر نے اپنا بچپن اور جوانی اللہ بخش کی دکان کی نذر کردی تھی۔ دکان کے ساتھ ایک ہوٹل تھا۔ ہوٹل کا مالک بڑا ظالم شخص تھا۔ قریب ہی ایک قصائی کی دکان تھی۔ شام کو جب قصائی کی دکان بند ہوجاتی تو

پھٹے کے نیچے پڑی ہوئی ہڈیاں چبانے کے لیے کتے آجاتے۔

ہوٹل والے نے کتوں کو بھگانے کا عجیب طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ جونہی کوئی کتا ادھر آتا ہوٹل والا سلور کی بڑی کیتلی اٹھا لیتا جس میں ابلتا ہوا گرم پانی ہوتا تھا۔ وہ گرم پانی کتے پر ڈال دیتا جس سے کتے کی جلد جھلس جاتی اور وہ بری طرح چیختا چلاتا وہاں سے بھاگتا۔

وہ اپنے اس فعل سے کافی محظوظ ہوتا تھا اور چچا جعفر کو اس کی یہ ظالمانہ حرکت گراں گزرتی تھی۔

ایک رات چچا جعفر دہی کے خالی کونڈے دھونے میں مصروف تھا کہ ایک کتا قصائی کی دکان کے پھٹے کے نیچے ہڈیاں چبانے لگا تو اس ہوٹل والے نے کافی سارا گرم پانی کتے کی پیٹھ پر ڈال دیا۔ جس سے کتا تکلیف کے باعث چیختا ہوا بھاگ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کتوں پر ایسا خوف طاری کر دے کہ وہ اِدھر کا رخ نہ کریں۔

ہوٹل والے کا یہ طریقہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ ابلتا ہوا گرم پانی کتوں کے لیے تکلیف کا باعث ہوتا تھا۔ اس لیے گرم پانی سے جھلنے والا کتا جب اپنی زوردار خوف ناک کوکیں نکالتا تو وہاں موجود ہر شخص دم بخود ہو کر بھاگتے کتے کو دیکھتا اور پھر اس ہوٹل والے کو جو اپنے کارنامے پر چوڑے خان بن جاتا۔ جیسے اس نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

اللہ بخش مرحوم اور علاقے کے معزز شہریوں نے کئی بار اسے سمجھایا کہ ''کچھ اللہ کا خوف کر، اللہ کی لاٹھی بے آواز، رسی دراز اور ذات بے نیاز ہے۔ یہ نہ ہو کہ تو اس کی گرفت میں آئے اور پچھتائے۔''

لوگوں کی نصیحتیں سن کر وہ ظالم شخص فخر سے ''اونہہ'' کہہ کر تمسخر اڑاتا۔

اس رات اس نے ایک کتے پر بہت زیادہ پانی ڈالا تو کتا تکلیف سے دہرا ہو گیا وہ گول دائرے میں چکراتا ہوا، خوف ناک آوازیں نکالتا وہاں سے بھاگا اور ایک کار سے ٹکرا کر گرا۔ پھر فوراً ہی بدحواس ہو کر ایسا بھاگا کہ موٹر سائیکل کے نیچے آتے آتے بچا۔ پھر وہ بھاگ کر کافی دور چلا گیا۔ کافی دیر تک اس کی درد بھری کوکیں سنائی دیتی رہیں۔ یہ منظر دیکھ کر چچا جعفر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس دکان دار سے بولا۔

''شرم نہیں آتی تجھے تو نے ساری عمر اس دنیا میں رہنا ہے۔ مرنا نہیں۔ کچھ حیا کر بے غیرتی کی انتہا ہوتی ہے۔''

چچا جعفر کا غصہ عروج پر تھا۔ چچا جعفر نے اسے کافی لعنت ملامت کی۔ وہ بھی غصے میں اول فول بکتا رہا۔ اس سے پہلے کہ بات طول پکڑ جاتی۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کرایا۔

دوسرے روز رات کو چچا جعفر دکان سے گھر جا رہا تھا کہ اپنی گلی میں اس نے اس جھلسے ہوئے کتے کو دیکھا جو ایک پول کے ساتھ بیٹھا تھا۔ جلد پر کافی آبلے پڑ چکے تھے۔ چچا جعفر واپس آیا اس نے ایک پیالے میں دودھ لیا اور لے جا کر کتے کے سامنے رکھا، کتے نے پہلے تو خوف زدہ ہو کر وہاں سے نکل جانے کی کوشش کی۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا وہ

خاتم النبیین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت تمام زمانوں اور مکانوں کے انسانوں کے لیے ہے۔ ایسا کوئی زمانہ، نہ ایسی کوئی جگہ جہاں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور عصمت و امامت کا علم نہ لہرایا گیا ہو۔ اب کسی زمانہ و کسی جگہ میں کوئی نبی پیدا ہو تو کیوں؟ وہ آ کر کیا کرے گا، کیا سنائے اور کیا سکھائے گا؟ نہ کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر ہے، نہ مساوی اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرتبہ میں چھوٹے تھے، وہ سب کے سب اللہ نے ماضی میں نبوت اور رسالت کے ابتدائی ارتقائی مراحل میں بھیج دیئے۔ جب پوری انسانیت کو ایک کے انتظار میں سنوارا، سجایا اور وہ آنے والے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آ گئے۔ سب سے اعلیٰ اور نبوت رسالت کے ارتقا و کمال کی انتہا تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی آ سکتا نہیں اور کم تر درجہ کا پیدا ہو تو عروج سے زوال کی طرف آنے والی بات ہے۔ عظمت سے پستی کی طرف آنے کا تصور کونین کی ہلاکت کے مترادف ہے۔

حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سے بڑی توہین اور کیا ہو سکتی ہے کہ تمام انبیاء سابقین علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں شمولیت کو فخر سمجھیں اور اپنے امتیوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں دیکھ کر فرحت و انبساط کا اظہار کریں جب کہ ایک ذلیل ترین شخص، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ السلام کی امت گرامی کو اپنی اتباع کی طرف پکارے، یہ بغاوت ہے، نبوت و رسالت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ عباء ختم نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اور امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ مرزا قادیانی (لعنۃ اللہ علیہ و علیٰ آلہٖ و اعوانہٖ و انصارہٖ) کی اطاعت کیوں؟

بہ بیں کہ از کہ بریدی و با کہ پیوستی

اب انسان، اس جھوٹے اور کھوٹے شخص کے پیغام نافرجام کے منتظر نہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت، امامت اور امت سب قیامت تک کے لیے ہے تو پھر مرزائی یہ بتائیں کہ مسٹر ''گاما'' قادیانی کس نسل اور زمانے کے لیے ہے؟ اب ''گاما'' قادیانی آ کر کیا کرے گا؟ اب جو بھی اس وادی میں قدم رکھے گا، ذلیل و رسوا ہو گا، منہ کے بل گھسیٹا جائے گا۔ اب نہ تو کوئی پیغام باقی ہے جو نازل کیے جانے کے قابل ہو اور نہ ہی کوئی ایسا شخص جو نبوت کا اہل ہو...... یہ دونوں اعلیٰ وارفع مقامات، سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر مکمل ہو چکے ہیں۔ سچ فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے:

ترجمہ: ''میں نبیوں میں آخری نبی اور تم آخری امت ہو۔''

(ابن ماجہ)

سیّد عطاء الحسن بخاری رحمتہ اللہ علیہ

لڑکھڑا کر دوبارہ بیٹھ گیا۔ جعفر حسین نے پچکار کے پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ کتا دودھ پینے میں مصروف ہو گیا۔

☆......☆......☆

کتا دن بھر دیوار کے سائے میں پڑا رہتا۔ جعفر حسین کبھی اسے دودھ ڈال دیتا، کبھی چھیچھڑے۔ جب تک کتا زخمی رہا وہ اس کے زخموں پر مرہم لگاتا رہا۔ مرہم نے اثر دکھایا اور کتا چند ہفتوں میں تندرست ہو گیا۔ کتا چند روز میں اس سے اتنا مانوس ہو گیا کہ جب وہ گھر سے نکلتا تو کتا اس کے پیچھے ہو لیتا۔ جب وہ ہوٹل پہنچتا تو کتا پیچھے پلٹ جاتا۔

رات کو جعفر حسین گھر جاتا تو کتا پھر اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس کے دروازے تک پہنچ جاتا۔ وہ گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیتا تو کتا دروازے سے ٹیک لگا کے کچھ دیر بیٹھا رہتا۔ پھر واپس بڑی گلی کی طرف پلٹ جاتا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ جعفر حسین کے بیٹے کام کاج سے فارغ ہو کر گھر آتے۔ کتا ان کو دیکھ کر دروازے سے ہٹ جاتا۔ وہ اندر داخل ہو جاتے تو پھر دروازے پر بیٹھ جاتا۔

وقت گزرتا رہا کچھ دنوں سے وہ دکان دار

دکان سے غائب تھا۔ لوگوں کی زبانی پتا چلا کہ وہ بیمار ہوگیا ہے۔ چارپائی پر پڑا ہے ایک روز اللہ بخش اس کی عیادت کے لیے چلا گیا۔ واپس آیا تو بجھا بجھا سا تھا۔ جعفر حسین نے پوچھا۔

''استاد! خیریت ہے آج آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔'' پہلے تو وہ خاموش رہا پھر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

''اللہ رحم کرے کمال دین کا برا حال ہے۔'' کمال دین اس ہوٹل والے کا نام تھا جو کتوں پر پانی ڈالتا تھا۔

''اللہ کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔'' اللہ بخش بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''کمال دین کو اس کے گھر والوں نے چارپائی پر باندھ رکھا تھا۔ وہ منہ سے کتوں جیسی آوازیں نکالتا ہے اور بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اس کے گھر والے اس کی اس بیماری سے پریشان ہیں۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلتے ہیں' وہ بھونکنے لگتا ہے۔ رسیاں تڑوانے کی کوشش کرتا ہے۔ بالکل پاگلوں جیسی حالت ہوگئی ہے۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کی سمجھ سے یہ کیس باہر ہے۔ کوئی اس کے نزدیک کھڑا نہیں ہوتا۔ کمرے میں عجیب تعفن پھیلا ہوا ہے۔ بدبو ایسی ہے کہ وہاں چند سیکنڈ کے لیے نہیں بیٹھا جاتا۔''

جعفر حسین نے اللہ بخش سے کہا۔ ''استاد گھر سے کھانا آ گیا ہے کھالیں۔''

اللہ بخش بولا۔ ''اس کی حالت دیکھ کر میری طبیعت بوجھل ہوگئی ہے۔ بھوک نہیں رہی' کھانا تم کھالو' کمال دین کے کمرے کا تعفن میرے دماغ پر سوار ہے۔''

☆......☆......☆

کتوں کو اذیت پہنچانے والا شخص کافی دنوں تک بستر پر موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ گھر والوں کے لیے وہ عذاب بن گیا اور پھر ایک روز اسی حالت میں اس کا انتقال ہوگیا۔ دکھاوے کا بین کرنے والوں نے سکون کا سانس لیا کہ اس مصیبت سے جان چھوٹی۔ یہ تو دنیا دکھاوے کی سزا تھی۔ مرنے کے بعد ایسے ظالم لوگوں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ اس کا علم صرف اللہ کو ہے جو سزا و جزا عطا کرنے پر قادر ہے۔

☆......☆......☆

کمال دین نہیں رہا' اللہ بخش بھی وفات پا گیا ہے۔ اس واقعہ کا چشم دید گواہ جعفر حسین زندہ ہے۔ وہ اب بھی محنت سے رزق حلال کماتا ہے' نرم دل رکھتا ہے۔ کوئی زخمی پرندہ یا جانور نظر آ جائے تو وہ بے چین ہو جاتا ہے۔ پرندے کو اٹھا کے گھر لے جاتا ہے۔ جب تک وہ تندرست نہ ہو اس کا علاج جاری رکھتا ہے۔ جب وہ تندرست ہو کر اڑ جاتا ہے تو وہ پرسکون ہو جاتا ہے۔ اس کی لمبی عمر اور تندرستی کا یہی راز ہے۔

کفارہ

محمد سلیم اختر

نیکی کی راہ انتہائی کٹھن ہوتی ہے۔ اس راہ میں جابجا بکھرے کانٹے پیروں کو چھلنی کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ راہ پل صراط پار کرنے سے زیادہ دشوار ہے۔

ایک نوجوان کی سچی روداد' اس نے اپنے عزم سے نفس کو شکست دے دی تھی۔

ایک عرصہ بعد امی جان کا خط میرے نام دفتر کے پتہ پر آیا تھا۔ لفافہ میرے ہاتھ میں تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کوئی خاص بات یا مسئلہ ہو تو تبھی امی مجھے خط لکھتی ہیں۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا' لکھا تھا۔

''بیٹا سعید......!

تمہیں تو معلوم ہے کہ تمہاری بہن سمیرا کے سسرال والے رخصتی پر بہت زور دے رہے ہیں اور اب وہ تاریخ مانگ رہے ہیں۔ اس لیے تم جلدی چھٹی لے کر آ جاؤ' تم آؤ گے تو تب ہی تاریخ طے ہوگی۔ مگر اس سے اہم بات یہ ہے کہ جہیز کے لیے رقم کی اشد ضرورت ہے۔ کچھ تو میں نے بچت کر کے تیار کر رکھا ہے' مگر ابھی کچھ چیزیں لینی ہیں۔ اس لیے کم از کم تیس ہزار روپے کا بندوبست کر کے آنا۔ ورنہ رخصتی نہ ہوگی اور اگر رخصتی نہ ہوئی تو بہت بدنامی ہوگی۔''

فقط تمہاری والدہ!

امی جان کا خط پڑھ کر میں پریشان ہوگیا' کیونکہ اتنی رقم کا بندوبست کرنا میرے لیے ناممکن تھا مجھے معلوم تھا کہ سمیرا کی رخصتی کا انتظام میں نے ہی کرنا ہے' اس لیے میں کفایت شعاری اور کنجوسی کر کے ہر ماہ کچھ رقم بچا کر امی کو بھیج دیتا تھا۔ جس سے وہ ہر ماہ کوئی نہ کوئی چیز خرید لیتی تھیں مگر اب اچانک تیس ہزار کا بندوبست کرنا بہت ہی مشکل لگ رہا تھا' میں ایک صوبائی سرکاری محکمہ میں کلرک تھا۔ جہاں اوپر کی کمائی بہت ہوتی ہے' لیکن میں اس لعنت سے کوسوں دور تھا۔

میرے ابا جان (مرحوم) نہایت ہی غریب' شریف اور ایماندار انسان تھے۔ وہ اسی دفتر میں بطور چپراسی کام کرتے تھے۔ متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ وہ باتوں کی بجائے ہاتھوں کی کمائی پر یقین رکھتے تھے' انہوں نے حرام کی کمائی نہ کمانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ ہمارے گھر میں غربت تھی' نہ ہمیں اچھا کھانے کو ملتا تھا اور نہ پہننے کو' مگر ابا جان اسی پر شاکر تھے۔ دفتر سے چھٹی کرنے کے بعد وہ اپنی سائیکل پر ''چنا جور گرم'' بیچتے تھے۔ شام ڈھلے گھر لوٹتے' تو وہ پروردگار کا شکر ادا کرتے کہ وہ اپنی اولاد کو حلال اور اپنے ہاتھوں کی کمائی کھلاتے ہیں۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں حمیرہ اور سمیرہ تھیں۔ انہوں نے پرائمری تک تعلیم حاصل کی اور پھر گھر کی ہو کر رہ گئیں۔ جبکہ میں آٹھویں کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ ان ہی دنوں ابا جان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ چارپائی کے ہو کر رہ گئے۔ دفتر والوں نے ان کے علاج کے سلسلہ میں کافی مدد کی۔ اس علاج سے وہ کچھ

بہتر تو ہو گئے مگر اب وہ دفتر جانے کے قابل نہ رہے۔ دفتر والوں نے انہیں وقت سے قبل ریٹائر کر دیا اور جب میں نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تو افسران کی مہربانی کہ انہوں نے اسی دفتر میں مجھے کلرک بھرتی کر لیا۔ یوں زندگی کی گاڑی بہتر انداز میں رینگنے لگی۔ ابا جان کو دفتر کو طرف سے جو حساب کتاب ملا' اس سے ایک تو حمیرہ کی شادی کر دی گئی اور باقی رقم ابا جان کے علاج پر خرچ ہونے لگی۔ ابا جان حمیرہ بہن کی رخصتی اور مجھے سروس مل جانے کی وجہ سے مطمئن تھے کہ اب گھر میں فاقے نہ ہوں گے۔ ایک دن ابا جان نے مجھے اپنے قریب بٹھا کر دفتر کے حالات اور امور کے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ یہاں اوپر کی کمائی بہت ہوتی ہے' جو سراسر حرام ہے اور حرام کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی' بلکہ یہ جہنم کی آگ ہوتی ہے جس سے ہم اپنا پیٹ بھرتے ہیں' انہوں نے مجھ سے حلف لیا کہ میں کبھی رشوت نہیں لوں گا۔"

ابا جان نے سچ کہا تھا کہ یہاں لوگ اپنا کام کرانے کی غرض سے خود رشوت کی پیشکش کرتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا تھا مگر میں نے عہد کر رکھا تھا کہ میں ابا جان سے کیا ہوا عہد نبھاؤں گا اور ان کا مان نہیں توڑوں گا۔ یونہی چار سال بیت گئے۔ اس دوران ابا جان کا انتقال ہو گیا اور گھر کی ساری ذمے داری مجھ پر آن پڑی۔ میں نے امی اور سمیرا کا ہر طرح سے خیال رکھا اور انہیں ابا جان کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ امی اب سمیرا کے فرض سے بھی سبکدوش ہونا چاہتی تھیں۔ دور کے رشتہ داروں میں اس کا رشتہ طے ہو گیا تھا۔ اسی دوران میری تبدیلی دوسرے شہر ہو گئی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ میری تبدیلی رک جائے' مگر مجھے دوسرے شہر جانا پڑا۔ جو آبائی قصبے سے کافی دور تھا۔ یوں میرے اخراجات بھی بڑھ گئے۔ چھوٹا سا مکان کرایہ پر لینا پڑا اور کھانا مجھے ہوٹل سے کھانا پڑتا تھا۔ اس لیے میں نہایت ہی احتیاط اور کفایت شعاری سے کام لے رہا تھا۔ میں اب ایک ماہ بعد تنخواہ ملنے پر ہی امی کے پاس جاتا اور گھر کا سودا سلف' خرید کر ان کو دے آتا اور باقی جو رقم بچتی وہ بھی ان کو دے آتا۔

جس دن امی کا خط ملا' اس دن میں سارا دن دفتر میں بھی گم صم رہا اور چھٹی کے بعد گھر آ کر بھی الجھن میں ہی مبتلا رہا۔ میں نے دو ماہ قبل ایڈوانس کی درخواست دے رکھی تھی' مگر میرٹ لسٹ کے مطابق میری باری ابھی بہت دور تھی۔ نہ جانے کب ایڈوانس کی منظوری آنی تھی۔ میں دفتر کے کسی ساتھی سے ادھار بھی نہیں لینا چاہتا تھا' دفتر کے تمام لوگوں کو معلوم تھا کہ میں رشوت کو حرام سمجھتا ہوں' دفتر کے کئی ساتھیوں حتیٰ کہ راشی افسران نے بھی مجھے اس طرف راغب کرنے کی بہت کوشش کی مگر میں نے ابا جان مرحوم سے کیا ہوا عہد نہ توڑا۔

میری ڈیوٹی اب ایسی برانچ میں تھی جہاں دیگر لوگ سفارش کرا کے ڈیوٹی لگواتے تھے اور مال کماتے تھے' میرے اعلیٰ اور صاف ستھرے کردار کی وجہ سے وہاں ڈیوٹی لگائی گئی تھی۔ جسے میں نہایت ہی ایمانداری سے سرانجام دے رہا تھا۔ شہر کی ایک بڑی بزنس پارٹی کی فائل بھی میرے پاس ہی تھی...... ان کی فائل میں کوئی گڑبڑ تھی۔ اس لیے وہ اس میں سے کچھ کاغذات

نکلوا کر اس کی جگہ نئے کاغذات لگوانا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کا وکیل مجھ سے کہہ چکا تھا اور لالچ بھی دے چکا تھا مگر میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر ان کا وکیل میری جان نہ چھوڑ رہا تھا۔ وہ مسلسل ایک ماہ سے مجھے دانہ ڈال رہا تھا۔ مگر میں اس کی ہر پیشکش ٹھکرا کر فخر محسوس کر رہا تھا کیونکہ میری اس طرف کبھی سوچ ہی نہ گئی تھی۔ مجھے صرف اپنے کام اور تنخواہ سے غرض تھی' میں جتنا کام کرتا تھا اس کا معاوضہ مجھے حکومت تنخواہ کی صورت میں دے رہی تھی۔ میری پوری ملازمت کا ریکارڈ تھا کہ میں کبھی دفتر لیٹ نہیں پہنچا تھا اور وقت سے قبل کبھی چھٹی نہیں کی تھی۔ یوں میں اور میرا ضمیر مطمئن تھا۔ مجھے کوئی الجھن اور پریشانی نہ ہوتی تھی میں نہایت ہی سکون کی نیند سوتا تھا۔

مگر آج رات مجھے نیند نہ آ رہی تھی۔ امی جان کا خط میری جیب میں پڑا ہوا تھا۔ میں کئی بار اسے نکال کر پڑھ چکا تھا' تیس ہزار روپے کا مجھے بندوبست کرنا تھا اور اگر ایسا نہ ہوا تو میری بہن کی ڈولی نہ اٹھے گی۔ تقدیر نے مجھے ایک امتحان میں ڈال دیا' ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا کہ میں تیس ہزار روپے کہاں سے لاؤں...... میں تمام رات اسی سولی پر اٹکا رہا۔ میرے دل و دماغ میں جنگ جاری رہی۔ ایمان اور ضمیر کا امتحان ہوتا رہا۔ صبح ہونے پر میں ایک فیصلہ کر کے ایک نئی کہانی کو جنم دے چکا تھا۔ میں نے اپنے ایمان اور ضمیر کا سودا کر ڈالا۔ ابا جان کی نصیحتیں بھول گیا کیونکہ جب امیدوں کی ڈولی ٹوٹ جائے ...... غربت' آرزوؤں اور امنگوں کا خون کر ڈالے' جھوٹا بھرم ریت کے تاج محل کی طرح زمین بوس ہو جائے' کہیں سے امید کی کوئی کرن نظر نہ آئے' خواہشیں سراب بن جائیں...... آنکھوں کو کوئی راستہ نظر نہ آئے' ٹمٹماتے ستارے کائنات کی وسعتوں میں گم ہو جائیں تو پھر ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ نمازی اور پرہیزگار' راشی بن کر اندھیروں میں گم ہو جاتے ہیں۔

☆......☆......☆

اگلے روز میں نے بڑی کمپنی کے وکیل کو خود ہی فون کر کے دفتر بلایا اور اس کی مرضی کے مطابق فائل میں ردوبدل کر دیا۔ دو دن بعد میں ریل گاڑی میں بیٹھا اپنے قصبے کی طرف جا رہا تھا۔ میری جیب میں چالیس ہزار روپے تھے اور میں یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ جب میں امی کو اتنی رقم دوں گا تو وہ کتنی خوش ہوں گی اور مجھے بہت ساری دعاؤں سے نوازیں گی۔ قصبے کا ریلوے اسٹیشن چھوٹا سا تھا۔ جہاں ساری گاڑیاں نہیں رکتی تھیں اور جو رکتی تھیں وہ بھی صرف پانچ منٹ کے لیے۔ اسٹیشن پر اتر کر بیس منٹ کا سفر تھا میرے گھر تک کا...... جو میں عموماً پیدل ہی طے کرتا تھا۔ جب گاڑی ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر رکی' تو وہاں کھڑے بے چین لوگوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ سب مسافروں کو اترنے اور چڑھنے کی جلدی تھی۔ میں نے اپنا بیگ کندھے سے لٹکایا اور بوگی کے دروازے تک آ گیا۔ میں نے دائیں بائیں سرسری نظریں دوڑائیں اور پھر نیچے اتر گیا۔ میرے بکھرے بال اور سرخ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ مجھے رات کو نیند نہیں آئی' کیونکہ مجھے گاڑی یا بس میں نیند آتی ہی نہیں ہے۔

قصبے کے ریلوے اسٹیشن پر ایک چھوٹی سی اور خوبصورت سی مسجد بنائی گئی تھی' ابھی اس کا کچھ کام باقی تھا۔ اسے لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت مسافروں کی سہولت کی خاطر تعمیر کیا تھا۔ وہاں پر ٹھنڈے پینے والے پانی کا بھی انتظام تھا۔ مسافر ٹرین سے اترنے کے بعد وہاں آرام کرتے۔ نماز پڑھتے اور ٹھنڈا پانی پیتے' جوں ہی کوئی گاڑی اسٹیشن پر رکتی اور مسافر نیچے اترنا شروع ہوتے تو مسجد کے منتظم کی آواز ابھرتی...... وہ کہتے...... ''عزیز...... مسلمان بہن بھائیو' سامنے اللہ کا گھر زیرتعمیر ہے' آپ بھی اس نیک کام میں شامل ہو کر ثواب دارین حاصل کریں۔''

اس روز بھی منتظم صاحب ایسے ہی الفاظ کہہ رہے تھے۔ میں ان کے الفاظ سن کر مسجد کی طرف چل پڑا۔ اندر داخل ہو کر پہلے تو میں نے ٹھنڈا پانی پیا' چندمنٹ آرام کیا اور اپنی جیب سے پرس نکالا اور ایک ہزار کا نوٹ نکال کر مسجد کے چندہ والے بکس میں ڈال دیا۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ میں نے اتنی بڑی رقم بکس میں ڈالی تھی۔ ورنہ میں عام طور پر پانچ دس روپے ڈالا کرتا تھا۔ ہزار کا نوٹ ڈال کر میری خوشی کی انتہا نہ تھی' میں اٹھا اور مسجد سے باہر نکل کر پیدل ہی گھر کی طرف چل پڑا۔ میں نے ریلوے گراؤنڈ کراس کیا اور سامنے والی مارکیٹ کی طرف چلا گیا۔ میں کچھ فروٹ اور مٹھائی خریدنا چاہتا تھا میں ابھی مارکیٹ میں داخل نہیں ہوا تھا کہ کسی نے کہا...... ''سنیئے!''

میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا کہ یہ کس کی آواز ہے اور کسے کہہ رہا ہے تو دو نوجوان لڑکے میرے قریب آ گئے۔

''جی فرمائیے......'' میں نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

''وہ جی...... وہ دراصل میں نے آپ کا پرس چرا لیا تھا۔ ہم دونوں یہی کام کرتے ہیں۔ آپ کا بٹوا کھولنے پر آپ کی رقم کے ساتھ ایک خط بھی پڑا تھا' ہم نے وہ خط پڑھا ہے جی...... اس خط نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اس نے ہمارے مردہ ضمیر کو جگا دیا ہے......'' ان میں سے ایک بول رہا تھا۔ ''میری بھی ایک بڑی بہن ہے...... اس کی بھی شادی ہونی ہے' آپ کی ماں کا خط پڑھ کر یوں لگا ہے جیسے سمیرا آپ کی نہیں میری بہن ہے' زندگی میں ہم نے لوگوں سے بہت کچھ چھینا ہے' اب ہماری وجہ سے سمیرا بہن کا جہیز نہ بنا تو ہم کبھی اپنے آپ کو معاف نہ کر پائیں گے۔''

انہوں نے بٹوا میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ ان دونوں کے چہرے ندامت کے آنسوؤں سے تر تھے اور وہ میرے سامنے مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے۔ میں حیران اور پریشان ان نوجوان لڑکوں کو دیکھ رہا تھا جو بظاہر بڑے ہی معصوم لگ رہے تھے' مجھے یہ جان کر حیرت بھی ہو رہی تھی کہ یہ لوگوں کی جیبیں کاٹنے میں کتنے ماہر ہیں' انہوں نے میرا بٹوا چرا لیا اور مجھے خبر ہی نہ ہوئی مگر اب اچانک تبدیلی' مجھے مزید حیرت میں مبتلا کر رہی تھی کہ یہ لوگ اتنی بڑی رقم مجھے واپس کیوں کر رہے ہیں؟

''کون ہو تم؟ اور یہ کیا ماجرا ہے کہ تم لوٹی ہوئی رقم واپس کر رہے ہو؟'' میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

میں انہیں ساتھ لے کر نزدیکی ہوٹل میں چلا آیا۔ میں نے چائے کا آرڈر دیا۔ تو ان میں سے ایک بولا۔

''میرا نام خالد ہے اور یہ میرا دوست طارق ہے۔ ہم دونوں ہی غریب خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ غربت نے ہی ہمیں نہ تعلیم حاصل کرنے دی اور نہ ہی کبھی ہم نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔ آوارہ گردی نے ہمیں بری صحبت میں مبتلا کر دیا اور ہم لوگوں کی جیبیں کاٹ کر زندگی گزارنے لگے۔ اب ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو بھی پیٹ بھر کر کھانا ملتا ہے۔ گھر میں میری ماں کے علاوہ دو بہنیں بھی ہیں۔ ان کا جہیز میں نے ہی بنانا ہے اور رخصتی بھی میں نے ہی کرنی ہے مگر اس حرام کی کمائی میں برکت نہیں ہے' سمجھ نہیں آتی کہ رقم کہاں اور کیسے خرچ ہو جاتی ہے۔ نہ ہی بچت ہوتی ہے اور نہ ہی بہنوں کے جہیز کے لیے کوئی چیز خریدی جاتی ہے۔ آج جب آپ گاڑی سے اترے تو ہم دونوں تھوڑے فاصلے پر کھڑے تھے اور بڑی تیز اور گہری نظروں سے اترنے والے مسافروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ جب آپ گاڑی سے اترے تو میری تجربہ کار نظروں نے لمحہ بھر میں آپ کے چہرے کا جائزہ لیا اور پھر میں ہجوم کو چیرتا ہوا آپ کی طرف بڑھا اور پھر آپ کے پیچھے چل پڑا۔ جب آپ پانی پی کر مسجد سے باہر نکلے تو اس دوران میں اپنا کام مکمل کر کے بجلی کی تیزی کے ساتھ طارق کے پاس پہنچا اور پھر اسے ساتھ لے کر اسٹیشن کی پچھلی طرف آ گیا۔ میرا چمکتا دمکتا چہرہ بتا رہا تھا کہ میں اپنے کام میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

''کیا ہوا؟'' طارق نے بے چینی سے پوچھا۔

''کامیابی و کامرانی۔'' میں نے بڑے فخر سے جواب دیا۔

''کتنے ہیں؟'' طارق نے دوسرا سوال کیا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اس کے سامنے ہی پرس کھولا تو اتنے زیادہ نوٹ دیکھ کر ہماری آنکھیں چمک اٹھیں' ہم نے جب نوٹ گنے تو ہماری خوشی دیکھنے کے قابل تھی کیونکہ اتنی بڑی رقم اس سے قبل ہمارے ہاتھ نہ لگی تھی۔

''اس کے اندر اور دیکھو کہ کیا ہے؟'' طارق نے بٹوا ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

ہم نے بٹوا اچھی طرح چھانا تو اس میں سے کچھ ریزگاری ایک دو کارڈ اور ایک بڑا سا کاغذ برآمد ہوا...... طارق نے وہ کاغذ کھول کر دیکھا تو وہ ایک خط تھا' جو آپ کی والدہ صاحبہ نے آپ کے نام لکھا تھا۔ خط پڑھ کر طارق کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اور وہ خوشی جو نوٹ دیکھ کر حاصل ہوئی تھی ختم ہو گئی اور وہ پریشان سا نظر آیا۔

''کیا ہوا......؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''میں کسی کی بہن کی خوشیاں نہیں چھین سکتا۔'' طارق کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔

''کیا مطلب؟'' میں اور حیران ہوا اور پوچھا۔ ''ایسا کیا ہے اس خط میں۔'' میں نے اس سے خط لے لیا اور پڑھنے لگا۔ جب میں نے بھی خط پڑھ لیا تو میرے دل میں بھی ہلچل سی مچ گئی۔ میری پیشانی پر بھی سلوٹیں پڑ گئیں۔ ہم دونوں کو پچھتاوؤں نے جیسے ڈس لیا ہو۔ یوں لگا جیسے سمیرا

ہماری ہی بہن ہو اور ہم نے اس کی خوشیاں لوٹ لی ہوں۔ ہماری بہنوں کے چہرے ہمارے سامنے آ گئے۔

''اب کیا کریں؟'' طارق بولا۔

''ہمیں یہ رقم واپس کرنا ہوگی۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''مگر خالد......! یہ تو ہمارا......''

میں نے طارق کی بات پوری نہ ہونے دی اور کہا۔ ''ہاں میں جانتا ہوں' یہ ہماری آمدن کا ذریعہ اور ہمارا پیشہ ہے لیکن آج ہمیں یہ رقم واپس کرنا ہوگی ورنہ بہنیں بھائیوں پر مان کرنا چھوڑ دیں گی۔ ہم نے کبھی نہیں سوچا کہ ہم جن لوگوں کی جیبیں کاٹتے ہیں' خود ان کی نہ جانے کیا مجبوریاں ہوں گی؟ انہوں نے وہ رقم کتنی محنت سے کمائی ہوگی؟ اس رقم سے انہوں نے اپنی کوئی اہم ضرورت پوری کرنی ہوگی۔ طارق کیا تم نے یا میں نے کبھی سوچا کہ ہماری وجہ سے نہ جانے کتنے گھروں کے چولہے بجھے ہوں گے۔ نہ جانے کتنی معصوم لڑکیوں کی شادی کی بجائے ماتم ہوئے ہوں گے؟ نہ جانے کتنے مریض تڑپ تڑپ کر مر گئے ہوں گے؟ ہم نے یہ کبھی نہیں سوچا طارق! کیونکہ ہمیں صرف اپنی مجبوریاں نظر آتی ہیں۔ ہمیں صرف اپنی مائیں اور بہنیں دکھائی دیتی ہیں۔ ہاں صرف اپنی...... لعنت ہے ہم پر' آج اس خط نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ آج میں اپنی بہن کے جہیز اور ماں کی بیماری کو بھول گیا ہوں' آج ہماری وجہ سے سمیرا بہن کی ڈولی نہ اٹھے' نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گا' یہ کہتے ہوئے میری آنکھیں بھر آئی تھیں۔

میری باتوں نے طارق کے ضمیر کو بھی جھنجوڑ ڈالا اور بولا۔ ''ہاں خالد! تم ٹھیک کہتے ہو...... ہمیں شرم آنی چاہیے...... آؤ چلیں' ہم سمیرا کے بھائی سعید کو ڈھونڈیں وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔''

طارق نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگایا' ہم خوش ہو گئے اور آپ کی تلاش میں دوڑ پڑے اور تھوڑی سی تگ و دو کے بعد آپ کو ڈھونڈ لیا ہے۔ اب ہم آپ کے مجرم ہیں اور آپ کے سامنے ہیں۔ آپ ہمیں جو بھی سزا دیں ہمیں قبول ہے۔''

وہ دونوں نہایت ہی شرمندہ تھے اور دونوں کے چہرے ندامت کے آنسوؤں سے تر تھے۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور میں حیران سا بت بنا ان کو دیکھ رہا تھا۔ چائے کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ پھر میں کرسی سے اٹھا اور دونوں کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''آج مجھے' یقین ہو گیا ہے کہ اب ہماری بہنوں کی ڈولیاں جہیز کے بغیر نہیں اٹھیں گی۔ آج تم قسم کھاؤ کہ آج کے بعد یہ غلیظ کام نہیں کرو گے...... اللہ تعالیٰ تم دونوں کو اس کا اجر عظیم دے گا۔''

میں نے فرط جذبات سے ان دونوں کی پیشانیاں چوم لیں۔ میری آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ ان دونوں کے چہرے بھی خوشی سے دمکنے لگے۔ انہوں نے قسم کھائی کہ آج کے بعد وہ لوگوں کی جیبیں نہیں کاٹیں گے بلکہ محنت مزدوری کر کے گھر کا نظام چلائیں گے۔

''تم دونوں میں سے کس کی بہن کی شادی

پہلے ہوئی ہے؟'' میں نے ان سے پوچھا۔

''خالد کی بہن جوان ہے اور اس کی ماں اس کی شادی کے لیے بہت فکر مند ہے' مگر جہیز نہ ہونے کی وجہ سے دیر ہو رہی ہے۔'' طارق نے وضاحت کر دی۔

''تو آج یہ چالیس ہزار روپے میری طرف سے اپنی بہن کے جہیز کے لیے رکھ لو۔'' میں نے وہ رقم خالد کو لوٹاتے ہوئے کہا۔

خالد نے بہت انکار کیا۔ مگر میں نہ مانا اور وہ چالیس ہزار اس کی بہن کے جہیز کے لیے دے کر خالی ہاتھ اپنے گھر چلا آیا۔ میں نے امی جان کو کچھ نہ بتایا اور ان کو تسلی دی کہ ایک دو ماہ تک مجھے اپنے دفتر سے ایڈوانس مل جائے گا اور انشاء اللہ سمیرا بہن کی رخصتی بہتر انداز میں ہو جائے گی۔ امی جان کو مطمئن کر کے واپس لوٹ آیا۔ میرا ضمیر ایک لحاظ سے تو مطمئن تھا کہ میں نے رشوت کے طور پر جو رقم لی تھی' وہ میں اپنے آپ پر خرچ نہیں کی' بلکہ کسی اور کے کام آ گئی ہے۔ میری ہی وجہ سے دو آوارہ انسان راہ راست پر آ گئے ہیں لیکن پھر بھی مجھے ہر وقت پچھتاوے کی آگ جلاتی رہتی کہ میرا شمار بھی جہنمی لوگوں میں ہونے لگا ہے۔ کیونکہ میں نے رشوت لی ہے۔ مجھے اپنے آپ سے بھی نفرت ہونے لگی۔ لگتا تھا میں تھوہر کا پودا ہوں جو پھل دیتا ہے نہ پھول اور اپنی کوکھ میں ریت ہی ریت بھرتا رہتا ہے۔ میری راتوں کی نیند اڑ گئی' دل کا سکون برباد ہو گیا۔ ایک رات خواب میں میں نے ابا جان مرحوم کو بہت ہی ناراض سا دیکھا۔ وہ مجھے توبہ کی تلقین کر رہے تھے' میری آنکھ کھل گئی' اس وقت رات کے دو بجے تھے' میں نے بستر چھوڑا' وضو کیا...... اور نفل ادا کر کے سجدہ میں گر گیا اور سچے دل سے توبہ کی' اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی اور یہ عہد کیا کہ اب کبھی میں رشوت نہیں لوں گا۔ توبہ کر کے میرے دل کو قرار سا آ گیا اور یہ یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے میری توبہ قبول کر لی ہے اور معاف کر دیا ہے۔

☆......☆......☆

خالد اور طارق سے میرا رابطہ رہتا تھا' کیونکہ وہ میرے ہی شہر کے رہنے والے تھے۔ خالد نے اپنی بہن کی شادی کر دی اور مجھے اس کی شادی پر بلایا بھی تھا' وہ میرا ممنون تھا کہ میری دی ہوئی رقم اس کے کام آ گئی ہے اور اس کی بہن کی باعزت رخصتی ہو گئی ہے' مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ جو رقم میں نے اس کو دی تھی' وہ میرے ہاتھوں کی کمائی نہ تھی' بس یہی احساس مجھے چین نہ لینے دیتا تھا۔ میں نے رشوت نہ لینے کے ساتھ ساتھ یہ عہد بھی کر لیا کہ جو گناہ مجھ سے سرزد ہوا ہے میں اب اس کا کفارہ ادا کر کے رہوں گا۔ میں اب ہر ماہ اپنی تنخواہ سے ایک ہزار روپیہ کسی بیوہ یا یتیم کو دے دیتا اور یہ میں نے اس وقت تک دیتے رہنا ہے جب تک وہ پورے چالیس ہزار نہیں ہو جاتے۔

طارق اور خالد کو کسی کیش اینڈ کیری اسٹور میں ملازمت مل گئی اور ان کی گزر بسر بھی بہتر انداز میں ہونے لگی۔

کچھ ہی عرصہ بعد میری تبدیلی اپنے آبائی علاقہ کے دفتر میں ہو گئی۔ اب میں صبح گھر سے ہی دفتر جاتا اور شام کو واپس گھر لوٹ آتا۔ خالد اور طارق اسی شہر میں کام کرتے تھے' اس لیے میری اکثر ان سے ملاقات ہوتی رہتی' اور کبھی کبھی تو ہم

سفر بھی اکٹھے ہی کرتے' وہ دونوں اب اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن تھے۔ ماضی کو انہوں نے بھلا دیا تھا۔ میں جب اپنے آبائی علاقے میں آیا تو ان ہی دنوں میرا ایڈوانس بھی منظور ہوگیا' اور مجھے چھ ماہ کی تنخواہ کے برابر رقم مل گئی۔ میں نے وہ رقم امی کے ہاتھوں میں دے دی کہ وہ اس سے سمیرا کے جہیز کی بقیہ اشیاء خرید لیں۔ امی نے اس رقم میں جتنی چیزیں خریدی جاسکتی تھیں وہ خرید لیں اور پھر لڑکے والوں کو پیغام بھجوا دیا کہ وہ شادی کی تیاری کریں۔

وہ لوگ ہماری برادری کے تھے اور مالی لحاظ سے ہم سے کچھ بہتر تھے۔ انہوں نے اس سے قبل جہیز کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی مگر اب جب امی نے ان کو سمیرا کی رخصتی کے لیے کہا تو انہوں نے جہیز میں فریج' ڈی۔ وی۔ ڈی' ایل۔ سی۔ ڈی اور موٹر سائیکل کا مطالبہ کردیا کہ سعید ایسے محکمہ میں کام کرتا ہے جہاں اوپر کی کمائی بے حساب ہوتی ہے۔ اس لیے جہیز میں یہ چیزیں آسانی سے دی جاسکتی ہیں۔

ان کی جہیز میں اتنی چیزوں کی طلب دیکھ کر میرا دماغ کھول اٹھا۔ امی کو بھی ان کی یہ حرکت بہت ہی بری محسوس ہوئی' ہم نے جب انکار کیا تو انہوں نے شادی کرنے سے ہی انکار کردیا۔ یوں سمیرا کی منگنی ٹوٹ گئی اور اس کی شادی ملتوی کردی گئی۔ سمیرا کی منگنی کے ٹوٹنے کے غم کو امی نے شدت سے محسوس کیا۔ برادری والوں نے بھی باتیں بنائیں' سمیرا بھی دکھی اور افسردہ ہوگئی۔ مگر میں نے کسی کی باتوں کی پروا نہ کی۔ برادری کے چند لوگوں نے راضی نامہ کی کوشش کی اور مجھے قائل کرنا چاہا کہ میں لڑکے والوں کی جہیز کی ڈیمانڈ پوری کرسکتا ہوں مگر میں نے ان کی بات نہ مانی اور ان پر واضح کیا کہ میں حرام کی کمائی نہیں کھاتا اور نہ کماتا ہوں۔ مجبوراً وہ لوگ خاموش ہوگئے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے ہم سے خواہ مخواہ کی ناراضگی بنالی اور میرے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرنے لگے اور یہ الزام بھی لگایا کہ میں بھی رشوت لیتا ہوں' کیونکہ میں جس محکمہ میں کام کرتا ہوں وہاں کوئی پاک اور صاف دامن رہ ہی نہیں سکتا۔ برادری والوں نے خواہ مخواہ مجھے بدنام کرڈالا' جس کی وجہ سے میں اتنا دل برداشتہ ہوا کہ میں نے گورنمنٹ کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مجھے ایک پرائیویٹ ادارہ میں اچھی ملازمت مل گئی' جہاں تنخواہ بھی زیادہ ہے اور مراعات بھی کافی تھیں۔ جوں ہی میرے حالات بہتر ہوئے تو میں نے سمیرا کی شادی خالد سے کردی' اسی خالد سے جس نے میری جیب کاٹی تھی۔ اب وہی خالد میرا بہنوئی ہے' اور وہ دونوں خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ برسوں بیت گئے ہیں میں اسی پرائیویٹ ادارے میں کام کرتا ہوں' زندگی کی ہر سہولت میسر ہے' میری شادی ہوگئی ہے بچے بھی ہیں' امی اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ میں اب بھی اپنے اس گناہ کا کفارہ ادا کر رہا ہوں' جو سرکاری ملازمت کے دوران میں نے کیا تھا اور مرتے دم تک ادا کرتا رہوں گا۔

قسط نمبر 6

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الٰہی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر' ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا مسخر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

فائرنگ کی آواز سے ماحول گونج اٹھا تھا۔ جسپال کے سامنے ہرپریت تھی اچانک ہی سڑک پر گرگئی تھی' اس کے پیچھے کار تھی' جس میں وہ حملہ آور آئے تھے۔ پھر سڑک کے دوسری طرف دورویہ سڑک پر وہ موٹر سائیکل والے تھے۔ جسپال نے لمحوں میں فیصلہ کرلیا کہ اسے کیا کرنا ہے' یہ تو اسے پورا یقین تھا کہ ہرپریت کو گولی لگ چکی ہے۔ اسے سنبھالنے والے وہاں پر کوئی اور ہو نہ ہو لیکن کیشو مہرہ تو تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ حملہ آوروں کو ہاتھ سے نہ نکلنے دے۔ یہ فیصلہ اس نے لمحے کے ہزارویں حصے میں کرلیا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ چلتی ٹریفک کی پروا کیے بغیر حملہ آوروں کی طرف دوڑا۔ اس کا رخ اس جانب تھا، جدھر حملہ آوروں کا منہ تھا۔ فطری طور پر انہوں نے سامنے ہی کی طرف بھاگنا تھا' اگر وہ اپنا موٹر سائیکل موڑتے تو اس میں انہیں وقت لگنا تھا' یا پھر نیا فائر کرنے کے لیے اسے گن تو سیدھی کرنا ہی تھی۔ جسپال کو اپنی جانب لپکتا دیکھ کر موٹر سائیکل سوار نے فرار ہونا چاہا۔ اس نے گیئر تو پہلے ہی لگایا ہوا تھا۔ جب تک جسپال ان کے قریب پہنچا' انہوں نے موٹر سائیکل دوڑائی' تبھی اس کا ہاتھ فائر کرنے والے اس شخص کو لگا جو پیچھے بیٹھا ہوا تھا' ہاتھ کچھ اس طرح پڑا تھا کہ موٹر سائیکل ڈگمگا گئی۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائے۔ پیچھے والا جسپال کے قابو میں آ گیا تھا۔ لیکن موٹر سائیکل چلانے والا توازن نہ ہونے کے باوجود بھی ڈگمگاتا ہوا نکل گیا۔ حملہ آور جیسے ہی زمین پر گرا وہ سپرنگ کی مانند اچھلا' اس نے گن سنبھالنے اور اٹھانے کی بھی زحمت نہیں کی اور بھاگ نکلا۔ جسپال اس کے پیچھے تھا۔ وہ سڑک پار کرکے گیتا کالونی کی مخالف سمت میں تیر ہوگیا۔ جسپال نے اسے نگاہوں میں رکھا اور اس کے تعاقب میں پوری قوت سے دوڑا۔ ان کے درمیان میں تھوڑا سا ہی فاصلہ تھا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہا تھا کہ پکڑا نہ جاؤں اور یہ پوری قوت صرف کرکے اسے اس لیے پکڑ لینا چاہتا تھا کہ اس حملہ آور کے پیچھے کون ہے' وہ اسے بے نقاب کرنا چاہتا تھا' وہ سڑک سانپ کی آنت کی مانند پھیلتی ہی چلی جارہی تھی۔ تاہم لمحہ بہ لمحہ ان کے درمیان فاصلہ کم ہوتا چلا جارہا تھا۔ جیسے ہی ہاتھ بھر کا فاصلہ رہ گیا' جسپال نے پوری قوت صرف کی اور اس پر چھلانگ لگادی۔ یہ داؤ کارگر ثابت ہوا' حملہ آور اس کے شکنجے میں آ گیا۔ دونوں سڑک

پرجا گرے، حملہ آور نے جس قدر مزاحمت کی، جسپال نے اسی قدر اسے تھپڑوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ چند لمحے ہی گزرے ہوں گے، حملہ آور ہانپ گیا مگر جسپال نے اسے نہیں چھوڑا، اس نے حملہ آور کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ یہاں تک کہ حملہ آور نے مزاحمت ترک کر دی اور بے جان ہو کر سڑک پر پھیل گیا۔

یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ بھری سڑک پر دو آدمی لڑ رہے ہوں اور ان کے گرد تماشائی اکٹھے نہ ہوں، جن لوگوں نے سڑک پر فائر ہوتے دیکھا تھا، ان میں سے کچھ لوگ بھی جسپال کے پیچھے آ گئے تھے۔ جسپال نے شدت جذبات سے اس کی پسلی میں ٹھوکر مارتے ہوئے پوچھا۔

"بول، کیوں کیا فائر......؟"

"نہیں بتاؤں گا...... تو چاہے مجھے مار دے......"

نیچے پڑے ہوئے لڑکے نے بے جان سی آواز میں کہا اور یوں ہو گیا جیسے بے ہوش ہو۔ لاشعوری طور پر جسپال کے ذہن میں ہرپریت کا بھی خیال تھا۔ نجانے وہاں کیا منظر ہو گا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، ایک سائیکل رکشہ قریب کھڑا تھا، جسپال نے اسے بلایا وہ قریب آیا تو اس نے حملہ آور کو اٹھا کر اس پر تقریباً پھینک دیا، پھر خود سوار ہو کر سڑک کی جانب چلنے کا کہا۔ وہ لوگوں کو حیران و پریشان چھوڑ کر سڑک کی جانب چل دیئے۔

گیتا کالونی کے سامنے اچھا خاصا رش لگا ہوا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں پولیس بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ایک پولیس والے کو مخاطب کیا اور حملہ آور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ہے فائر کرنے والا حملہ آور...... گرفتار کریں اس کو۔"

پھر اس نے کیشو مہرہ اور ہرپریت کو دیکھنے کی کوشش کی، مگر وہ وہاں نہیں تھے۔

"وہ آپ کے ساتھ تھی......" ایک پولیس والے نے پوچھا، پھر بے ہوش حملہ آور کی طرف دیکھا۔

"ہاں، کدھر ہے اب وہ......؟" جسپال نے تیزی سے پوچھا۔

"انہیں یہاں قریب ہی ایک نجی ہسپتال لے گئے ہیں۔ گولی کندھے میں لگی ہے، ممکن ہے ایک سے زیادہ فائر ہوں۔"

"آپ کس تھانے سے ہیں، اور یہ......" جسپال کے لفظ منہ ہی میں تھے کہ اس کا سیل فون بج اٹھا، اس نے فوراً ریسیو کیا کیونکہ وہ مہرہ کا فون تھا۔

"بولیں، ہرپریت خیریت سے تو ہے؟"

"گولی لگی ہے آخر...... تم کہاں ہو؟" اس نے پوچھا تو جسپال نے انتہائی اختصار سے سارا واقعہ سنا دیا۔ تبھی مہرہ بولا۔ "پولیس کو میں نے ہی فون کیا تھا۔ یہاں پر جو انچارج ہے 'سیوا رام سنگھ' اس سے میری بات کراؤ۔ پھر اپنی گاڑی لے کر آ جاؤ۔ پتہ میں تمہیں بعد میں سمجھاتا ہوں۔"

جسپال نے سیوا رام سنگھ کو فون دیا، جو اس سے ذرا فاصلے پر کھڑا تھا، وہ ایک منٹ اس کی بات سنتا رہا، پھر فون واپس جسپال کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے کہا۔

"ہاں بولو مہرہ۔"

"میں نے اس کے ذمے لگا دیا ہے، اب تم فوراً یہاں آ جاؤ، باقی میں سنبھال لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے پتہ سمجھایا اور فون بند کر دیا۔ اس نے ایک نگاہ حملہ آور پر ڈالی اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چل دیا۔

تقریباً پندرہ منٹ کی تلاش کے بعد وہ اسپتال کی پارکنگ تک جا پہنچا۔ وہ تیزی سے کاؤنٹر تک گیا، جہاں سے اسے ایمرجنسی کے بارے میں بتایا گیا۔ وہ وہاں جا پہنچا، تو کیشو مہرہ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"بلڈ کا بندوبست ہو گیا ہے۔ ابھی ڈاکٹر اسے

آپریشن کے لیے لے جانے والے ہیں۔ تم سنبھالو، میں پتا کرتا ہوں کہ یہ معاملہ کیا ہے؟"

"کون ہے......؟" جسپال نے سرد سے لہجے میں کہا تو کیشو نے سر ہلاتے ہوئے اس کے کاندھے کو تھپکا اور وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

❁ ❁ ❁......❁......❁ ❁

صبح کی چمکتی ہوئی دھوپ ہر جانب پھیل چکی تھی۔ دلبر کے گھر کے سامنے شامیانے نصب تھے اور لوگ علاقے بھر سے جمع ہو رہے تھے۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ان میں دلبر کے لیے خلوص رکھنے والے کتنے ہیں اور محض دنیا دکھاوے کے لیے کون کون آئے ہیں۔ اگرچہ یہ ایصال ثواب کی محفل تھی لیکن علاقے میں مخصوص حالات کی وجہ سے جو تناؤ آ چکا تھا، اس کے لیے یہ دکھاوا ضروری تھا۔ لوگوں کی یہاں آمد سے پتا چلتا تھا کہ کون زیادہ دھڑے بندی رکھتا ہے۔ پیرزادوں کے لوگ بڑی تعداد میں وہاں موجود تھے، جبکہ سرداروں کے حامی بہت تھوڑے تھے۔ علاقے میں یہی مشہور تھا کہ وہ ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو گیا ہے لیکن سرداروں کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس کی وجہ قتل کیا ہے۔ ایصال ثواب کی اس محفل میں جو ہونا تھا، وہ تو ہو ہی جانا تھا، مگر......! وہاں یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں کسی نئی دشمنی کی بنیاد ہی نہ پڑ جائے۔ میں جانتا تھا کہ سرداروں کی سرد مہری کیوں ہے؟ سوہنی پوری طرح تیار تھی کہ وہ آج اعلان کر دے گی، پھر جو تماشہ ہو گا، دیکھا جائے گا۔ اس وقت میں گھر سے نکل کر دلبر کے گھر کی جانب جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس بار پولیس میں رندھاوا جیسا بندہ نہیں ہے جو میری مدد کرے گا، دو دن پہلے ہی انہیں معطل کروا کے لائن حاضر کروا دیا گیا تھا اور ان کی جگہ نئے ڈی ایس پی اور انسپکٹر آئے تھے وہ سرداروں کے اپنے ہاتھ کے بندے تھے۔ اب سرداروں کے ساتھ جو پھڈا ابھی لینا تھا، وہ بہت سوچ سمجھ کر اور بڑے حوصلے سے لینا تھا۔ سرداروں کی اپنی ایک قوت تھی، اس کے ساتھ ساتھ پولیس کے لوگ بھی ان کے اپنے ہاتھ کے تھے، وہ کسی طرح کی بھی دھونس جما سکتے تھے۔ میرے ساتھ چند ساتھی تھے، جو لڑنے بھڑنے اور اسلحہ چلانے میں ماہر تھے لیکن سرداروں کے مقابلے میں ہم کچھ بھی نہیں تھے۔ میں ناشتہ کر چکا تھا، میرے ذہن میں یہی خیالات گردش کر رہے تھے۔ پھر اچانک میں نے سب کچھ اپنے دماغ سے جھٹک دیا، میں نے اپنا ریوالور اٹھایا، فالتو میگزین اپنی جیبوں میں بھرے اور باہر جانے کے لیے تیار ہو کر نکلنے لگا۔ میں اندر والے کمرے سے باہر دالان میں آیا تو سوہنی جیسے میرے انتظار میں ہی تھی، میری طرف دیکھ کر گہری سنجیدگی سے بولی۔

"جمال......! میں نے بھی تیرے ساتھ جانا ہے، کیونکہ اماں کو میں نے پہلے ہی بھیج دیا ہے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بات تو کیوں نہیں سمجھتا کہ سردار کبھی بھی، مجھے علاقے کے سامنے یہ کہنے نہیں دے گا کہ میں اس کی بیٹی ہوں۔"

"اب جو بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ آؤ چلیں۔" میں نے کہا اور باہر صحن میں کھڑی بائیک کو سیدھا کیا اور اس پر بیٹھ گیا، سوہنی نے گیٹ کھولا تو میں گلی میں آ گیا۔ جب وہ میرے پیچھے آ بیٹھی تو میں نے بائیک بڑھا دی۔ اس کے ساتھ ہی میرے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑنے لگی۔ جس میں بدن سے اٹھنے والی ٹیسیں دب کر رہ گئی تھیں۔ میں اپنی گلی پار کر کے چوک میں آ گیا۔ وہاں سناٹا تھا، اچھو کریانے والے کی دکان بھی بند تھی۔ دائیں جانب مڑ کر دوسری گلی میں دلبر کا گھر تھا۔ پہلی گلی پار کی اور پھر دوسری گلی کے سامنے آ کر مڑنے ہی والا تھا کہ سامنے سے ایک

جیپ نے میرا راستہ روک لیا۔ میں اگر محتاط نہ ہوتا تو بلاشبہ اس کے ساتھ ٹکرا جانا تھا‘ میرے پیچھے گلی سنسان تھی۔ سامنے سے جیپ نے روکا ہوا تھا‘ دائیں جانب شامیانے لگے ہوئے تھے۔ جس کے اندر بیٹھے لوگ پڑھ رہے تھے۔ بائیں جانب کی گلی خالی تھی۔ میرے فرار ہونے کا راستہ کہیں بھی نہیں تھا‘ تبھی میں نے سرسراتے ہوئے کہا۔

”سوہنی...... حوصلہ رکھنا‘ اگر گڑبڑ ہو جائے تو دلبر کے گھر کی طرف بھاگ جانا‘ رکنا نہیں۔“

”تم نہیں جانتے جمالے‘ انہوں نے ہمارا راستہ روک کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔“ سوہنی نے آہستگی سے کہا تو میں چونک گیا۔ وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہے‘ میں اس پر زیادہ نہیں سوچ سکا‘ کیونکہ جیپ کے پیچھے جو کار آ کر رکی تھی‘ اس میں سے شاہ زیب باہر نکل آیا تھا‘ کار میں سے چند بندے نکلے تو ان کے پیچھے ایک جیپ اور موٹر سائیکل پر سوار لوگ آ گئے‘ وہ تقریباً بیس کے لگ بھگ لوگ رہے ہوں گے۔ شاہ زیب نے اپنی آنکھوں پر سے سیاہ چشمہ اتارا اور کار میں پھینکتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔

”جمال......! تیرے پیچھے جو لڑکی بیٹھی ہے‘ اسے چپ چاپ میرے حوالے کر دے...... ورنہ اسے میں نے چھین تو لینا ہے‘ تو بھی اپنی جان سے جائے گا۔“

”لگتا ہے تو پاگل ہو گیا ہے شاہ زیب...... اس لیے اول فول بک رہا ہے‘ تمہارے لیے یہی اچھا ہے کہ میرا راستہ چھوڑ دے۔“ میں نے سرد سے لہجے میں کافی اونچی آواز میں کہا تا کہ میری آواز دور تک پہنچے۔

”تو اگر یہ سمجھتا ہے کہ تو ڈیرے سے بچ کر آ گیا ہے‘ تو یہ تمہاری بہت بڑی بے وقوفی ہے‘ میں نے خود تجھے جانے دیا‘ تا کہ اب بھی تم سمجھ جاؤ اور اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔ اب یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے‘ چلو شاباش......“

”اور میں بھی تجھے آخری موقع دے رہا ہوں...... پہلے تیرے باپ کا ادھار تھا‘ اب تیرا ادھار بھی لیے پھرتا ہوں یہ نہ ہو کہ ادھار آج ہی چکا دوں۔“ میرے کہنے پر وہ چند لمحے مجھے غصے میں دیکھتا رہا‘ پھر اپنے بندوں کو اشارہ کیا تا کہ وہ سوہنی کو بائیک پر سے اتار لیں‘ بالکل انہی لمحات میں ان سب کے پیچھے فائرنگ نے فضا کو دہلا کر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی دائیں جانب سے شامیانوں میں سے کچھ لوگ نکل آئے اور بائیں جانب والی خالی گلی سے ایک جیپ دوڑتی ہوئی آتی دکھائی دی۔ سوہنی بائیک سے نیچے اتر گئی اور چلا کر بولی۔

”رشتے میں تم میرے بھائی لگتے ہو...... وہ بھی سوتیلے...... میں نہیں چاہتی کہ تم...... میرے ہاتھوں مر جاؤ۔ اس لیے جیسے آئے ہو‘ ویسے ہی یہاں سے دفعان ہو جاؤ‘ کچھ دیر بعد میں خود حویلی میں آ رہی ہوں‘ اپنے باپ کو بتا دینا۔“

”بے غیرت طوائف...... تیری یہ جرأت......“ شاہ زیب نے غصے میں پاگل ہوتے ہوئے کہا۔

”اوئے...... بے غیرت باپ کے بے غیرت بیٹے...... میں تم سے زیادہ اچھی طرح گالیاں نکال سکتی ہوں۔ اگر تیرے کسی بندے نے کوئی فضول حرکت کی تو اس کا خمیازہ تجھے بھگتنا ہوگا۔ دیکھ رہا ہے‘ تو اب میرے نشانے پر ہے......“ سوہنی نے غراتے ہوئے اردگرد اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اتنی دیر میں شامیانوں کی طرف ہلچل مچ گئی تھی۔ وہاں سے لوگ باہر نکل کر ہمیں آمنے سامنے دیکھ رہے تھے۔ تبھی میں نے کہا۔

”اب جاتا ہے کہ ادھار چکاؤں......“

یہ کہتے ہوئے میں بائیک سے نیچے اتر آیا اور اس کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ میری طرف کھڑا دیکھتا رہا‘ میں اس کے بالکل قریب چلا گیا اور جا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ تب اس نے کہا۔

”بہت پچھتاؤ گے جمالے......“

”کہو اپنے لوگوں کو مجھ پر فائر کریں‘ گولی چلا کر مار دیں مجھے‘ کہو......“ میں نے چیختے ہوئے کہا تو دائیں جانب سے کسی نے زور سے کہا۔

”خبردار اپنی جگہ سے کوئی نہ ہلے‘ ورنہ گولی مار دوں گا۔“

فطری طور پر میں نے اس طرف دیکھا تو وہ نیا ڈی ایس پی تھا اور اس کے ساتھ کافی ساری نفری تھی‘ جنہوں نے ہم پر گنیں تانی ہوئی تھیں۔ تبھی سوہنی اس طرف منہ کر کے اونچی آواز میں بولی۔

”گولی اسے مارو آفیسر‘ جس نے ہمارا راستہ روکا ہے۔“

”تم لوگوں نے جدھر جانا ہے جاؤ...... شاہ زیب آپ بھی جائیں۔“ ڈی ایس پی نے تیزی سے کہا۔

”ہم نے تو حویلی جانا ہے ڈی ایس پی......“ میں نے کہا تو شاہ زیب سمیت سبھی چونک گئے۔

”نہیں...... بالکل نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ ”اس وقت بالکل نہیں......“ کہتے ہوئے وہ ہمارے قریب آ گیا۔ پھر شاہ زیب کو کاندھوں سے پکڑ کر کار میں بٹھانے لگا۔ وہ بیٹھ گیا تو میں بھی واپسی کے لیے مڑا۔ میں بائیک پر آن بیٹھا تو اس نے کار واپس موڑ لی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے بندوں سمیت وہاں سے چلا گیا۔ سوہنی کے ساتھ والے بندے گلی کی نکڑ پر کھڑے رہ گئے اور ہم دلبر کے گھر کی طرف چلے گئے۔ سوہنی اندر گھر میں چلی گئی اور میں پنڈال میں چلا گیا۔

پنڈال میں علاقے بھر کے چیدہ چیدہ لوگ تھے۔ انہیں خبر ہو گئی تھی کہ شاہ زیب نے میرا راستہ روکا ہے۔ پیرزادہ وقاص بھی ایک طرف اپنے لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ میں خاموشی سے جا کر وہاں بیٹھ گیا۔ اس وقت دعا ہو رہی تھی‘ جب اچانک سردار شاہ دین کی آمد ہو گئی۔ ظاہر ہے وہ اکیلا نہیں تھا‘ اس کے ساتھ کئی سارے لوگ تھے۔ وہ بھی ایک طرف آ کر دعا میں شامل ہو گئے۔ دعا ختم ہوئی تھی کہ ڈی ایس پی میرے سر پر آن کھڑا ہوا۔ دھیرے سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”جمال ذرا بات سننا۔“

میں اٹھ کر اس کے ساتھ ایک طرف ہو گیا اور کہا۔

”جی‘ بولیں۔“

”میرے ساتھ ذرا دلبر کی بیٹھک میں چلو‘ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

اس نے کہا ہی تھا کہ میں سمجھ گیا۔ وہ رش کے اس وقت میں مجھے اپنے ساتھ رکھ کر سوہنی کا اعلان روکنا چاہتا تھا۔ تبھی میں نے پیرزادہ وقاص کو اشارے سے وہیں بیٹھے رہنے کو کہا اور اس کے ساتھ چل دیا۔ ہم بیٹھک میں گئے ہی تھے کہ سردار شاہ دین بھی وہیں آ گیا۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔

”بیٹھو بیٹا! میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”بولیں۔“ میں نے کہا اور اس کے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ڈی ایس پی نے بھی ایک کرسی سنبھال لی۔

”اگر سوہنی کو بھی بلا لو......“ شاہ دین نے کہا۔

”مجھے اس کے بلانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے سردار صاحب‘ لیکن آپ نے موقع کھو دیا...... اس نے اگر یہاں بندے بلوائے ہوئے ہیں تو میڈیا کے لوگ بھی یہاں ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر بعد وہ آپ کی بیٹی ہونے کا اعلان کر دے گی۔“

”جب ہم بات کر رہے ہیں تو اعلان کی کیا ضرورت ہے؟“ شاہ دین نے کہا تو مجھے غصہ آ گیا۔

”اس لیے کہ تمہارے بیٹے نے راستہ روک کر بے وقوفی کی ہے۔ شاید وہ ہمیں اکیلا ہی سمجھ رہا تھا۔“

”میں نے اسے بہت روکا تھا کہ ایسا مت کرو مگر اس نے میری بات نہیں مانی‘ وہی سوتیلا پن‘ جائیداد

کے کھو جانے کا دکھ......اور غصہ......'' اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''تو کیا آپ سوہنی کو اپنی بیٹی مان چکے ہیں۔'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''نہیں مانوں گا تو وہ ثابت کردے گی۔ مجھے یہ پوری طرح احساس ہے۔'' اس نے کسی ہارے ہوئے جواری کی مانند کہا۔

''ٹھیک ہے' پھر اسے کیا اعتراض......'' میں نے کہا۔

''جمال......! جب اور جہاں تم چاہو' سوہنی چاہے' وہیں بات کرلو کہ وہ کیا چاہتی ہے' لیکن ہمارا ایک سیاسی کیریئر بھی ہے' ہم سب کچھ طے کرلیں گے۔ فی الحال یہ بات ہم لوگوں کے درمیان ہی میں رہے۔ باہر نہ نکلے' اس میں ہم سب کا فائدہ ہے۔'' سردار نے یوں کہا جیسے یہ سب کچھ اسے بہت مشکل سے کہنا پڑ رہا ہو۔

''ٹھیک ہے سردار صاحب! لیکن بات وہی' کیا گارنٹی ہے کہ آپ اپنی بات سے نہیں پھریں گے۔'' میں نے کہا تو شاہ دین کے چہرے پر ایک دم سے جلال آ گیا۔ اس کا چہرہ غصے اور خفت سے سرخ ہوگیا۔ تبھی ڈی ایس پی بولا۔

''میں گارنٹی ہوں......تم شاید یقین نہ کرو' مجھے اوپر سے احکام ملے ہیں' سردار صاحب نہ بھی چاہیں تو میں نے یہ معاملہ حل کروانا ہے' یہاں تک کہ قانونی معاملات بھی......یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔''

''دیکھ لیں ڈی ایس پی صاحب' انہوں نے اپنی بات سے پھر جانا ہے' یہ ہمیں قتل بھی کرسکتے ہیں۔'' میں نے اسے یاد دہانی کرائی تو وہ تحمل سے بولا۔

''نہیں......اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں مانتا ہوں' وہ شاہ زیب کی بے وقوفی تھی' بہرحال جو معاملہ مل بیٹھ کر سکون سے طے ہو جائے' اس میں لڑنا جھگڑنا عقل مندی نہیں' سوہنی کا موقف بالکل ٹھیک ہے۔ اسے بلائیں تاکہ اسے بھی معلوم ہو جائے' پھر کل یا پرسوں ہم بیٹھ کر ہر چیز طے کرلیں گے۔''

''اوکے......! اسے بلانے کی ضرورت نہیں' ہوگئی بات......'' میں نے کہا اور اٹھ گیا' وہ بھی اٹھ گئے۔

پھر کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی اپنی سواریوں پر چلے گئے اور میں پنڈال میں آ گیا۔ پیرزادہ وقاص میرے انتظار میں اب بھی کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''ہاں بول جمالے......جاؤں......''

''ہاں......! سردار شاہ دین معافی مانگ کر گیا ہے۔'' میں نے یونہی کہہ دیا۔

''دل نہیں مانتا' مگر تو کہتا ہے تو مان لیتا ہوں۔ خیر......! آ کبھی ڈیرے پر یا میرے گھر' کچھ باتیں کریں۔'' اس نے بڑے تحمل سے کہا تو میں نے تیزی سے ہامی بھری۔

''میرا بھی دل کرتا ہے' میں ایک دو دن میں آتا ہوں۔''

''چل ٹھیک ہے' پھر رب کے حوالے......'' پیرزادہ نے کہا اور اپنی مہنگی جیپ میں بیٹھ گیا۔ وہ چلا گیا تو آہستہ آہستہ لوگ بھی جانے لگے۔ میں نے چھاکے کے ذریعے سوہنی کو پیغام بھجوا دیا تھا کہ سردار سے بات ہوگئی ہے۔

دوپہر کے بعد ہم اپنے گھر آ گئے۔ سارے بندے اپنے ٹھکانے پر جا پہنچے اور میڈیا کے لوگ واپس چلے گئے جو کہ مقامی صحافی ہی تھے۔ سوہنی اور اماں اندر کمرے میں تھیں اور میں چھاکے کے ساتھ باہر والے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے ساری تفصیل بتادی تو وہ بولا۔

''جمالے......! تو مان نہ مان' سردار کی اس میں بھی کوئی چال ہے۔ وہ وقت ٹال گیا ہے۔''

''میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ وقت ٹال جائے۔'' میں نے کہا تو چھاکے نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیا تو بھی وہی سوچ رہا ہے جو میں سوچ رہا ہوں۔''

''کیا بھلا......؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

''اگر بات طے ہوگئی تو معاملہ ہی ختم ہوگیا اور اگر معاملہ ختم ہوگیا تو پھر ہمارا سرداروں سے کیا لینا دینا۔ اس طرح کم از کم دشمنی تو رہے گی۔''

''بالکل! اب سوہنی کی بہت زیادہ حفاظت کرنا پڑے گی' اس کے ساتھ آئے بندوں کو ہم کب تک یہاں رکھیں گے۔'' میں نے ایک تشویش ظاہر کی۔

''اس کی تم فکر نہ کرو' بلکہ میں تجھے بتانے والا تھا' بہت سارے لوگ ہیں جو سرداروں کے خلاف ہیں' کسی نہ کسی طرح ان سے بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ اب جڑ رہے ہیں ہمارے ساتھ۔ دو چار دن تک میں بتادوں گا کہ اب ماحول کیا ہے۔ تم پوری توجہ سے یہ سوہنی والا معاملہ حل کروادو' پھر ذرا سکون سے سوچتے ہیں کہ ان سرداروں کو ناکوں چنے کیسے چبوانے ہیں۔'' اس نے انتہائی غصے میں کہا اور پھر پرسکون سا ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ تب میں نے پرسکون سے انداز میں کہا۔

''چھاکے......! جو کھیل ہم شروع کرچکے ہیں' اب چاہیں بھی تو ختم نہیں کرسکتے۔ اب یہ اس وقت تھمے گا' جب ہم نہیں رہیں گے یا وہ نہیں رہیں۔''

''یہ تو ہے' لیکن اس کھیل کے انجام پر کیا ہوگا' یہ بھی ہمیں معلوم نہیں' مگر مجھے ایک بات کی سمجھ آ گئی ہے کہ آخر طاقت میں ایسا کیا نشہ ہے۔'' چھاکے نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کس کی طرف اشارہ کررہا تھا۔ میں نے اسے جواب نہیں دیا اور خاموش رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کھانا کھا کر یہاں سے نکلیں اور کسی ڈیرے پر بیٹھ کر یہ سوچیں کہ علاقے کے شہ زوروں' پہلوانوں اور ان لڑکوں کو اپنے ساتھ کیسے ملایا جائے جو کسی نہ کسی حوالے سے اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ سارے ہی لوگ میرے ساتھ شامل نہیں ہوں گے لیکن جو ہوں گے وہ تو میری طاقت بنیں گے۔ میں ابھی اسی سوچ کا سرا پکڑ کر چل رہا تھا کہ باہر کسی جیپ کے رکنے کی آواز آئی۔ میں نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے کھڑکی میں سے دیکھا' باہر ڈی ایس پی کی جیپ رکی تھی۔ چھاکے نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا' باقی نفری باہر ہی رہی اور ڈی ایس پی اندر آ گیا۔ اگلے چند لمحوں میں وہ پرسکون انداز میں بیٹھ گیا تو گویا ہوا۔

''آج یہ نور نگر بہت بڑے فساد سے بچ گیا۔ ورنہ کتنی لاشیں گرتیں' یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔''

''ڈی ایس پی صاحب! اگر یہ حکمران لوگ انصاف پسندی سے' دیانت داری سے اپنے معاملات چلاتے رہیں تو کسی کو بھی ان کی دولت یا جائیداد سے کوئی دلچسپی نہیں' لیکن یہی لوگ جب انسان پر انسان کی حکمرانی کے نشے میں سب کچھ بھول جاتے ہیں تو پھر ردعمل تو فطری بات ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو جمال......! مجھے یہاں آئے چند دن ہوئے ہیں۔ علاقے بھر میں میرے بارے میں یہی مشہور کیا گیا ہے کہ میں ان سرداروں کی ایماء پر یہاں آیا ہوں اور انہیں ہی تقویت دوں گا۔ ایسا نہیں ہے' یہ ذہن میں رکھنا۔ دوسرا میں نے یہاں آتے ہی امن وامان کی صورت حال کا بہت گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔ یقین کرو اس میں' ان حالات کو خراب کرنے میں سردار شاہ دین سے زیادہ شاہ زیب کا ہاتھ ہے' میں مانتا ہوں اس بات کو......'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''یہی تو بات ہے' لیکن وہ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ مجھے ٹوکتے

ہوئے بولا۔
"تقریباً ایک سال سے وہ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف ہی چل رہا ہے، خیر..... علاقے کی جو بھی صورت حال ہے، میں پوری کوشش کررہا ہوں کہ وہ کنٹرول میں آجائے لیکن اس وقت میں تم سے جو بات کرنے آیا ہوں، سوہنی کے بارے میں ہے، میرے خیال میں اگر اسے بھی بلالو تو زیادہ اچھا ہوگا۔"
"ٹھیک ہے بلاتا ہوں۔" میں نے کہا تو میرے کہنے سے پہلے ہی چھاکا اندر کی طرف چلا گیا، ہمارے درمیان اتنی دیر میں خاموشی ہی رہی، کچھ دیر بعد سوہنی سر پر آنچل لیے اندر آ کر بیٹھ گئی۔ تب ڈی ایس پی نے ذرا سا کھنکارتے ہوئے کہا۔
"دیکھیں، میں جو بھی بات کروں گا، وہ میں اپنی معلومات کے مطابق کروں گا۔ جہاں آپ کو لگے کہ میری معلومات درست نہیں تو آپ مجھے بتادیں۔ بہرحال آپ کے لیے بہت ساری باتیں نئی بھی ہوں گی۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا، پھر کہتا چلا گیا۔ "بلاشبہ یہ معاملہ جو سوہنی کے اس دعوے کے بارے میں ہے کہ وہ سردار شاہ دین کی بیٹی ہے، اس وقت سامنے آیا، جب ملک سجاد کی آمدورفت سوہنی کے گھر شروع ہوئی۔ سوہنی کی ماں نے ملک سجاد سے ڈیل کی اور اگر اس وقت ملک سجاد سے بات نہ ہوتی کہ سوہنی سرداروں کی بیٹی ہے تو شاید یہ نوبت ہی نہ آتی، خیر..... یہ معاملہ چل پڑا، ملک سجاد خود لالچی بندہ ہے، اس نے خاموشی اس لیے اختیار کی کہ ایک بار اسے اپنے نکاح میں لے آئے گا تو پھر سرداروں کو بلیک میل کرے گا۔ وہ اپنا پلان سوہنی وغیرہ سے بھی چھپا کر رکھنا چاہتا تھا، سوہنی کو جب معلوم ہوا تو اس کی اپنی سوچ بدل گئی۔ اس نے اپنی شناخت کے لیے جدوجہد شروع کردی۔ کیا یہاں تک میری بات درست ہے؟" اس نے سوہنی سے پوچھا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔
"جی بالکل درست ہے۔"
"ملک سجاد سے سردار شاہ دین کی نہیں، شاہ زیب کی دوستی تھی۔ سوہنی کے بارے میں جاننے کے بعد اس نے یہ دوستی مزید گہری کرلی، اسے سبز باغ دکھانے شروع کردیئے کہ وہ پنجاب کی سطح کا بہت بڑا لیڈر بن سکتا ہے، تاہم انہی دنوں شاہ دین کے معالج نے اسے لاہور بلوالیا، تاکہ اس کا مکمل چیک اپ کیا جائے، یہ اس لیے ہوا کہ سوہنی نے بھاری رقم دی تھی، اس معالج کو؟" یہ کہہ کر اس نے پھر سوہنی کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔
"یہ بھی ٹھیک ہے۔"
"لیکن اس معالج نے جہاں سوہنی کو درست بات بتائی کہ وہ اس کی بیٹی ہے، ڈی این اے ٹیسٹ رپورٹ کے مطابق، وہاں سردار شاہ دین کو بھی ساری کہانی سنادی۔ شاہ دین کو اس وقت سے علم تھا، اب وہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح شاہ زیب یہاں سے ادھر ادھر ہو تو سوہنی اور اس کی ماں سے ڈیل کرے، تاکہ یہ معاملہ چپ چاپ ختم ہوجائے۔ معالج نے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ ان دونوں کو ملوائے گا، وہی ان کی ڈیل کروائے گا۔ ان کے پاس دو آپشن تھے، ایک یہ کہ انہیں کسی باہر کے ملک میں بھیج دے اور ایک معقول رقم انہیں ملتی رہے، یا پھر انہیں مناسب جائیداد خرید کر دے دے اور وہ اپنے طور پر ایک پرسکون زندگی گزاریں۔ مگر معاملہ بگڑ گیا۔"
"وہ کیسے....." میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔
"وہ ایسے جمال کہ ملک سجاد کسی طور نہیں چاہتا تھا کہ سردار شاہ دین کی ان سے کوئی ڈیل ہوجائے، سوہنی اور معالج کے درمیان معاملہ چل رہا تھا۔ انہی کے گھر کے ایک نوکر سے ملک سجاد کو ساری معلومات مل رہی تھیں۔ تب اس نے اپنی گیم کھیلنا شروع کردی

۔سردار شاہ دین اور شاہ زیب کو بالکل بھی معلوم نہیں تھا کہ سوہنی کون ہے' انہیں دیکھا ہی نہیں تھا' جب ملک سجاد یہاں آیا اور شدید زخمی حالت میں یہاں سے گیا تو بات کھل گئی۔ دونوں باپ بیٹے میں اختلاف بڑھنے لگا' باپ کا موقف یہی تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو اپنائے گا اور انہیں قبول کرلے گا' لیکن شاہ زیب انہیں سرے سے قبول ہی نہیں کررہا تھا' یہاں تک کہ وہ سوہنی کے قتل کے درپے ہوگیا۔"

"مطلب......!اب باپ اور بیٹے کے درمیان یہ کشمکش ہے کہ سوہنی کو قبول کریں یا نہیں۔" میں نے پوچھا۔

"سردار شاہ دین تو چاہتا ہے۔ شاہ زیب صرف جائیداد کی وجہ سے آڑے آیا ہوا ہے۔ شاید اب تک سوہنی کو اپنی بیٹی کے طور پر قبول کرلیتا مگر شاہ زیب نے دھمکی دی ہے کہ پھر وہ کسی کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ جمال' شاہ زیب تمہیں سوہنی کے قتل کے لیے تیار کررہا تھا اور وہ ملک سجاد کو بھی مار دینا چاہتا تھا کہ یہ قصہ ہی ختم ہوجائے' اور تمہیں معلوم ہی نہ ہو کہ کتنا بڑا معاملہ تمہارے ہاتھوں ماضی میں دفن ہوجاتا جس کا تمہیں بھی علم نہ ہوتا۔"

"اب بات کہاں تک پہنچی ہے۔" میں نے ساری بات سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"شاہ دین تو چاہتا ہے کہ سوہنی کو اپنی بیٹی کے طور پر قبول کرے مگر شاہ زیب نہیں چاہتا۔ اس میں سوہنی کا طوائف ہونا ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ دوسری طرف سوہنی اور اس کی والدہ نے آئی جی صاحب سے رابطہ کیا اور مجھے خاص طور پر اس معاملے کو حل کرنے کے لیے یہاں تعینات کیا گیا ہے۔ سوہنی کے پاس یہ حق اب بھی ہے کہ وہ جب بھی چاہے عدالت کے ذریعے اس معاملے کو اچھال سکتی ہے۔ اس سارے تناظر میں اگر کوئی معقول حل ہوجائے تو بہت اچھی بات ہوگی' اس وقت میں آپ دونوں سے یہی مشورہ کرنے آیا ہوں۔"

"ڈی ایس پی صاحب' میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میرا باپ مجھے بیٹی مان لے۔ یہ آپ کو معلوم ہے کہ میرے والد کے خانے میں سردار شاہ دین ہی کا نام درج ہے۔ یہ میری شناخت کا مسئلہ ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے اور یہ تمہارا حق بھی ہے۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں' تمہیں شناخت ملے گی' اس کے علاوہ کوئی مشورہ؟" وہ تیزی سے بولا۔

"شاہ زیب جائیداد چاہتا ہے نا' تو وہ ساری جائیداد لے لے...... مجھے بس میری شناخت دے دی جائے۔ بیٹی کے طور پر مجھے قبول کرلیا جائے' میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" سوہنی نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا۔

"پھر ایسا کرتے ہیں' میں ان سے بات کرتا ہوں' قانونی طور پر سردار شاہ دین تمہیں اپنی بیٹی تسلیم کرلے' لیکن ساری جائیداد شاہ زیب کو مل جائے' تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"بالکل مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں اپنے حصے کی جائیداد شاہ زیب کو لکھ کر دے دوں گی۔ یہاں تک کہ اپنے باپ کو بھی سنبھال لوں گی۔" سوہنی نے ایک فخر سے کہا۔

"ٹھیک ہے' آپ کے یہ جذبات میں ان تک پہنچا دیتا ہوں۔ میں خود چاہوں گا کہ شاہ زیب ایک معقول رقم تمہیں دے دے۔ پھر تم ان کی زندگی میں کوئی دخل اندازی نہیں کروگی۔"

"مجھے شاہ زیب کی زندگی میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں ہے' لیکن وہ اگر بہن کا حق جتائے گا تو......؟" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"مسئلہ تو یہی ہے نا کہ تم پھر یہ طوائف والی زندگی کو ختم کرکے گمنامی میں زندگی گزاروگی' تمہیں بھی معلوم ہے کہ ان کا ایک سیاسی کیریئر ہے۔ وہ......"

اس نے کہنا چاہا تو سوہنی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے......! میں ایسی کوئی زندگی نہیں گزاروں گی' جس سے انہیں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔ میں وعدہ کرتی ہوں' میں اپنی ماں کو بھی اس زندگی سے نکال لوں گی' بس سردار شاہ دین میرے سر پر بیٹی کہہ کر ہاتھ رکھ دیں۔" سوہنی کا لہجہ حد درجہ جذباتی ہوگیا تھا اور اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"چلیں یہ طے ہوگیا' میں آج ہی ان سے بات کرتا ہوں اور اس مسئلے کو ایک دو دن میں نمٹانے کی کوشش کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے میری جانب دیکھا اور بولا۔ "ایک بات ہے جمال' تب تک' کوئی ایسا معاملہ نہ ہو کہ جس سے یہ سارا کچھ کھٹائی میں پڑ جائے' ہمیں مسئلے کو سلجھانا ہے۔"

"دیکھیں جی' میں پہلے ہی اپنا دفاع کرتا آرہا ہوں۔ علاقے میں ہونے والے قتل مجھ پر ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے' شاہ زیب نے براہ راست مجھے اغواء کرکے قتل کرنے کی کوشش کی اور آج کا واقعہ آپ کے سامنے ہوا۔ مجھ پر اگر وار ہوا تو میں اس کا دفاع تو کروں گا' ہاں...... خود سے کچھ نہیں کروں گا اور نہ میں نے پہلے کیا ہے۔" میں نے بڑے تحمل سے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ تب میں بھی اٹھ گیا۔

"کل دن کے وقت ہم کہیں اکٹھے ہوتے ہیں اور یہ سب طے کرلیں گے......اب مجھے اجازت۔" یہ کہہ کر اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا' میں اسے دروازے تک چھوڑنے گیا' سوہنی اندر چلی گئی تھی۔ چھاکے اور میری نگاہیں چار ہوئیں تو وہ مسکرا دیا' میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہ رہا ہے' اس لیے میں بھی ہنس دیا۔

۞ ۞ ...... ۞ ...... ۞ ۞

جب آپریشن کے بعد ہرپریت کو آئی سی یو میں لایا گیا تب تک انوجیت اسپتال میں آچکا تھا' وہ دونوں بے ہوش پڑی ہرپریت کو دیکھ رہے تھے' تبھی انوجیت نے بڑے تحمل اور آہستگی سے پوچھا۔

"ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟"

"خطرے سے باہر ہے' شام تک ہوش آجائے گا۔ دو بلٹ اس کے کاندھے میں لگی تھیں اور ایک گردن سے ہلکا سا رگڑ کر گزری ہے۔" جسپال نے بتایا۔

"یہ کیسے ہوا؟" انوجیت نے پوچھا تو وہ تفصیل بتانے کے بعد بولا۔

"حملہ آوروں اور ہرپریت کے درمیان کار تھی۔ دراصل نشانہ وہ نہیں تھی' میں تھا۔ یہ تو اچانک ڈرائیونگ سیٹ سے نکل کر ہماری طرف آئی تھی۔" جسپال نے بتایا۔

"سمجھ نہیں آئی' اصولاً تو اسے ڈرائیونگ کی طرف کا دروازہ کھول کر اوپر سے گھوم کر تم لوگوں کی طرف آنا چاہیے تھا؟" انوجیت نے وضاحت چاہی۔

"اس طرف ٹریفک تھی' دروازہ کھولنا خطرے سے خالی نہیں تھا' وہ پسنجر سیٹ سے نکلی تھی' ڈرائیونگ سیٹ کی؟ اگرچہ یہ غلطی ٹریفک سے بچنے کے لیے کی گئی تھی لیکن وہ میرے اور ان حملہ آوروں کی فائرنگ کے درمیان آگئی۔" جسپال نے اسے تفصیلی انداز میں ہاتھ کے اشاروں کا بھی استعمال کرکے سمجھایا تو وہ سمجھ گیا۔ تب پوچھا۔

"کون تھے؟"

"میں کچھ نہیں بتا سکتا ابھی' حملہ آور میں نے پکڑ لیا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے پوری تفصیل بتائی اور پھر بولا۔ "اب تم آگئے ہو' یہاں ہرپریت کے پاس رہو' میں دیکھتا ہوں۔"

"تم کہاں جاؤ گے......؟" انوجیت نے تیزی سے پوچھا۔

"پولیس اسٹیشن' لیکن پہلے میں کیشو مہرہ کو فون کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے جسپال نے اپنا سیل فون

نکالا اور مہرہ کے نمبر ملانے لگا۔ چند لمحوں بعد رابطہ ہوگیا۔ چند باتوں کے بعد اس نے کہا۔

"تم ابھی ادھر اسپتال ہی میں رہنا۔ باہر نکلنے کی کوشش نہیں کرنا۔ دشمن کا کوئی اعتبار نہیں۔"

"میں یہاں پابند ہو کر نہیں بیٹھ سکتا مہرہ۔ مجھے بتاؤ کہ وہ حملہ آور کون تھا اور کس نے بھیجا ہے انہیں؟" جسپال سنگھ نے اکتائے ہوئے انداز میں پوچھا تو مہرہ نے کہا۔

"ابھی اس سے پوچھ تاچھ نہیں کی گئی' میں ابھی پولیس اسٹیشن میں ہی ہوں۔ لگتا ہے یہ کسی گینگ کا معاملہ ہے' ورنہ اب تک پولیس والے اسے بے حال کر دیتے۔"

"تم ادھر ہی رہنا' میں آرہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پولیس اسٹیشن کی لوکیشن پوچھنے لگا۔ پھر فون بند کر کے انوجیت سے کہا۔ "میں جارہا ہوں۔"

"مگر جسپال تمہیں یہاں کوئی نہیں جانتا' کس سے بات کرو گے؟" انوجیت بولا۔

"میں دیکھتا ہوں' تم میری فکر مت کرنا۔" یہ کہہ کر اس نے انوجیت کے کاندھے کو تھپتھپایا اور باہر نکلتا چلا گیا۔

وہ پولیس اسٹیشن پہنچا تو اسے کیشو مہرہ کی گاڑی باہر ہی دکھائی دی۔ وہ کار ایک طرف پارک کر کے اندر چلا گیا۔ ایک بڑے سے ہال کے کونے میں ایک میز کے گرد مہرہ بیٹھا ہوا تھا' اس کے سامنے ایک انسپکٹر جس نے خاکی رنگ کی پگڑی پہنی ہوئی تھی لیکن چہرے پر داڑھی نہیں تھی۔ ایک طرف ایک نوجوان سا لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ مہرہ نے ان سب کا تعارف کرایا۔

"یہ انسپکٹر ہیں یہاں کے اور یہ گرمیت سنگھ چوہان ہے۔" یہ کہتے ہوئے ان دونوں سے تعارف کرایا۔

"کیا پراگرس ہے؟"

"انسپکٹر صاحب نے ابھی تک ایف آئی آر درج نہیں کی' درخواست میں نے دے دی ہے' شام چار بجے کے بعد ایف آئی آر کٹے گی۔" مہرہ نے کہا۔

"مجرم پکڑ لیا گیا ہے' موقع واردات دیکھا نہیں گیا' ایف آئی آر کٹی نہیں' یہ کیا مذاق ہے۔" جسپال نے حیرت سے پوچھا تو انسپکٹر نے سرد سے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"وہ لڑکی آپ کی کیا لگتی تھی' جسے گولی لگی ہے۔"

"میری دوست' میری محسن اور میری میزبان۔" یہ کہہ کر اس نے مہرہ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "آپ نے یہ نہیں بتایا کہ فائر دراصل مجھ پر کیا گیا تھا۔"

"میں نے سب تفصیل سے بتادیا ہے لیکن انہوں نے ابھی تک کچھ نہیں کیا۔" مہرہ نے سکون سے کہا۔

"تم دونوں باؤ لوگ ہو یار' تمہیں کیا پتا کہ نوکری کس طرح کرتے ہیں۔ آپ حملہ آور کو لے کر بعد میں یہاں آئے ہیں' مگر مجھے فون پہلے آگیا تھا' آپ لوگوں کے ساتھ کیا کرنا ہے اور اس حملہ آور کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ یہ بھی مجھے بتادیا گیا ہے۔" اس نے آنکھیں جھپکائے بغیر اسی سرد اور اکتائے ہوئے انداز میں کہا تو کیشو مہرہ نے اس سے بھی سرد لہجے میں پوچھا۔

"مطلب' تم ایک کٹھ پتلی ہو۔"

"آپ کہہ سکتے ہیں۔" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا پھر ذرا سا آگے جھک کر سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "جس بندے نے ہمیں یہاں تعینات کروایا ہے' اس کی تو ماننی ہے نا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ بیرسٹر ہیں' یہ فارن سے آئے ہیں لیکن...... جب معاملہ مجھ سے اوپر ہو جائے تو وہ خود ہی سنبھال لیں گے ہم نے تو اپنی ڈیوٹی کرنی ہے مہرہ صاحب۔ یہاں بیٹھ کر وقت ضائع نہ کریں' جائیں' اس لڑکی کی دیکھ بھال کریں' مجھے بھی جانا ہے کسی کام سے۔"

"مطلب اتنی دیدہ دلیری سے کہہ رہے ہو کہ تم

ہماری کوئی مدد نہیں کرو گے۔" مہرہ نے پوچھا۔

"آف کورس بیرسٹر صاحب' آپ قانونی جنگ لڑیں' جو آپ کا حق ہے' یہ جان لیں کہ آپ کی جنگ ہمارے لکھے ہوئے پر ہی ہونی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی ٹوپی میز پر سے اٹھائی اور اٹھنے لگا' تبھی گرمیت سنگھ نے اشارے سے بیٹھنے کو کہا' اور پھر بولا۔

"انسپکٹر...... تم شاید ابھی تک میرا نام سن کر نہیں چونکے ہو' یا پھر تم بہت بھولے بن رہے ہو' میں پرتاپ چینل سے ہوں...... جو کچھ تم نے کہا ہے' یہ ریکارڈ ہو چکا ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا صحافی صاحب! خبریں تو روزانہ آتی ہیں' چلائیں شوق سے۔" یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکلتا چلا گیا۔ مہرہ کے چہرے پر تاریکی چھا گئی' وہ کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ تبھی جسپال سنگھ نے سکون سے کہا۔

"میں ابھی اپنی ایمبیسی سے بات کرتا ہوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا' یہ کھیل ہی کچھ دوسرا کھیلنا چاہتے ہیں۔" اس نے یوں کہا جیسے خود کلامی کر رہا ہو' پھر اچانک بولا۔ "گرمیت اس حملہ آور کی تصویر لو اور اسے اپنے چینل پر چلاؤ' باقی میں دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔ گرمیت اٹھا اور اس نے سلاخوں کے پیچھے بیٹھے اس حملہ آور کی ویڈیو بنائی اس نے اپنے چہرے کے آگے ہاتھ رکھ لیے وہ واپس آیا تو کیشو مہرہ کسی کے نمبر ملانے لگا۔ گرمیت تھانے سے نکلتا چلا گیا۔ مہرہ نے اس ساری صورت حال کے بارے میں کسی کو بتایا اور کچھ کرنے کو کہا' جبکہ جسپال حیرت سے یہ دیکھتا رہ گیا کہ قانون کی پاسداری اس طرح بھی ہوتی ہے؟ تبھی مہرہ نے کہا۔

"آؤ چلیں۔"

وہ دونوں تھانے سے نکل کر باہر آئے تو جسپال کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا' کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ وہ اسے لے کر ایک اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں آگیا۔ وہاں بیٹھنے اور سوڈے کا آرڈر دینے کے بعد کیشو نے کہا۔

"کچھ سمجھے ہو یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے' میرا خیال ہے اس پولیس والے کو رشوت چاہیے ہوگی جو آپ نے نہیں دی۔" جسپال نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"نہیں جسپال' ایسا نہیں ہے' کوئی پولیس انسپکٹر اتنی صاف گوئی' مطلب اتنے دھڑلے سے ایسی بات نہیں کہہ سکتا' اس نے ہمیں ٹالا نہیں چیلنج دیا ہے' سو اس کے پیچھے صرف اور صرف قانون نافذ کرنے والا کوئی ادارہ ہی ہے' کیا تم رن ویر کو بھول رہے ہو وہ ہم سے کوئی ایسی غلطی چاہتے ہیں' جس سے ان کے شک کو یا تو تقویت ملے یا وہ شک دور ہو جائے۔"

"تو آپ کا کیا خیال ہے کہ ہم مظلوم بن جائیں اور ان سے انصاف کی بھیک مانگتے رہیں۔" جسپال نے تیزی سے کہا۔

"نہیں' صرف اتنا کرنا ہے کہ کوئی غیر قانونی قدم نہیں اٹھانا' وہ تمہارے بارے میں یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تمہارے رابطے کس کس سے ہیں۔ کوئی ایک بھی غلط رابطہ تمہیں شک کے دائرے سے نکال کر یقین کے شکنجے میں لے آئے گا۔ گھبراہٹ اور غصے میں ہی غلط قدم اٹھتے ہیں۔ وہ تمہاری یا ہرپریت کے اردگرد لوگوں کی رسائی دیکھنا چاہتے ہیں کہ مدد کے لیے تم لوگ کن لوگوں کو بلاتے ہو' یہیں سے ان کی تفتیش آگے بڑھے گی۔" مہرہ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے' سوائے انتظار کرنے کے......" وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولا تو مہرہ نے کہا۔

"نہیں' ہم ابھی یہاں سے اٹھ کر اے سی پی کے آفس میں جائیں گے' جو یہاں سے نزدیک ہی ہے۔"

"وہاں جا کر ان سے فریاد کریں گے کہ ایک ادنیٰ سا انسپکٹر' قانون کی پاسداری نہیں کر رہا ہے۔" وہ

تیزی سے بولا تو مہرہ نے سکون سے کہا۔

”بالکل، فریاد ہی نہیں باقاعدہ لکھ کر دیں گے ہمیں وہاں پر کچھ وقت گزار کر واپس اس تھانے میں اسی انسپکٹر کے پاس آنا ہے۔“

”کیا آپ بھی کوئی کھیل کھیلنا چاہ رہے ہیں۔“

”بالکل......! لیکن اس میں تم بالکل یوں دکھائی دو گے کہ جیسے تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں، تم پریشان ہو رہے ہو کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے، اس دفتر میں ہمیں تقریباً دو گھنٹے ضائع کرنے ہیں۔“ مہرہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

وہ سوڈا پیتا رہا اور سوچتا رہا، پھر اٹھ کر اس دکان کے اندر چلا گیا۔ وہاں سے اس نے ایک فون کال کی، جو تقریباً پانچ منٹ تک چلتی رہی، پھر پیسے ادا کر کے وہ واپس مڑا، جسپال کو ساتھ لیا اور تھانے کی پارکنگ تک چلے گئے۔

وہ اے سی پی آفس میں پہنچے تو وہ اپنے آفس میں نہیں تھا۔ کیشو مہرہ نے وہیں بیٹھ کر درخواست لکھی اور اس کے ماتحت عملہ کو دے کر ڈائری نمبر لے لیا، اس مرحلے میں تقریباً ایک گھنٹہ صرف ہو گیا۔ اگلا ایک گھنٹہ انہوں نے وہیں بیٹھ کر اے سی پی کا انتظار کیا۔ بالکل آخری چند منٹ میں وہ اپنے آفس آیا تو وہ دونوں اس کے آفس میں چلے گئے۔ وہ ادھیڑ عمر اور تجربہ کار آدمی تھا۔ کیشو نے جب معاملہ اس کو بتایا تو وہ بولا۔

”اوہ......! یہ تو وہی معاملہ ہے جس کی خبر ابھی چینل پر چل رہی ہے۔“

”لیکن آپ کے انسپکٹر نے ہماری کوئی بات نہیں سنی، وہ تو بات ہی کچھ اور طرح سے کر رہا ہے۔“ جسپال نے شکایتی لہجے میں کہا۔

”آپ نے درخواست دے دی ہے نا، شام تک اگر وہ اس پر کوئی کارروائی نہیں کرتا تو میں اس معاملے کو خود دیکھوں گا، آپ فکرمند نہ ہوں، میں چھان بین کروں گا کہ ایسا کیوں ہوا۔“ اے سی پی نے تشویش زدہ لہجے میں کہا اور پھر کچھ تسلی آمیز باتوں کے بعد انہیں بھیج دیا۔ وہ دونوں اس کے آفس سے نکل آئے۔

”اب واپس تھانے جانا ہے، میرے پیچھے آنا لیکن بہت محتاط ہو کر......“ کیشو نے کہا اور اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

وہ جب تھانے پہنچے تو وہاں پر کچھ مزید چینل کے لوگ پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے انسپکٹر کو گھیرا ہوا تھا اور اس سے سوال کر رہے تھے۔ انسپکٹر بڑے اعتماد سے جواب دے رہا تھا۔ پھر جیسے ہی ان دونوں پر نگاہ پڑی، وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”دیکھیں، میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے کہ جس طرح پرتاپ چینل نے رپورٹ دی ہے اور جس طرح خبر کو بگاڑ کر پیش کیا ہے، اصل واقعہ ویسے نہیں ہے، میں نے چھان بین کی ہے۔ فائرنگ کا سرے سے کوئی واقعہ پیش آیا ہی نہیں ہے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، وہ لڑکی اسپتال میں ہے اور زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے۔“ ایک خاتون صحافی نے جذباتی انداز میں پوچھا۔

”آپ میری پوری بات سنیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا نا۔“ اس نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور پھر بولا۔ ”اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ اس موٹر سائیکل سوار کی بائیک غلطی سے ان کی گاڑی کے ساتھ ٹکرا گئی، انہوں نے اتر کر اسے مارا پیٹا، جس کے گواہ موجود ہیں، بھرے بازار میں اسے رگیدا، اسے بری طرح زدوکوب کیا گیا، اور پھر تھانے میں لا کر یہ کہہ دیا کہ اس نے فائرنگ کی ہے۔“

”اس لڑکی کے جو فائر لگے، وہ کہاں سے لگ گئے۔ وہ کس کھاتے میں ہیں......“ ایک رپورٹر نے سوال کیا۔

”اب صرف یہی مسئلہ حل کرنے والا رہ گیا ہے، میرے خیال میں دو باتیں ہیں، ایک تو کیس مضبوط بنانے کے لیے انہوں نے خود فائر کیے ہیں اور دوسرا خواہ مخواہ کی سنسنی پھیلانے کے لیے یہ ڈرامہ رچایا گیا ہے۔ بہرحال تفتیش جاری ہے اور میں پوری توجہ سے اس کیس کو دیکھ رہا ہوں۔“

”یہ معاملہ کب تک صاف ہو جائے گا۔“ ایک دوسرے صحافی نے پوچھا۔

”دیکھتے ہیں، کب تک ہوتا ہے، کیا نتیجہ نکلتا ہے۔“ انسپکٹر نے کہا اور پھر ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکتا ہوا بولا۔ ”اب بس کریں، مجھے اب کچھ مزید کام بھی کرنے ہیں۔“

”انہی لمحات میں جسپال نے ان رپورٹرز کے سامنے اپنی بات کہنا ہی چاہی تھی کہ کیشو نے اسے روک دیا۔ اس نے مضبوطی سے جسپال کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ چند منٹ بعد وہ چلے گئے تو انسپکٹر نے کہا۔

”آپ لوگ پھر آ گئے ہو، ممکن ہے میں آپ ہی کو ان سلاخوں کے اندر کر دوں، معاملہ وہی ہے جو میں نے ابھی میڈیا کو بتایا ہے۔“

”انسپکٹر......! ہم نہیں جانتے کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو، تمہیں ایسا کرنا چاہیے بھی یا نہیں، تمہاری مرضی ہے کہ تم اس واقعے کو کیا رنگ دے رہے ہو لیکن کب تک......“ کیشو نے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”تو جائیں نا، جا کر ایسے وسائل تلاش کریں جن سے آپ کی آواز سنی جا سکے۔ میں جانتا ہوں کہ تم لوگ ابھی اے سی پی صاحب کے آفس سے آئے ہو، کوئی فائدہ نہیں ہو گا، میری مانو تو خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکلو، اور جاؤ اپنے اپنے گھر...... سکون کرو...... وہ لڑکی ٹھیک ہو جائے تو اسے گھر میں آرام کرنے دیں...... گڈ لک......“ انسپکٹر نے کہا اور باہر کی جانب چل پڑا۔ اسے گئے چند منٹ ہی ہوئے تھے جسپال نے کیشو سے پوچھا۔

”اب کیا کریں......؟“

”بس چند منٹ......“ یہ کہتے ہوئے اس نے گھڑی دیکھی اور پرسکون سا ہو کر کرسی پر بیٹھا رہا۔ چند منٹ ہی گزرے تھے کہ لاک اپ کے اندر سے ایک دم سے اونچی اونچی آوازیں آنے لگیں، پھر آپا دھاپی شروع ہو گئی، تبھی ایک چیخ بلند ہوئی، جس وقت تک دوسرے اہلکار وہاں پہنچتے، اندر سے کسی کے بلبلانے کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ دونوں بھی باہر نکلے اور لاک اپ کی سلاخوں کے سامنے چلے گئے۔ وہ جو حملہ آور تھا، وہ بے ہوش پڑا تھا، اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے پیچھے چند سپاہیوں نے ایک لمبے تڑنگے شخص کو روکا ہوا تھا جو بپھرے ہوئے انداز میں اسے مارنے کے درپے تھا۔ وہ اونچی اونچی آواز میں اسے گالیاں نکال رہا تھا۔

”یہ کیا ہوا؟“ جسپال کے منہ سے سرسراتے ہوئے نکلا۔

”دیکھتے جاؤ، ہوتا کیا ہے، کھیل شروع ہو گیا ہے۔“ کیشو نے سرد مہری سے ہلکی آواز میں کہا اور واپس انسپکٹر کے کمرے کی طرف بڑھا، تبھی کسی کانسٹیبل نے کہا۔

”ارے یہ مر جائے گا...... اس کے خون بہت بہہ رہا ہے۔“

”وہ دوسرے کے بھی تو اتنا بڑا زخم ہے۔“

”اسپتال تو لے جانا پڑے گا۔ ورنہ یہ تو ہمارے گلے میں اٹک جائیں گے۔“

”اوئے صاحب کو فون لگاؤ۔“

”وہ باہر ہیں۔“

”تو پھر جلدی بلاؤ یار۔“

وہاں پر اودھم مچ گیا، مہرہ اور جسپال تماشائیوں کی مانند انہیں دیکھتے رہے۔ جسپال کے ذہن میں آ رہا تھا کہ اگر حملہ آور کہیں مر گیا تو سارا ثبوت اور وہ راستہ ختم ہو جائے گا جس سے وہ اپنے اس دشمن تک پہنچتے جس

نے حملہ کروایا تھا۔ چند منٹ گزرے ہوں گے کہ انسپکٹر بھاگتا ہوا آ گیا۔ حملہ آور فرش پر پڑا تھا۔ وہ ایک ہی نگاہ میں حالات کی نزاکت بھانپ گیا۔ ان دونوں کے خون بہہ رہا تھا۔ انسپکٹر دونوں ہی کو ہسپتال لیجانے پر مجبور تھا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر تیزی سے بولا۔

''فوراً...... فوراً انہیں اسپتال لے چلو۔''

''سر...... ایمبولینس کے لیے فون کردیں سر......'' ایک کانسٹیبل نے تیزی سے کہا۔

''اوئے نہیں، بہت دیر ہوجائے گی' باہر دیکھو' کوئی وین وغیرہ مل جائے' نہیں تو ٹیکسی ہی پکڑ لینا۔'' انسپکٹر نے حکم دیا تو دو چار کانسٹیبل باہر کی جانب لپکے' تبھی مہرہ نے جسپال سے آہستگی کے ساتھ کہا۔

''چلو' نکلتے ہیں۔''

وہ دونوں اٹھے ہی تھے کہ ایک کانسٹیبل نے مہرہ سے کہا۔

''آپ کی گاڑی بھی تو ہے ناشاب' ان کو لے چلیں۔''

تبھی مہرہ نے ایک نگاہ انسپکٹر پر ڈالی اور طنزیہ لہجے میں بولا۔

''سوری...... ان دونوں میں سے کوئی مر گیا تو تیرے انسپکٹر نے سارا مدعا مجھ پر ڈال دینا ہے جاؤ...... جا کر کوئی دوسری گاڑی تلاش کرو۔''

وہ کانسٹیبل عجیب سی نگاہوں سے گھورتا ہوا ایک طرف ہوگیا جبکہ انسپکٹر نے انہیں غصے میں دیکھا۔ مہرہ نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے تھانے سے باہر آ گئے۔ جہاں ایک وین کو ان کانسٹیبلوں نے گھیرا ہوا تھا۔ انہوں نے ڈرائیور کو نیچے اتارا ہوا تھا' ایک ان سے بات کرنے لگا تو دوسرے تھانے کی طرف لپکے' مہرہ پارکنگ میں اپنی گاڑی کے پاس رک گیا۔ پھر جسپال کی طرف دیکھ کر بولا۔

''تم نے اپنی گاڑی میں میرے پیچھے پیچھے آنا ہے' اگر میں گم بھی ہوجاؤں تو فون پر رابطہ کرلینا۔ کسی بھی غیر یقینی صورت حال میں واپس اسپتال چلے جانا۔''

''کیا ایسی کوئی خطرناک بات ہے؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''میں ایک رسک لینے جارہا ہوں۔ ہوگیا تو دیکھنا......'' اس نے یہ کہا ہی تھا کہ ان دونوں حوالاتیوں کو باہر لایا گیا۔ وہ دونوں بے ہوش تھے اور کانسٹیبلوں نے انہیں ڈنڈا ڈولی کے انداز میں اٹھایا ہوا تھا۔ انہیں وین میں لا پھینکا تو وہ چل دی۔ اس وقت مہرہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

رش والے علاقے سے نکلتے ہی وہ ایک بڑی سڑک پر آ گئے' جیسے ہی وہ ایک موڑ مڑنے کے لیے آہستہ ہوئے' پیچھے سے آنے والی ایک سفید ویگن نے ان کا راستہ روکنا شروع کردیا۔ یہاں تک کہ ایک سائیڈ دبا کر انہیں رکنے پر مجبور کردیا۔ تبھی ویگن بھی رک گئی اور اس میں سے پانچ چھ نوجوان گنیں لے کر باہر آ گئے۔ شاید کانسٹیبلوں کے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ممکن ہوجائے گا۔ ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر سائیڈ ڈور کھولا اور انہیں نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک ایک کرکے اترنے لگے' تب تک ایک اور نوجوان ڈرائیور کو نیچے اتار چکا تھا۔ جیسے ہی دونوں حوالاتی اندر وین میں رہ گئے، وہ اس وین میں بیٹھ گئے' دونوں ویگنیں چل پڑیں اور وہ کانسٹیبل اور ڈرائیور وہیں کھڑے منہ تکتے رہ گئے۔ جسپال یہ سب دیکھ رہا تھا' اور سمجھ چکا تھا کہ مہرہ نے کیا کھیل کھیلا ہے' اس لیے دھیرے سے مسکرا دیا۔

آگے دو ویگنیں تھیں' اس کے پیچھے مہرہ اور اس کے بعد جسپال' تیزی سے جارہے تھے۔ اچانک حوالاتیوں والی وین سیدھی نکلتی چلی گئی' اور کراس پر سے دوسری وین دائیں جانب مڑ گئی اور مہرہ بائیں جانب چلا گیا' جسپال کو سمجھ نہیں آئی کہ ایسا کیوں ہوا لیکن اس نے مہرہ کا تعاقب جاری رکھا۔ تقریباً دس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد وہ ایک ایسی جگہ آ نکلے جہاں بہت کم آبادی تھی۔ زیادہ تر فیکٹریاں تھیں۔ اسے لگا کہ یہ فیکٹری ایریا ہے' مہرہ پختہ تارکول والی سڑک سے اتر کر نیم پختہ راستے پر چل پڑا اور پھر ایک فیکٹری کے آگے جا رکا' اگلے ہی لمحے گیٹ کھل گیا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ وہ سفید وین وہاں کھڑی تھی' کچھ ہی دیر بعد وہ ایک ہال نما کمرے میں تھے' جہاں اچھا خاصا کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ وہیں زمین پر وہ دونوں حوالاتی پڑے ہوئے تھے۔ چند نوجوان ان کے اردگرد کھڑے تھے۔ مہرہ کو دیکھتے ہی ایک نے کہا۔

''سر......! جگ دیو کو لے جائیں۔''

''ڈاکٹر نہیں آیا......؟'' اس نے سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ اس وقت نہیں ہے مگر ڈسپنسر ہے' وہ آرہا ہے۔'' لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ ایک ادھیڑ عمر سا بندہ ہال میں داخل ہوا۔ اس کے پاس میڈیکل بیگ تھا۔ اس نے آتے ہی ان دونوں کو دیکھا جو اس وقت ہوش میں تھے۔

''پہلے جگ دیو کی پٹی وغیرہ کرو' اسے بعد میں دیکھنا شاید اس کی ضرورت نہ پڑے۔'' مہرہ نے سرد لہجے میں کہا تو حملہ آور نے حسرت بھری نگاہوں سے مہرہ کو دیکھا' ڈسپنسر نے جگ دیو کو دیکھنا شروع کیا' تو مہرہ اس حملہ آور کے پاس بیٹھ گیا' پھر سرد سے لہجے میں غراتے ہوئے بولا۔

''دیکھ......! اب زندگی اور موت دونوں تیرے اپنے اختیار میں ہے جو کچھ میں پوچھنا چاہتا ہوں' وہ اگر سچ بتادے گا تو تیری مرہم پٹی کرکے تجھے اچھا کھانا دیا جائے گا اور شہر میں سکون سے چھوڑ دیں گے اور اگر نہیں بتائے گا تو تجھے مار کر ایسی گندی جگہ پھینکوں گا' جہاں پر کتے تجھے نوچ نوچ کر تیری شناخت ہی ختم کردیں گے...... اب بول کیا کرنا ہے تجھے''

کیشو مہرہ کہتا چلا جارہا تھا اور اس حملہ آور کی آنکھوں میں وحشت کے ساتھ خوف پھیلتا چلا گیا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

''انسپکٹر رن ویر...... ہم اس کے لیے کام کرتے ہیں۔'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''تمہارا تعلق فورسز سے ہے؟'' مہرہ نے پوچھا۔

''نہیں...... وہ وقتاً فوقتاً ہم سے کام لیتا ہے اور ہماری مدد کرتا رہتا ہے۔'' اس نے کہا تو وہ اٹھ کر بولا۔ ''بھگوان کے لیے...... میرا اتنا جرم نہیں ہے...... جتنا......''

''تم نہیں جانتے۔ تم نے کیا کیا ہے' خیر......! اگر تمہارا کہا جھوٹ ہوا تو......'' مہرہ نے کہا تو ایک دم سے وہ مایوس ہوگیا' پھر گھگھیائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''آپ تصدیق کرلیں۔''

''وہ تو میں کروں گا...... تب تک تم یہاں ہمارے مہمان رہو گے...... سچ ہوا تو چھوڑ دیں گے' جھوٹ ہوا تو......''

جسپال یہ سب دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا۔ ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال تو تھا کہ رن ویر اسے نقصان پہنچانے کے لیے ہی اس کے ساتھ جڑا ہوا ہے لیکن وہ قانونی تناظر میں سوچ رہا تھا' اسے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ یوں غنڈہ گردی کرے گا' اس کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا تھا۔ اس کا من چاہ رہا تھا کہ ابھی جائے اور رن ویر سنگھ کو شوٹ کردے' تاہم سوچنے اور اس پر عمل کرنے میں کچھ فرق ضرور ہے اور اس کے لیے وقت چاہیے ہوتا ہے۔

''آؤ چلیں......'' مہرہ نے اس کا بازو پکڑا اور باہر کی جانب چل دیا۔ باہر برآمدے میں آ کر جسپال نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

''کیشو...... رن ویر پارٹی بن جائے گا' یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔''

"جسپال...... !تمہارے بارے میں میرا اندازہ یہ ہے کہ تم نہ یہاں کی دوستی سمجھ سکتے ہو اور نہ ہی دشمنی۔ یہاں قانون کی پاسداری نہیں ہے‘ سب سے پہلے دھرم‘ پھر مفاد اور اکثر اوقات دھرم کہیں پیچھے رہ جاتا ہے اور مفاد ہی سب سے پہلے ہوتا ہے۔ رن ویر سنگھ کی لڑائی لڑ رہا ہے‘ نرنکاریوں کے لیے...... اپنے ڈیپارٹمنٹ کے لیے...... یا قانون کے لیے...... میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرتا‘ لیکن جو حقیقت تمہارے سامنے آئی ہے‘ اس پر تم خود فیصلہ کر سکتے ہو۔"

"تو پھر فیصلہ کیشو مہرہ...... مجھے پنڈ اوگی ہی میں رہ کر سب کچھ کرنا ہے......" جسپال نے سرد لہجے میں کہا تو مہرہ چونک گیا‘ چند لمحے سوچتا رہا پھر جوشیلے انداز میں بولا۔

"بالکل درست...... !تم اپنی زمین اور حویلی کے بارے میں فکر مت کرنا‘ جائیداد کا مسئلہ مجھ پر رہا‘ جب تک تم بلجیت سنگھ کو اپنے پاؤں کے نیچے نہیں لے لیتے ہو‘ تب تک تم جو بھی کرو گے...... یہ تمہارا تعاقب کریں گے۔"

"ٹھیک ہے......" جسپال نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور وہاں سے چل دیئے۔ دونوں گاڑی تک آئے اور آگے پیچھے نکلتے چلے گئے۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

سہ پہر کا وقت ہو گیا تھا۔ میں دلبر کے گھر سے نکل آیا تھا‘ ڈی ایس پی سے بات کرنے کے بعد میں دلبر کے گھر چلا گیا تھا کہ جو لوگ اب بھی وہاں موجود ہیں انہیں معلوم ہو کہ دلبر کے لواحقین کے سر پر ہم ہیں۔ سہ پہر تک سارے مہمان وغیرہ جا چکے تھے جب سکون ہو گیا تو میں اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ میں پیدل ہی جا رہا تھا۔ چوک میں پہنچا تو حسب معمول برگد کے درخت تلے کافی سارے لوگ جمع تھے۔ ان میں زیادہ تر نوجوانوں ہی کی تعداد تھی۔ میں بھی ان کے پاس جا کر ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تبھی ایک جوشیلے سے نوجوان نے مجھ سے پوچھا۔

"جمال...... !یار یہ شاہ زیب تیرے پیچھے ہی کیوں پڑ گیا ہے‘ کہیں اس لڑکی کا چکر تو نہیں ہے؟"

"یہ تمہارا چکر سے مراد کیا ہے؟" میں نے جواب دینے کی بجائے اس سے پوچھ لیا۔

"یہی کہ اسے وہ پسند آ گئی ہو‘ جبکہ وہ تمہارے پاس ہے۔" اس نوجوان نے کہا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر بات کیا ہے۔" اس نے تجسس سے پوچھا۔

"بس دو چار دن ٹھہر جا یار‘ تجھے خود بخود معلوم ہو جائے گا مگر یہ ذہن میں رکھو کہ شاہ زیب اتنا گھٹیا نہیں کہ وہ اس لڑکی کی وجہ سے میرا دشمن بن گیا ہے۔" میں نے پھر سے انکار کر دیا تو ایک سنجیدہ سے نوجوان نے کہا۔

"جمال‘ پورے گاؤں میں یہ تجسس ہے‘ نجانے کیسی کیسی افواہیں گھوم رہی ہیں یہ تو سچ ہے نا کہ جب سے اس لڑکی کے نور نگر میں قدم پڑے ہیں قتل وغارت شروع ہو گئی۔"

"میں تیری ساری باتیں مانتا ہوں...... میں تو اس کے چکر والی بات کا جواب دے رہا ہوں۔ لڑکی کے بارے میں شاہ زیب کی سوچ وہ نہیں ہے جو یہ سوچ رہے ہیں۔ معاملات کچھ دوسرے ہیں۔ یہ ساری افواہیں اور تجسس چند دن میں ختم ہو جائے گا۔" میں نے اشارے میں جواب دیا۔ ظاہر ہے وہ میری بات سے مطمئن تو ہونے والے نہیں تھے۔ اس لیے مجھ سے پوچھا۔

"تمہارے ساتھ دشمنی کا معاملہ کیا ہے؟"

"دیکھو...... !وہ مجھے باڈی گارڈ بنا کر اپنا غلام بنانا چاہتا ہے‘ سردار شاہ دین نے خود مجھ سے یہ کہا ہے‘ مگر

میں ایسا نہیں چاہتا۔ میں جو دوسروں کو ان کی غلامی سے نکالنا چاہتا ہوں‘ ان کا غلام کیسے بن جاؤں۔ میرا انکار انہیں پسند نہیں آیا۔ اس لیے وہ میرے دشمن ہیں۔" میں نے کچھ سچ اور کچھ جھوٹ کا سہارا لے کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"مان لی تمہاری بات‘ لیکن لڑکی والا قصہ کیا ہے؟" اسی نوجوان نے بحث کرتے ہوئے کہا۔

"کہا نا دو چار دن میں معلوم ہو جائے گا۔" میں زچ ہوتے ہوئے کہا تو وہاں پر خاموشی چھا گئی‘ پھر اس بارے میں کسی نے سوال نہیں کیا۔

اگرچہ میں نے انہیں جھوٹ سچ کہہ کر وقتی طور پر ان سے جان چھڑا لی تھی‘ لیکن مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ گاؤں نور نگر کے مکینوں کو اس لڑکی کے بارے میں تجسس ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس معاملے میں کہیں نہ کہیں سوہنی کا عمل دخل ہے۔ ان کے نزدیک تو وہ ایک طوائف ہی تھی جو ناچنے کے لیے میلے میں آئی تھی اور پھر وہ میرے گھر میں ٹھہری۔ میرے ذہن میں جو ایک دم سے سوال ابھرا تھا وہ یہ تھا کہ اگر سوہنی کو سردار شاہ دین قبول کر لیتا ہے تو کیا نور نگر یا پورے علاقے کے لوگ اس انہونی کو قبول کر لیں گے؟ کیا اس قبولیت کے ساتھ سردار شاہ دین کا ماضی سامنے نہیں آئے گا؟ جس میں اس کا کردار کوئی قابل تحسین نہیں تھا۔ اگر سردار شاہ دین اسے بیٹی کے طور پر قبول کر لیتا ہے تو کیا سوہنی پر سے طوائف کا لیبل اتر جائے گا؟ کیا اسے سردار زادی کے طور پر لوگ قبول کر لیں گے؟ کیا سردار شاہ دین کی عزت واحترام کی وہ سطح رہ جائے گی جو انہوں نے اپنے تئیں بلند مقام پر رکھی ہوئی تھی؟ ایک دم سے ہی کتنے سارے سوال میرے ذہن میں اترتے چلے گئے۔ میرا وجدان کہہ رہا تھا سردار اپنے رعب و دبدبے کے آگے ہر شے قربان کر دیتے ہیں۔ سردار شاہ دین کبھی بھی اپنی ساکھ‘ عزت واحترام‘ مقام اور مرتبے سے نیچے نہیں آ سکتا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ اپنے دل سے مجبور ہو کر اولاد کا درد محسوس کرتے ہوئے اور بیٹی کی ہمدردی میں اسے قبول کر لے گا تو وہاں اتنے ہی یہ چانس تھے کہ وہ ضرور کوئی سازش کر کے سوہنی ہی کو ختم کر دے‘ پھر اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہے گا‘ چہ جائیکہ شاہ زیب اور شاہ دین میں سوہنی کے معاملے میں مخالفت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ ممکن ہے شاہ دین اپنی عمر کے تقاضے کو دیکھتے ہوئے خاموشی سے یہ سمجھوتہ کر لے‘ مگر شاہ زیب نے تو ابھی حکمرانی کرنا تھی‘ وہ اپنے نام کے ساتھ یہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ اس کی بہن طوائف زادی ہے‘ اس لیے مجھے نہیں لگتا تھا کہ سردار سوہنی کے بارے میں کوئی اچھا فیصلہ کرنے والے تھے۔ اس سمجھوتے میں وہ سوہنی سے جان چھڑانے والی بات ہی کریں گے۔ کیونکہ سمجھوتے کبھی دل سے نہیں کیے جاتے‘ مجبوری میں کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ میں ان نوجوانوں کے ساتھ بیٹھا گپ شپ کرتا رہا تھا‘ لیکن یہ سوال جو میرے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے‘ مجھے بے چین کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی اور دن ڈھل گیا۔ میں وہاں سے اٹھ کر گھر کی طرف چل پڑا۔

میں جب گھر پہنچا تو میدہ دودھ دے کر جا چکا تھا۔ مجھے صحن میں آتا دیکھ کر ماں نے دور ہی سے کہا۔

"منہ ہاتھ دھو کے آ جا پتر...... کھانا کھا لے۔"

میں وہیں سے باتھ روم کی طرف مڑ گیا۔ پھر جب چارپائی پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ باہر کا گیٹ بج اٹھا۔

"یار اس وقت کون آ گیا؟" میں نے بڑبڑاتے ہوئے اٹھنا چاہا تو دالان میں کھڑی سوہنی نے کہا۔

"تم بیٹھو‘ میں دیکھتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے گیٹ کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ تبھی اماں نے تیزی سے پکارا۔

"سوہنی......! ادھر واپس آ جا' میں دیکھتی ہوں' سو سجن' سو دشمن' پتا نہیں باہر کون ہے؟"

سوہنی کے قدم وہیں رک گئے۔ اماں اس کے قریب سے گزر کر باہر گیٹ کے پاس چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد چھوٹا گیٹ کھلا اور ڈی ایس پی اندر آ گیا۔ میں نے اسے دیکھ کر اٹھنا چاہا تو وہ دور سے ہی بولا۔

"بیٹھو' بیٹھو...... مجھے ذرا جلدی تھی' اس لیے میں آ گیا۔"

میں اتنی دیر میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس سے مصافحہ کیا' تب تک سوہنی اندر سے کرسی لے آئی تھی۔ وہ اس پر بیٹھ گیا۔ تبھی اس نے سوہنی کو بھی بیٹھنے کے لیے کہا' وہ میرے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئی' لیکن اماں کچن کی طرف چلی گئی۔

"سوہنی......! صبح جو ہمارے درمیان بات ہوئی تھی وہ میں نے سردار شاہ دین سے کر دی اور پھر اس پر تفصیلی بات چیت بھی ہوئی' وہ مانتے ہیں کہ تم ان کی بیٹی ہو' لیکن شاہ زیب آڑے آ چکا ہے۔"

"وہ تو میں نے کہہ دیا مجھے جائیداد نہیں چاہیے پھر وہ کیوں نہیں مانتا۔" سوہنی نے تیزی سے کہا۔

"وہ صرف اس بات سے خائف ہے کہ تم ایک طوائف ہو۔ وہ اپنے ساتھ تمہارا نام جوڑنا نہیں چاہتا۔" وہ آہستگی سے بولا۔ تب سوہنی مایوسانہ انداز میں بولی۔

"تو پھر کیا کہتے ہیں وہ......؟"

"شاہ دین نے تو اپنا موقف بتا دیا تھا لیکن اس وقت تو معاملہ شاہ زیب کا ہے۔" ڈی ایس پی نے کہا تو وہ غصے میں بولی۔

"وہ کیا کہتا ہے' مطلب' وہ کیا چاہتا ہے کہ میں خودکشی کر لوں۔"

"اس کا کہنا ہے کہ جتنی چاہے تم دولت لے لو...... مگر اس حق سے دستبردار ہو جاؤ کہ تم سردار شاہ دین کی بیٹی ہو۔"

"مطلب' وہ میری قانونی حیثیت قبول نہیں کرنا چاہتا۔" سوہنی نے سوچنے والے انداز میں کہا۔

"بظاہر تو یہی لگتا ہے۔" وہ بھی تقریباً مایوس ہو گیا۔

"او کے ڈی ایس پی صاحب آپ نے تو محنت کی' لیکن سردار ایسا نہیں چاہتے' نہ سہی' میں کل عدالت میں رٹ دائر کر دیتی ہوں' پھر سارے ملک کو پتا چل جائے گا' یہ رات درمیان میں ہے۔ رہی زندگی تو کل عدالت میں...... آپ بھی اپنا موقف دے دیں گے نا......" سوہنی نے اپنی بات کہتے کہتے اس سے پوچھا۔

"میں تو قانون کے مطابق بات کروں گا' میں بہرحال اپنی رپورٹ آج ہی بنا کر بھیج دوں گا۔ اپنے اعلیٰ افسران کو' پھر وہ جانے اور آپ یا سردار......" وہ آہستگی سے بولا' پھر اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "بہرحال...... آج رات آپ اپنا خیال رکھیں' میں کچھ نفری یہاں چھوڑے جا رہا ہوں...... وہ آپ کی حفاظت کریں گے۔"

"نہیں ڈی ایس پی صاحب' یہ بیچارے سارا دن کے تھکے ہوئے' رات کیا ڈیوٹی دیں گے۔ ہم خود اپنی حفاظت کر لیں گے۔"

"بیٹھو' پتر کھانا کھا لو...... جو دال ساگ بنا ہے چکھ لو۔" اماں نجانے کس وقت ٹرے میں کھانا رکھے وہاں آ گئی تھیں۔

"اماں جی......! اس وقت مجھے قطعاً بھوک نہیں ہے۔ میں سرداروں کے ہاں سے کھانا کھا کر نکلا ہوں۔ لیکن کہتے ہیں کہ کھانا سامنے آ جائے تو انکار نہیں کرنا چاہیے' آپ صرف ایک کپ چائے پلا دیں' کھانا ہو گیا۔" یہ کہہ کر وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔ میں نے اماں کو کھانا واپس لے جانے کا اشارہ کر دیا۔ تبھی سوہنی بھی اٹھ گئی۔ میں اور وہ دونوں اکیلے رہ گئے۔ تبھی وہ بولا۔

"جمال......! تم کوئی تیسری راہ نکال سکتے ہو؟"

"تیسری راہ تو تبھی نکل سکتی ہے نا جناب کہ اگر دونوں طرف سے مخلص ہوں' اب دیکھیں سوہنی صرف اپنی شناخت چاہتی ہے' جائیداد کا حق نہیں۔ دوسری طرف سے نہ شناخت دی جا رہی ہے اور حق...... بلکہ منہ بند کرنے کی قیمت دی جا رہی ہے۔" میں نے کہا تو وہ بولا۔

"وہی نا...... یہ تو سامنے ہے' تیسرا کوئی حل۔"

"میں وہی کہہ رہا ہوں نا کہ ایک طرف کے لوگ مخلص نہیں ہیں۔" میں نے پھر اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا تو اس نے تجسس سے پوچھا۔

"یہ تم کس بنا پر کہہ رہے ہو؟"

"اس لیے کہ انہیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ سوہنی کے پاس عدالت جانے کا حق ہے' لیکن یہ حق اس وقت ختم ہو جائے گا جب وہ عدالت پہنچ ہی نہیں پائے گی' ان سرداروں کے دماغ میں کہیں ہے کہ سوہنی کی زندگی کا خاتمہ' ان کے لیے نجات ہے۔ انہوں نے قانون کی آنکھ میں دھول اس طرح جھونکی ہے کہ دونوں باپ بیٹا ڈرامہ کر رہے ہیں۔ ایک مانتا ہے' ایک نہیں مانتا اور موقع پاتے ہی سوہنی نہیں رہے گی۔ حالانکہ سوہنی نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اپنی شناخت لے کر یہ ملک ہی چھوڑ جائے گی' تو پھر انہیں ڈر کیوں ہے؟" میں نے تفصیل سے بتایا تو وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

"بات تو دل کو لگتی ہے' سوہنی کی زندگی کو خطرہ تو ہے' لیکن سوال یہ ہے کہ تم اس کی حفاظت کر پاؤ گے۔ وہ یہاں سے کہیں محفوظ جگہ پر چلی کیوں نہیں جاتی؟"

"میں تو اپنی پوری کوشش کروں گا کہ اس کی حفاظت کروں اور جہاں تک چلے جانے کا تعلق ہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ لاہور میں بھی محفوظ ہو گی۔ وہاں پر تو وہ زیادہ ان کے نشانے پر ہو گی۔ اب تک انہوں نے یہ ڈرامہ کیوں کیسے رکھا' وہ اب اس کی موومنٹ پر نگاہ رکھیں گے۔ آج رات نکلے یا کل صبح' انہوں نے حملہ کرنا ہی کرنا ہے۔"

"تم اتنے پر یقین ہو۔" اس نے تجسس سے پوچھا تو میں نے بڑے تحمل سے کہا۔

"جی ڈی ایس پی صاحب......! میں بچپن سے انہیں سمجھ رہا ہوں جو کچھ یہ سوچ کر بیٹھے ہوئے ہیں' میں وہ قطعاً نہیں ہونے دوں گا کہ سوہنی میری پناہ میں ہے' آپ کیوں نہیں سمجھتے یہ ان کی جائیداد ہی کا نہیں حکمرانی کا بھی مسئلہ ہے' ایسی دس بیٹیاں وہ قربان کر دیں۔"

"سردار شاہ دین تو بہت جذباتی ہے۔"

"لیکن وہ بہت بڑا ایکٹر بھی ہے۔ بڑا زبردست ڈرامہ کرتا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس دیا۔ اس دوران سوہنی چائے لے کر آ گئی' وہ آہستہ آہستہ سپ لے کر پینے لگا۔ پھر بولا۔

"اب دیکھو......! مجھے سو کام ہیں' لیکن کل سے انہوں نے مجھے الجھایا ہوا ہے۔ خیر...... تم لوگ اپنی طرف سے درخواست لکھ کر دے دو' کہ آپ کو سرداروں سے خطرہ ہے' میں اب جاتے ہوئے انہیں پابند کر جاؤں گا۔"

"سوہنی چاہے تو دے دے درخواست' مجھے ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا تو گیٹ بج اٹھا۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ میں اٹھ کر باہر کی طرف گیا' وہاں فخرو کھڑا تھا' سرداروں کا خاص ملازم۔

"ہاں بولو!"

"ڈی ایس پی صاحب یہیں ہیں۔" اس نے پوچھا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح چائے پیتے ہوئے نفری کے لوگ اور گاڑی دیکھ چکا تھا' میں نے پھر بھی تحمل سے جواب دیا۔

"ہاں...... ہیں۔"

"میں ان سے مل سکتا ہوں۔"

"آ جاؤ......" میں نے کہا اور اندر آنے کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ میرے ساتھ ہی چارپائی تک آیا اور پھر بیٹھ گیا۔ ڈی ایس پی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"بولو' کیا کہنا ہے؟"

"سردار صاحب کہہ رہے ہیں کہ جاتے ہوئے حویلی کی طرف سے ہوکر جائیں۔"

"کیوں......؟" اس نے قدرے تلخی سے پوچھا۔

"جی' یہ تو نہیں معلوم' انہوں نے پیغام دیا......"

"انہیں کہو کہ میں نے سارا دن گزار لیا' ان کے کام کے لیے' اب مجھے کچھ اور بھی کرنا ہے' میں ان کا ذاتی ملازم نہیں ہوں' انہیں بتا دینا کہ میں کل پورے علاقے کی خود پنچائت بلا رہا ہوں اپنے آفس میں' انہیں بھی آنا ہوگا' کیونکہ مجھے کل تک ہر صورت رپورٹ بنا کر بھیجنی ہے۔" ڈی ایس پی نے نجانے کیوں ایسا کہہ دیا۔

"جی' وہ شاید آپ سے یہی کہنا چاہ رہے ہیں کہ کل کاغذات کی تکمیل کروالیں' سردار صاحب لکھ دیں گے جو چاہیں گے......" فخرو نے جھجکتے ہوئے کہا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی بولتا' سوہنی نے دالان ہی سے کہا۔

"سنو فخرو! جاؤ اور جا کر سردار صاحب سے کہہ دو' اس کے پاس صرف دو گھنٹے ہیں' میں ڈی ایس پی صاحب کی منت سماجت کر کے انہیں روک لیتی ہوں۔ اگر وہ یہاں آ کر طے کرلیں تو ٹھیک' ورنہ میں انہی کے ساتھ واپس جا رہی ہوں' پھر عدالت ہی میں ملاقات ہوگی۔ میں تو اپنے باپ کا پاس کر رہی ہوں' اگر میرا باپ ہی پاس نہیں رکھنا چاہتا تو پھر میں کیا کروں۔"

"بی بی جی......! قانونی طور پر معاملہ طے کرنے میں عدالتی کاغذات کی ضرورت ہوتی ہے نا' وہ تو اب صبح ہی ملیں گے......وہ یہی کہنا چاہ رہے ہیں کہ آپ کو بھی اور وہ بھی ان صاحب کے دفتر میں بیٹھ کر کاغذات تیار کروا کر......"

"کاغذات ہیں میرے پاس۔ وہ آئیں اور ان پر دستخط کردیں' بس......میں اس صورت میں بھی واپس چلی جاؤں گی' یہاں نہیں رہوں گی۔" سوہنی کے لہجے میں غصہ سلگ رہا تھا۔

"ہاں بھئی جاؤ' میں آدھا گھنٹہ یہاں انتظار کرلیتا ہوں' تب تک آ گئے سردار صاحب تو ٹھیک ورنہ ہر ایک کی اپنی مرضی......" ڈی ایس پی نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "مجھے تھوڑا آرام کرنا ہے۔"

"چلیں۔" میں نے باہر والے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ میرے ساتھ بڑھ گیا۔

میں اس وقت کھانا کھا چکا تھا' جب چھاکا حواس باختہ سا گھر میں داخل ہوا۔ اسے کسی نے غلط اطلاع دے دی تھی کہ پولیس مجھے پکڑنے کے لیے آئی ہے' جب اسے ساری بات کا پتا چلا تب وہ پرسکون ہوگیا۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا تھا' ڈی ایس پی باہر والے کمرے سے اٹھ کر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ میری توقع کے مطابق سردار شاہ دین وہاں آن پہنچا۔ باہر والے کمرے میں سردار' ڈی ایس پی' میں اور سوہنی کے علاوہ فخرو اور چھاکا بھی تھے۔ سردار چند لمحے خاموش بیٹھا رہا' پھر گویا ہوا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ اگر بات عدالت اور عدالت سے میڈیا تک پہنچی' تب مجھے سوہنی کو اپنی بیٹی قرار دینا ہی پڑے گا' لیکن اس کے علاوہ مجھ پر کیا چارج ہوں گے۔ انہیں میں بخوبی جانتا ہوں۔ شاہ زیب کو فقط اپنی جائیداد دکھائی دے رہی ہے' جو ساکھ وہ بچانا چاہتا ہے' وہ نہیں بچے گی' میں پورے دل سے سوہنی کو اپنی بیٹی مانتا ہوں' کل عدالت میں جا کر جو قانونی کارروائی میری بیٹی چاہے' میں اس کے لیے تیار ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا اور اس نے اپنی بانہیں

پھیلا دیں۔ یہی وہ نازک ترین مرحلہ تھا' جہاں سوہنی جذبات میں آ کر کچھ بھی فیصلہ کرسکتی تھی' میں اچھی طرح جانتا تھا کہ سردار کا یہ فیصلہ بہت سوچ بچار کے بعد کیا گیا ہے' وہ باپ کے گلے لگ کر رو رہی تھی' کچھ وقت ایسے ہی گزر گیا۔ ماحول میں سوگواریت گھل گئی تھی۔ تبھی وہ اس سے الگ ہوئی اور اندر کی جانب چلی گئی۔ میں خاموش تھا۔

"ٹھیک ہے سردار صاحب! کل پھر رپورٹ بنا کر میں بھجوا دوں گا کہ فریقین میں سمجھوتہ ہوگیا ہے۔ آپ کل آ کر دستخط کردیں۔"

"رپورٹ بنانے میں کونسا وقت لگتا ہے' آپ ابھی بنالیں۔ ابھی دستخط کردیتا ہوں۔" سردار شاہ دین نے خلوص سے کہا' تبھی ڈی ایس پی نے باہر سے ایک انسپکٹر کو بلوالیا اور اسے رپورٹ تیار کرنے کو کہا۔ ظاہر ہے کاغذ قلم تو مجھی سے مانگنا تھا' میں نے چھاکے کو اشارہ کیا وہ الماری میں سے کاغذ نکال لایا' اتنی دیر میں سوہنی اندر سے برآمد ہوئی اور کمرے میں آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں اسٹامپ پیپرز تھے۔ اس نے آتے ہی وہ اسٹام پیپرز ڈی ایس پی کو دے دیئے۔ پھر بولی۔

"آپ اسے دیکھیں اور پڑھیں' پھر میری نیت کا اندازہ لگائیں۔ یہ میں نے ایک ہفتہ قبل تیار کروائے ہیں۔ میں کچھ نہیں کہوں گی۔ آپ بابا کو بتا دیں' بابا خود پڑھ لیں۔"

ڈی ایس پی نے پہلے وہ دستاویز خود پڑھی' پھر سردار کو دے دی۔ جس میں تقریباً بیس منٹ صرف ہوگئے۔ چھاکا' کاغذات کا ایک دستہ لے کر آ گیا تھا جو اس نے انسپکٹر کو دے دیا۔

"سردار صاحب! یہ تو بڑا معقول مطالبہ ہے' یہ آپ سے شناخت مانگ رہی ہے' اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔" ڈی ایس پی نے کہا۔

"ہاں......! مجھے قبول کرنے میں کوئی انکار نہیں۔ میں ابھی دستخط کردیتا ہوں۔ بس شاہ زیب سے خوف آتا ہے کہ وہ اسے نقصان نہ پہنچائے۔ یہ چاہے لاہور میں رہے یا پھر کسی غیر ملک میں' میں ہر طرح اس کے ساتھ ہوں' روپے پیسے کی فکر نہ کرنا......"

سردار نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا۔ پھر دستاویزات پر دستخط کردیئے۔ کچھ دیر بعد انسپکٹر نے رپورٹ تیار کردی' گواہان میں فخرو اور چھاکا تھے۔ ڈی ایس پی اور میں نے بھی دستخط کیے' یوں بڑے اطمینان سے یہ مرحلہ سر ہوگیا۔ ڈی ایس پی خوش تھا کہ اس نے یہ معرکہ مار لیا ہے اور اس کی محنت رنگ لے آئی تھی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد جب اٹھنے لگے تو سردار نے اپنی جیب سے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور سوہنی کو دیتے ہوئے بولا۔

"یہ رکھ لو......تمہارے کام آئیں گے۔"

سوہنی نے بڑے آرام سے وہ گڈی پکڑی' اس میں سے آدھے نوٹ نکال کر انسپکٹر کی جانب بڑھا دیئے۔ "یہ باہر بیٹھے ان بے چاروں کے لیے ہیں' جو صبح سے......" یہ کہتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ڈی ایس پی چند لمحے سوچتا رہا' پھر اس نے نوٹ لے لینے کا اشارہ کردیا۔ پہلے سردار شاہ دین نکلا' پھر اس کے بعد پولیس والے چلے گئے۔ سوہنی بہت پہلے کاغذات لے کر اندر چلی گئی تھی۔ چھاکے نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ میں بھی مسکرا دیا تو وہ سمجھ گیا کہ میں کیا چاہتا ہوں' وہ باہر چلا گیا۔ میں نے دروازہ لگایا اور صحن میں نکل آیا' سوہنی اماں کے ساتھ لپٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ خوشی سے اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکی' مجھے لگا کہ وہ وارفتگی میں میرے گلے آ لگے گی' اس لیے بجائے ان کے قریب جانے کے چھت کی راہ لی۔

کھلی فضا میں گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے

میں خود پر قابو پا رہا تھا۔ یہ بڑی تاریخی رات ثابت ہو رہی تھی۔ سردار شاہ دین کی وہ تمکنت‘ وہ غرور اور حکمرانی کا خمار ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ بت پاش پاش ہو گیا جو خود کو منوانے کے لیے جبر کا ماحول بنائے ہوئے تھا۔ انسان آزاد پیدا ہوا ہے‘ اس پر حکمرانی کا حق صرف اور صرف اس کے تخلیق کرنے والے خالق کو حاصل ہے۔ جب خالق نے انسان کو اختیار دے دیا کہ وہ اس دنیا میں اپنی مرضی سے جیسے چاہے زندگی گزارے تو انسان کو انسان پر حکمرانی اور جبر کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے اور درست ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے‘ اللہ کی حکمرانی قائم کرنے کے لیے جبر کرنا اس لیے غلط ہے کہ اہمیت کردار کو حاصل ہے۔ اعلیٰ کردار اپنی روشنی سے پورے ماحول کو جگمگا دیتا ہے۔ جبر کا راستہ وہی اختیار کرتے ہیں جن کے کردار میں خامیاں ہوں‘ لالچ اور مفاد پرستی کا بسیرا ان کے من میں ہو‘ میں یہی سوچ رہا تھا کہ سیڑھیوں میں آہٹ سنائی دی۔ میں نے گھوم کر دیکھا‘ وہاں چھاکا تھا‘ اس نے اندھیرے میں مجھے دیکھ لیا تھا‘ اس لیے تیزی سے میری طرف بڑھا۔

”ہاں بولو‘ کیا صورت حال ہے؟“

”جس وقت سردار شاہ دین یہاں آیا ہے‘ اس وقت دونوں باپ بیٹا میں بڑی گرما گرم بحث ہوئی ہے‘ شاہ زیب ہر حال میں سوہنی کو قتل کر دینا چاہتا ہے‘ اس کا یہ خیال ہے کہ جب وہ ہی نہیں رہے گی تو اس کے ساتھ سارے ثبوت بھی ختم ہو جائیں گے‘ اگر کوئی انکوائری ہو گی‘ عدالتی معاملہ چلے گا تو یہ کوئی نئی بات نہیں‘ جب تک چلے گا بھگت لیں گے۔“

”اور سردار شاہ دین......؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ بڑا زیرک آدمی ہے‘ وہ اسے یہ سمجھانا چاہ رہا تھا کہ پھنکارتے ہوئے سانپ اور باؤلے کتے کو آزاد نہیں چھوڑنا چاہیے‘ وہ کسی لمحے بھی موت کا سبب بن سکتے ہیں۔ انہیں قابو میں کر کے جب چاہے انہیں ختم کر دیا جائے‘ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ سوہنی نے اس کے گرد جو حصار بنا دیا تھا‘ اسے فی الحال توڑنا بہت مشکل ہے۔ اگر توڑتے ہیں تو خود دنیا کے سامنے ننگے ہو جاتے ہیں۔“

”مطلب اس نے یہ سمجھوتہ بیٹی کی محبت میں نہیں‘ اپنے بچاؤ کے لیے کیا ہے۔“ میں نے پوچھا تو چھاکا بولا۔

”بالکل! ایک طرف پولیس چڑھ دوڑی تھی تو دوسری جانب پورے علاقے میں بات پھیل جانے کا خوف‘ تیسرا سوہنی کو ہمارا سہارا مل گیا‘ معاملہ سانپ کے منہ میں چھچھوندر والا بن گیا۔ انہیں وہی کرنا پڑا‘ جو سوہنی چاہتی تھی۔“

”ٹھیک ہے‘ اب شاہ زیب کہاں ہے؟“ میں نے اپنے اندر ابلتے ہوئے لاوے کو قابو میں کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ تو شام ہی سے ڈیرے پر ہے۔ اس نے بندے جو بلوائے ہوئے ہیں۔ اس کے ارادے خطرناک لگتے ہیں مجھے......“ چھاکے نے تشویش بھرے لہجے میں کہا تو میں نے آہستگی سے کہا۔

”چھاکے...... بہت عرصے بعد آج کی رات آئی ہے۔ میں جو کچھ آج کرنے جا رہا ہوں‘ اس کا میں نے بہت انتظار کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تو میرے لیے موت کے منہ میں بھی چھلانگ لگا دے گا‘ اس لیے میں......“ میں نے کہنا چاہا مگر اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا اول فول بک رہا ہے تو...... جو کرنا ہے بتا۔“

”چل ٹھہر پھر......“ میں نے اسے کہا اور چھت پر بنے کمرے میں چلا گیا۔ پسٹل تو میرے پاس تھا ہی‘ میں نے وہاں سے کچھ میگزین لیے‘ تیز دھار خنجر اٹھایا اور اسے اپنی پنڈلی سے بیلٹ کے ساتھ باندھ

لیا۔ دو پسٹل مزید اٹھائے جن کی شاندار کارکردگی تھی۔ لے کر میں کمرے سے باہر آیا۔ تالا لگایا اور دونوں پسٹل اور میگزین چھاکے کو تھما دیئے۔ اس نے خاموشی سے وہ پکڑے اور آنکھوں کے اشارے سے پوچھا‘ تو میں نے جواب دیا۔ ”چل بائیک لا‘ پھر نکلیں۔“

ہم دونوں ہی آگے پیچھے چھت پر سے نیچے آ گئے۔ اماں اور سوہنی ابھی تک صحن میں تھیں۔ مضطرب سی سوہنی نے میری طرف دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے بہت کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن یہ وقت نہیں تھا۔ میں اسے نظر انداز کرتا ہوا چھاکے کے پیچھے باہر گلی میں آ گیا۔ وہ بائیک اسٹارٹ کر چکا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی وہ چل پڑا۔ چوک پار کرتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا۔

”جانا کدھر ہے......“

”نہر کنارے‘ حویلی کے پچھواڑے...... فصلوں کے درمیان جو راستہ ہے‘ وہاں تک چل......“ میں نے اسے جگہ بتائی تو اس نے کچھ مزید پوچھے بغیر بائیک کی رفتار تیز کر دی۔

اندھیری رات میں پہلا پہر ختم ہو چکا تھا‘ گاؤں میں یہ وقت بڑا پرسکون ہوتا ہے‘ پکی سڑک پر کوئی ذی روح نہیں تھا۔ البتہ چوک میں بیٹھے ہوئے کچھ لوگوں نے ہمیں دیکھا تھا۔ پکی سڑک پر فرلانگ بھر آگے جانے کے بعد وہ راستہ نکلتا تھا جو نہر کنارے جاتا تھا۔ چھاکے نے بائیں جانب اس کچے راستے پر بائیک موڑ لی‘ تب میں نے چھاکے کو آہستہ رفتار سے چلنے کو کہا۔ حویلی کے پچھواڑے پہنچ کر میں نے اسے رکنے کو کہا تو وہ رک گیا۔ میں بائیک سے نیچے اتر آیا تو اس نے سوالیہ انداز میں سرگوشی میں پوچھا۔

”یہاں کیوں...... ابھی تو نہر......“

تب میں نے بڑے پرسکون انداز میں جواب دیا۔

”چھاکے...... میں سردار شاہ دین کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔ تم نے میرا یہاں انتظار کرنا ہے‘ بائیک کو نہر کنارے لے جا کر چھپا دے‘ تا کہ بعد میں ہمارا ”کھرا“ انہیں نہ ملے...... واپس اس جگہ آ جانا...... واپس آ کر بائیک لے لیں گے‘ اگر میں دو تین گھنٹے میں نہ آیا تو تم واپس پلٹ جانا...... حویلی میں آنے کی حماقت نہ کرنا‘ پھر صبح ہی میرا پتا کرنا۔“

”یار تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا‘ کچھ اور بندوبست کرتے...... کہیں دوسری جگہ......“

”بحث نہیں...... جو کہا ہے وہ کرو۔“ میں نے سختی سے کہا اور فصل کے کنارے کھال کی منڈیر پر چل پڑا۔ مجھے یقین تھا کہ جب تک میں نگاہوں سے اوجھل نہ ہوا‘ وہ وہیں کھڑا رہے گا۔ میں اندھیرے میں بڑے محتاط انداز سے چلتا چلا گیا۔ اس وقت میں پرسکون ہو گیا جب میں نے محسوس کیا کہ چھاکا بائیک لے کر نہر کنارے چلا گیا ہے۔

حویلی کے پچھواڑے کی چار دیواری میرے سامنے تھی۔ بچپن سے میں اس حویلی کو دیکھتا آیا تھا اور ہمیشہ میں نے یہی سوچا تھا کہ جب کبھی بھی مجھے اس حویلی میں داخل ہونا پڑے تو میں خاموشی سے کیسے داخل ہو سکتا ہوں۔ میں نے ان گنت مرتبہ اس حویلی کا جائزہ لیا تھا اور محفوظ سے محفوظ راستہ تلاش کر کے نجانے کتنی بار خیالوں ہی خیالوں میں اس حویلی کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ بچپن سے ایک ایک امکان میرے ذہن میں تھا اور اس کے ہزاروں حل بھی میں سوچ چکا تھا۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہی یہی تھی کہ محفوظ طریقے سے اس حویلی میں داخل ہو کر باہر نکل آؤں۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ملازمین کے کوارٹر اسی طرف ہیں اور ایک لوہے کا دروازہ اس چار دیواری میں نصب تھا جو ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ ایک گیٹ نما دروازہ آخری سرے پر تھا‘ جو اس وقت کھولا جاتا تھا جب سرداروں نے ڈیرے

پرائیمر جنسی میں جانا ہوتا تھا۔ ملک سجاد اسی گیٹ سے نکلا تھا۔ مجھے دیوار پھاندنے کی ضرورت نہیں تھی' میں لوہے کے اس دروازے سے باآسانی اندر جاسکتا تھا جو ملازمین کی گزرگاہ تھی۔ اس میں سب سے بڑا رسک یہی تھا کہ ملازمین کی نگاہ مجھ پر پڑ سکتی تھی' ان کی نظروں سے بچنا محال تھا۔ کیونکہ وہ حویلی کے اس طرف کھلے میں پھرتے رہتے تھے اور اس میں سو بھی جاتے تھے۔ میں دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔ اندر کی طرف اندھیرا تھا۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا' چند لمحے اندر کا جائزہ لیا اور اندر کی طرف چلا گیا۔ وہاں کوارٹروں سے آنے والی دھیمی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں وہیں دیوار کی جڑ میں بیٹھ گیا۔ میں چند منٹ دم سادھے وہیں بیٹھا رہا۔ رات کے اس پہر ملازمین کے کوارٹروں میں خاموشی تھی۔ دو چار لوگ باہر چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے' میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ سوئے ہوئے ہیں یا جاگ رہے ہیں۔ مجھے وہیں بیٹھ کر یہی یقین کرنا تھا۔ میں تقریباً پندرہ منٹ وہیں اسی مقصد کے لیے بیٹھا رہا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ وہ بے خبر سو رہے ہیں تو میں اٹھا اور ان کے قریب سے ہوتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

وہاں سے رہائشی عمارت تقریباً دو ایکڑ پر تھی۔ درمیان میں ایک طرف لان اور دوسری طرف سوئمنگ پول تھا۔ جس میں اس وقت پانی نہیں تھا۔ میں تیزی سے چلتا ہوا رہائشی عمارت کی پچھلی طرف آ گیا۔ یہاں بھی ایک داخلی دروازہ تھا' جو میری معلومات کے مطابق اکثر بند رہتا تھا۔ میں وہ دروازہ کھول نہیں سکتا تھا لیکن اس پر بنے ہوئے آرائشی شیڈ میرے کام آسکتے تھے۔ سردار شاہ دین کی خواب گاہ اوپر والے پورشن میں تھی۔ میں ان شیڈز کے سہارے چڑھ کر اوپر بالکونی میں جاسکتا تھا۔ پھر ایک راہداری کے بعد سردار کی خواب گاہ تھی۔ اصل خطرہ اوپر ہی تھا۔ وہاں سیکورٹی گارڈ موجود رہتے تھے۔ میں نے اپنی ساری ہمت جمع کی اور شیڈ میں انگلیاں جمادیں' پھر اپنا وزن اٹھائے ہوئے میں اوپر چڑھنے لگا۔ تقریباً دو منٹ بعد میرے ہاتھ بالکونی تک پہنچ گئے' میں نے اپنا سر اٹھایا اور کسی ممکنہ خطرے کو دیکھا' سامنے کی راہداری خالی تھی۔ میں چشم زدن میں بالکونی میں تھا اور اپنے حواس بحال کرنے کے ساتھ ساتھ سانسیں بھی درست کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد میری سانسیں بحال ہوگئیں۔ میں اٹھا اور دبے پاؤں آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہاں کوئی ذی روح نہیں تھا' مجھے حیرت ہونے لگی کہ وہاں کوئی سیکیورٹی گارڈ کیوں نہیں ہے؟ کیا سردار اس وقت حویلی میں نہیں؟ کیا میری محنت ضائع چلی گئی' میں ایک دم سے پریشان ہوگیا۔

میں نے اگلے چند لمحوں میں خود پر قابو پایا اور مایوسی کو جھٹک دیا۔ راہداری میں اندھیرا تھا لیکن باہر سے چھن کر آتی ہوئی روشنی میں لوہے کی گرل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ سردار شاہ دین کی خواب گاہ کس طرف ہے۔ میں اس راہداری میں آ گیا' جہاں ایک طرف کمرے بنے ہوئے تھے اور دوسری طرف لوہے کی گرل سے نیچے صحن صاف دکھائی دے رہا تھا۔ صحن میں کوئی نہیں تھا اور راہداری بھی خالی تھی۔ میں حیران تھا کہ ایسا سناٹا کیوں ہے۔ حویلی کے ملازمین کہاں چلے گئے۔ میں سب سے زیادہ سیکورٹی والوں سے محتاط تھا جو ابھی تک مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ مجھے دائیں جانب مڑنا تھا' جہاں سردار کی خواب گاہ تھی۔ میں نے بڑے محتاط انداز میں سامنے دیکھا' ویران اور خالی راہداری میں ایک بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی تھی' جس سے لوہے کی گرل دکھائی دے رہی تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور دیوار پر لگے ہوئے بورڈ کے تمام سوئچ آف کردیئے

جس سے بلب بجھ گیا تو اندھیرا چھا گیا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر خواب گاہ کا دروازہ تھا' میں نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ دیا' وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ایک لمبی سانس لی اور دروازے پر دستک دے دی۔ چند لمحوں بعد سردار کے کھنکارنے کی آواز آئی پھر دھیرے سے پوچھا۔

"کون ہے بھئی؟"

"جی' میں چھینہ......" میں نے آواز بدل کر ہلکے سے کہا۔ چھینہ اس کا باڈی گارڈ تھا اور ہمہ وقت حویلی ہی میں رہتا تھا' میں نے بچپن سے ان گنت مرتبہ اس کی آواز سنی تھی۔ مجھے لگا کہ میں نے اس کی آواز کی کاپی ٹھیک کرلی ہے۔ اگلے چند لمحوں میں دروازہ کھل گیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی سردار کی بھویں تن گئیں۔ جب تک وہ کچھ سمجھتا یا کچھ کہتا' میں نے دروازے میں اپنا پاؤں اڑس دیا' پھر پوری قوت سے دروازے کا پٹ اندر کی جانب دھکیل دیا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے سردار کو دھکا دیا' وہ لڑکھڑاتا چلا گیا' وہ کھسیائے ہوئے انداز میں بولا۔

"تم پاگل ہوگئے ہو...... کیا ہوا تمہیں......"

"آرام سے اپنے بستر پر جا کر لیٹ جاؤ' میں نے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ میرے خیال میں تجھے میری بات سمجھ میں آ گئی ہوگی......" میں نے سرد لہجے میں کہا تو اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا' پھر مڑ گیا۔ میں نے دروازے کا لاک لگایا اور اس کے بستر پر چلا گیا۔ جہاں وہ سکون سے لیٹ گیا تھا۔

"بولو......! کیا کہنا ہے تمہیں......؟" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا تو میں نے بڑے سکون سے کہا۔

"یاد کرو سردار' اس وقت کو یاد کرو جب تو نے جوانی کے خمار میں میرے باپ کو قتل کردیا تھا۔"

"وہ......وہ ایک حادثہ تھا۔" اس نے لرزتے ہوئے کہا۔

"نہیں' وہ حادثہ نہیں تھا' تم نے جان بوجھ کر میرے باپ کو قتل کیا تھا' اب تم سمجھ گئے ہوگے کہ میں تم سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہوں۔"

"جمال...... پتر...... تمہیں غلط فہمی ہوگئی ہے' سارا گاؤں جانتا ہے کہ وہ ایک حادثہ تھا' اللہ بخشے تیرا باپ بڑا پکا نشانے باز اور بہترین شکاری تھا۔ میرا تو وہ بڑا اچھا دوست تھا۔ ہم نے جوانی کا بڑا حصہ ساتھ میں شکار کھیلتے ہوئے گزارا ہے' اور میرے باپ نے تیرے باپ کو یہ زمین دی تھی۔ تمہیں بہکا دیا ہے کسی نے......" اس نے نرم لہجے میں سمجھایا۔

"نہیں سردار نہیں...... تم جھوٹ بولتے ہو...... یہ زمین میرے باپ نے اس وقت بنائی تھی جب یہ کسی کی نہیں تھی' خود الاٹ کروائی تھی حکومت سے' یہ احسان نہ جتا' میں مانتا ہوں کہ میرا باپ بہت اچھا شکاری تھا' نشانہ بازی مجھے ورثے میں ملی' یہ سچ ہے تم دونوں نے بہت شکار کیا' لیکن وہ تیرے جیسا بے غیرت نہیں تھا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو......" وہ تیزی سے بولا۔

"بچپن سے...... میں نے اس تحقیق میں وقت گزارا ہے سردار...... جس وقت میری ماں اس گاؤں میں بیاہ کر آئی' تو نے اپنی نیت بری کرلی' میرے باپ کے ہوتے ہوئے تو کچھ نہیں کرسکتا تھا' تو نے میرے باپ کو گولی ماردی' بہانہ یہ کردیا کہ گولی بھول سے لگ گئی ساری دنیا جھوٹ بول سکتی ہے' لیکن میری ماں جھوٹ نہیں بول سکتی۔"

"تم...... غلط۔"

"خاموش بے غیرت......" میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ "تم نے میری ماں کو مجبور کرنا شروع کردیا...... تاکہ وہ تیری بات مان لے...... میں اس

وقت پیدا ہونے والا تھا' تو نے بڑا انتظار کیا' لیکن میری ماں نے صبر سے کام لیا...... وہ نہ صرف تیرے ظلم سہتی رہی' بلکہ صبر سے آج کے وقت کا انتظار کرتی رہی...... کیا اس کی صرف یہی سزا تھی کہ وہ ایک مجبور' بیوہ اور غریب عورت تھی۔"

"میں اب تجھے کیا کہوں......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی' پھر بولا۔

"دیکھ قدرت کے کھیل کتنے نرالے ہیں' تو نے میری ماں کے بارے میں اپنی نیت خراب کی تھی' اس پر ظلم کیے' اسے مجبور کرتے رہے...... اب تیری بیٹی' میرے گھر میں ہے میں اس کے ساتھ جو مرضی کروں' تو مجھے نہیں روک سکتا...... روک سکتا ہے......؟"

"دیکھ جمال' وہ میری جوانی کی بھول تھی' میں بہک گیا تھا' تو مجھے معاف کر دے اور سوہنی کو یہاں سے جانے دے...... میں تیرے پاؤں پڑتا ہوں۔" سردار نے منت بھرے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"یہ تو قدرت کا کھیل تھا' ورنہ میں تجھے ویسے ہی قتل کرنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا تو اس نے حسرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر بولا۔

"تو مجھے مار دے...... مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا' لیکن وعدہ کر' میری بیٹی کو خراب نہیں کرے گا' اسے یہاں سے دور بھیج دے گا......"

"میں نے کچھ نہیں کرنا سردار...... اب جو کچھ کرنا ہے' تیرے شاہ زیب ہی نے کرنا ہے' میں بڑے صبر سے اسے برداشت کرتا چلا آ رہا ہوں' صرف اسی دن کے لیے...... ساری زندگی تیرے بچے' کتوں کی طرح جائیداد پر لڑیں گے' چاہیے تو یہ تھا کہ تو زندہ رہتا اور یہ تماشا خود اپنی آنکھوں سے دیکھتا' لیکن میرا وعدہ ہے کہ تو نے میرے ہاتھوں مرنا ہے۔" میں نے بڑے سکون سے کہا تو اس نے غیر محسوس انداز میں اپنا ہاتھ سرہانے کی طرف بڑھایا' جسے میں نے محسوس تو کر لیا' مگر کچھ نہ کہا' میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کرنا کیا چاہتا ہے' اگلے ہی لمحے اس نے اپنے سرہانے کے تلے سے پسٹل نکال لیا' میں ہنس دیا' اور پھر ایک جھٹکے سے ہاتھ مارا تو اس کا پسٹل دور جا گرا۔

"یوں اکیلے کو مارنا......"

"بکواس بند کر...... تو نے جو ظلم کیے ہیں' انہیں یاد کر اور مرنے کے لیے تیار ہو جا......" میں نے کہا ہی تھا کہ اس نے شور مچانے کے لیے منہ کھولا' میں نے پوری قوت سے ایک گھونسہ اس کے منہ پر دے مارا' پھر چشم زدن میں پنڈلی کے ساتھ بندھا خنجر نکال لیا۔ وہ دہشت زدہ ہو گیا۔ پھر میں نے اسے مزید وقت نہیں دیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے اس کے گلے پر خنجر پھیر دیا۔ خون کی تیز دھار نکلی' میں بچتا ہوا اٹھ گیا' وہ اپنے بستر پر خرخراتے ہوئے تڑپنے لگا۔

میں بڑے سکون کے ساتھ اس کا تڑپنا دیکھتا رہا۔ میری ماں کی آہوں' سسکیوں اور آنسوؤں سے جو زخم میرے دل پر لگے ہوئے تھے' ان پر مرہم لگتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اپنی آخری سانسوں پر تھا۔ میں اسے مرتا ہوا دیکھتا رہا' یہاں تک کہ اس نے ہچکی لی' اور ساکت ہو گیا۔ اب میرے لیے وہاں ٹھہرنا فضول تھا' میں نے خنجر کو پنڈلی کی بلٹ میں اڑسا' پسٹل نکالا اور باہر کی طرف لپکا۔ میں نے پوری احتیاط سے دروازہ کھولا' پھر راہداری میں جھانکا' وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں جس راستے سے آیا تھا' اسی طرح واپس پلٹنے لگا۔ بالکنی سے اتر کر میں بھاگتے ہوئے ملازمین کے کوارٹرز تک گیا۔ وہ اسی طرح سکون اور مزے سے سو رہے تھے۔ میں نے لوہے والے دروازے کو کھولا اور حویلی سے باہر آ گیا۔

باہر گھپ اندھیرا تھا۔ مجھے احساس نہیں تھا کہ میں نے حویلی میں کتنا وقت گزارا تھا' مجھے یقین تھا کہ

مقام ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر ہمارے نبی کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی دنیا کو ہدایت دینے کے لیے آیا۔ ان پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوئی' فرشتہ آیا' کشف ہوا اور خواب میں بھی وحی اتری۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہر پیش گوئی کو سچا کیا اور انہیں ہر مقام پر سچا کہا گیا۔

نبی کی بات اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ جس طرح اللہ کا وجود باقی ہے اور اس میں کوئی جھوٹ نہیں، اسی طرح اللہ کے نمائندے نبی و رسول کی بات بھی سچ اور حق ہے۔ اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تعارف کراتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

ترجمہ: "ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لیے مہربانی کا نمونہ بنا کر بھیجا ہے۔" (انبیاء)

جس شخص نے دنیا کی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان کا تعلق قائم کر لیا' وہ دنیا میں ہی اس پاکیزہ تعلق کی برکات محسوس کرے گا اور مرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض اس کو قبر اور حشر میں جہنم سے محفوظ کر کے جنت میں لے جائے گا۔ معراج اس کا نام نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو آسمانوں پر لے گیا اور واپس لے آیا۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ میرے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تو جلوہ افروز ہیں ہی اور انسان ان کے نورِ ہدایت سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ لیکن فرشتے بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ ان کو جلوہ آسمان پر ہی دکھانا تھا۔ پہلے آسمان کے دروازے سے لے کر ساتویں آسمان تک اور پھر عرش معلیٰ تک جتنے فرشتے ہیں، ان سب کو بتانا تھا کہ جس انسان کے پاس تمہارے سردار جبریل امین کو بھیجتا ہوں' اب وہ آئیں گے۔ دیکھنا میں نے ان کا درجہ کتنا بلند کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس جہاں کو متاثر کیا جو انسانوں اور فرشتوں کی تحقیق اور پہنچ سے باہر ہے۔

کہتے ہیں نور کی ایک گاڑی "رَف رَف" لائی گئی۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بٹھایا گیا۔ جبریل پیچھے رہ گئے تو پوچھا۔ "آپ ساتھ کیوں نہیں چلتے؟" کہنے لگے "میرے پر جل جائیں گے' آگے نہیں جا سکتا' مجھے یہیں تک آنے کا حکم تھا۔ اب آپ جانیں اور اللہ جانے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کو کہاں تک جانا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام فرشتوں کو اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جلوہ دکھایا اور مقام بتلایا کہ وہ ہیں تو بشر مگر درجہ یہ ہے کہ اب ان کے اور میرے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔ سب پیچھے رہ گئے اور حبیب میرے پاس آ گئے۔ ورفعنالک ذکرک

جانشین امیر شریعت مولانا سید ابوذر بخاری رحمتہ اللہ

(اقتباس خطاب: فیصل آباد: ۱۹۸۷ء)

چھاکا وہیں کہیں ہوگا' میں تیزی سے فصلوں کے درمیان سے ہوتا ہوا کچی سڑک تک گیا' جہاں سامنے ہی چھاکا کھال کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔

"ہوں......" اس نے سرگوشی میں ہنکارا بھرا' اس کا مطلب تھا کہ میں کیا کر کے آ رہا ہوں' تب میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

"مار دیا سردار کو...... اب چل نہر کنارے۔"

اس نے میری بات کا نہ کوئی جواب دیا اور نہ ہی کچھ تبصرہ کیا' وہ فوراً پلٹ گیا۔ ہم آگے پیچھے تیزی سے فصلوں کے درمیان چلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ نہر کنارے اس جگہ آ گئے جہاں چھاکے نے بائیک چھپائی ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے بائیک نکالی' اسٹارٹ کی' تب تک میں پیچھے بیٹھ گیا تھا۔ اس نے بائیک بڑھا دی۔ ہم نہر کنارے چلتے ہوئے نور نگر کا چکر کاٹ کر دوسری طرف سے گاؤں میں داخل ہو گئے۔ گاؤں میں سناٹا تھا۔

"میرا خیال ہے' تو گھر میں نہ سو' میری طرف آ جا۔" چھاکے نے صلاح دی۔

"نہیں' اس طرح شک ہو سکتا ہے' میں گھر ہی رہوں گا۔" میں نے کہا تو راستے میں چھاکے کا گھر آ جانے پر اسے اتارا' پھر میں اپنے گھر کی جانب بڑھ

گیا۔ اندھیرے گاؤں کی سنسان گلیاں پار کرتا ہوا' میں اپنے گھر کے دروازے پر جا پہنچا۔

گیٹ اماں ہی نے کھولا' میں بائیک لیتا ہوا صحن میں چلا گیا۔ بائیک کھڑی کر کے میں واپس پلٹا تو اماں کے ساتھ سوہنی دالان میں تھی۔ وہ دونوں ہی سوالیہ انداز میں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میرے کپڑوں پر جا بجا خون کے چھینٹے تھے۔ میں نے پنڈلی سے بندھے بلٹ میں سے خنجر نکالا جو اب بھی خون آلود تھا' وہ میں نے اپنے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ماں... ! یہ خون اس بے غیرت انسان کا ہے' جس سے بدلہ لینے کا سبق تو نے مجھے بچپن سے دیا تھا۔ مار دیا میں نے سردار شاہ دین کو......" یہ کہتے ہوئے میں نے اماں کے چہرے پر دیکھا' جہاں جیت کی خوشی کا خمار تھا' ماں کے چہرے پر خوشی کا وہ اظہار تھا جس میں کسی مقصد کی تکمیل کا عنصر ہوتا ہے۔ دنیا میں بہت کم لوگ ہیں جو اپنے مقصد کی تکمیل اپنی زندگی میں دیکھ پاتے ہیں اور اس خوشی کا سرور وہی جانتے ہیں' ایسا ہی کچھ اس وقت میری ماں کے چہرے پر تھا۔ اس لمحے میں نے سوہنی کے چہرے کی طرف دیکھا' وہ سرخ تھا' گال حد سے زیادہ سرخ تھے' آنکھیں بھیگی ہوئی اور لب بھینچے ہوئے' سردار شاہ دین کچھ بھی تھا اور کیسا ہی تھا' آخر اس کا باپ تھا۔ اس کا دکھ فطری تھا۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں کہہ پائی تھی۔ میں اس کے باپ کا قاتل اس کے سامنے قتل کا اقرار بھی کر رہا تھا۔ یہ بہت جذباتی لمحات تھے' میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکا' میرے ہاتھ میں خنجر یونہی پکڑا ہوا تھا۔ تبھی میری ماں نے ہولے سے کہا۔

"جا' اسے صاف کر کے' اپنا آپ بھی دھو لے' اس کا غلیظ خون تمہارے بدن پر نہیں ہونا چاہیے۔"

میں نے سنا اور سوہنی کی طرف دیکھے بغیر باتھ روم کی طرف چل دیا۔

میری ماں نے مجھے وہیں کپڑے دے دیئے اور پرانے کپڑے لے جا کر انہیں آگ لگا دی۔ یہ مجھے اس وقت پتا چلا جب میں باتھ روم سے باہر آیا۔ کپڑے جل چکے تھے۔ میں اندر نہیں گیا۔ مجھے سوہنی کے دکھ کا احساس تھا مگر میں اسے کوئی دلاسہ نہیں دے سکتا تھا' اس لیے میں اپنی جائے پناہ چھت پر چلا گیا۔ وہی میرے لیے سکون کا گوشہ تھا۔ میں نے سارے ہتھیار اپنی جگہ واپس رکھے' اپنا پسندیدہ پسٹل لیا اور چھت پر پڑی چارپائی پر آ لیٹا۔ اس وقت میں اپنے اندر اترتی ہوئی طمانیت کو محسوس کر رہا تھا۔

❋ ❋ .... ❋ .... ❋ ❋

اس وقت رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا۔ اسپتال میں خاموشی تھی۔ جسپال کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ ایک ٹک ہرپریت کے چہرے پر دیکھ رہا تھا' جو خواب آور دوائیوں کے زیر اثر محو خواب تھی۔ وہ جس وقت یہاں پہنچا تھا' اسے سی سی یو سے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ انوجیت نے نجی کمرہ میں ہرپریت کو رکھا اور اس کے جاگ جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ جسپال نے اسے جانے کے لیے کہا تاکہ وہ آرام کر لے' وہ اسے آرام کرنے کا مشورہ دیتا رہا' یوں کچھ بحث کے بعد جسپال اسے ریزورٹ میں بھیجنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ گاڑی لے کر نکل گیا' تب سے جسپال اسے دیکھتا جا رہا تھا اور اس کی سوچیں اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ وہ اس وقت تک بہت کچھ سوچ چکا تھا۔ اگرچہ اسے بھارت آئے بہت تھوڑے دن ہوئے تھے لیکن وہ یہ سمجھ چکا تھا کہ یہاں محض جنگل کا قانون چل رہا ہے۔ جس کی طاقت ہے' وہی اپنی من مانی کرتا ہے' پتا نہیں کب وینکوور میں ایک بحث کے دوران کسی بندے نے ایک بات کی تھی بھارت کے بارے میں' وہ اسے پوری سچائی کے ساتھ دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ بھارت پر الزام ہے کہ وہ

ایک سیکولر ملک ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہاں ہندو راج کر رہے ہیں۔ چند ہندو خاندانوں نے پورے ملک کے لوگوں کو یرغمال بنایا ہوا ہے اور مذہب کو وہ ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ہندو دھرم میں چونکہ طاقت کی پوجا کی جاتی ہے اس لیے وہ طاقت ہی کی عبادت کرتے ہیں اور اس کو مانتے بھی ہیں۔ اگر سامنے کمزور ہے تو ہندو پوری طاقت استعمال کر کے اسے کچل دینے میں ذرا برابر بھی نہیں ہچکچاتے' لیکن اگر سامنے سے کوئی طاقت ور آ جائے تو پھر کتے کی طرح دم دبا کر کونے میں لگ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہی ان کی حکومت کا فلسفہ ہے اور یہی ان کی خارجہ پالیسی کی بنیاد۔ وہ بھارت اور بھارتی معاشرے کو سمجھ گیا تھا۔ یہاں صرف کمزور کو دبایا جاتا ہے اور طاقت ور کے ساتھ وہ دوستی کا تعلق بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں لیکن ہندو اپنی فطری منافقت نہیں چھوڑ سکتے۔ ایسا ہوتا ہے کہ ہر قوم کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ یہ مزاج ماحول سے نہیں بنتا' بلکہ ان نظریات کی وجہ سے خود بخود بن جاتا ہے' جو وہ قوم رکھتی ہے۔ اب یہ ایک الگ بحث ہے کہ اس میں موروثی اثرات زیادہ شدید ہوتے ہیں کہ وہ اپنی نظریات کو اپنانے پر مجبور کر دیتے ہیں' یا نظریات آئندہ آنے والی نسلوں کی وراثتی حیثیت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ انہی خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ ہرپریت کے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ چونک گیا اور فوراً ہی اس کے قریب چلا گیا۔ ہرپریت ہوش میں آ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ لمس کا احساس پا کر ہرپریت نے آنکھیں کھولیں اور مسکرانے کی موہوم سی کوشش کی جس پر جسپال کے من میں پیار بھری لہر سرائیت کر گئی اور بے حد جذباتی ہو گیا' تبھی اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیسی ہو؟"

اس پر اس نے بولنے کی کوشش کی پر ناکام ہو گئی' اس کے لب ہی لرزے تھے' باقی بات آنکھوں سے کہہ دی اور وہ تڑپ کر رہ گیا۔

"پریتی...... یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا' میں اس پر شرمندہ ہوں' تم ...... موت......" اس نے کہنا چاہا تو ہرپریت نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا لیا اور آنکھوں میں یہی تاثر تھا کہ وہ ایسی بات نہ کہے۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں میری بات اچھی نہیں لگ رہی ہے لیکن یہی حقیقت ہے پریتی...... تم بس جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ' مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ کس نے ہم پر حملہ کروایا ہے اور اس کے پیچھے کون ہے؟ میں انہیں چھوڑوں گا نہیں......"

اس کے یوں کہنے پر ہرپریت کی آنکھوں میں تجسس اتر آیا۔ وہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ وہ کون ہے جسپال اسے بتاتا رہا کہ وہ کون ہے' وہ پوری روداد سنتی رہی' یوں جسپال ہی باتیں کرتا رہا اور وہ سنتی رہی۔ اس دوران نرس آ گئی' اس نے چارٹ پر لکھی ہوئی ہدایت کے مطابق اسے انجکشن دیا' میڈیسن دی اور پلٹ گئی' ہرپریت دوبارہ سو گئی' لیکن جسپال کی آنکھوں میں سے نیند اڑ گئی تھی۔

صبح کی روشنی پھیلنے کے ساتھ ہی ہسپتال میں گہما گہمی شروع ہو گئی تھی۔ انوجیت واپس آ گیا تھا۔

"تم ایسا کرو جسپال...... تم ریزورٹ چلے جاؤ اور جا کر آرام کرو' یا پھر واپس اوگی پنڈ چلے جاؤ۔ اور بے بے کو بھیج دو' ان کا ہرپریت کے پاس ہونا ضروری ہے۔"

"جیسے تم کہو انوجیت' لیکن میرا یہاں رہنا زیادہ ٹھیک رہے گا۔ اگر بے بے آ جائے تو آسانی رہے گی' اوگی میں تمہارا ہونا زیادہ ضروری ہے۔" اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے میں ابھی نکلتا ہوں۔ دوپہر تک بے بے کو یہاں لے آؤں گا یا پھر کسی کے ساتھ انہیں بھیج دوں گا۔" اس نے سوچنے والے انداز میں کہا۔ وہ سمجھ گیا

تھا کہ اس کا اوگی میں ہونا زیادہ ضروری ہے۔ وہ کچھ دیر بعد بیٹھ کر چلا گیا تو جسپال ڈاکٹر کے کمرے میں جا پہنچا۔ کچھ دیر یونہی باتوں کے بعد اس نے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب......! اندازاً ہرپریت کو ٹھیک ہونے میں کتنا وقت لگے گا؟"

"میرے خیال میں تین ہفتے تو لگ جائیں گے زخم بھرنے تک...... وہ نوجوان ہے اور کوئی ایسی بیماری وغیرہ والا مسئلہ بھی نہیں۔" ڈاکٹر نے بتایا۔

"یہاں سے کب ڈسچارج ہو پائے گی۔" اس نے پوچھا۔

"یہی کوئی آٹھ سے دس دن تک...... کم از کم ایک ہفتہ......" اس نے بتایا۔

"اوکے ڈاکٹر...... میں یہی چاہ رہا تھا کہ مجھے پتا چل جائے آخر ہمیں یہاں کتنے دن رہنا ہے۔" جسپال نے بے دھیانی میں کہا اور پھر اس سے اجازت لے کر اٹھ گیا۔ وہ تیزی سے سوچ رہا تھا کہ یہ ہفتہ اسے جالندھر میں کیسے گزارنا ہے۔ وہ بے تاب تھا کہ وہ جلد از جلد اوگی پنڈ واپس چلا جائے اور رن ویر کو چھیڑے بغیر وہ بلجیت سنگھ کو اپنا نشانہ بنائے۔ کیونکہ رن ویر یہی چاہتا تھا کہ جسپال اس پر کھل جائے اور وہ اپنی تفتیش کے ڈانڈے اس کی ذات کے ساتھ باندھ دے...... وہ اپنے شک کو یقین میں بدلنا چاہتے تھے اور اس راستے سے جسپال کو بچنا تھا۔ اس نے اپنا سیل فون نکالا اور کیشو مہرہ کو فون کر دیا۔ چند لمحوں بعد اس نے فون ریسیو کر لیا، تب اس نے ڈاکٹر کی معلومات اسے دے دیں۔

"تم ایسے کرو جسپال، میں اسپتال ہی کے نزدیک گیتا کالونی ہی میں تمہارے رہنے کا بندوبست کر دیتا ہوں ہوٹل وغیرہ میں تم محفوظ نہیں ہو گے۔ تم ریزورٹ سے اپنا سامان لے کر وہاں آ جانا، میں تمہیں کچھ دیر بعد کال کرتا ہوں۔"

"اوکے......!" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور پھر ہرپریت کے پاس چلا گیا۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ وہ ایک طرف کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے اندر بھونچال اٹھا ہوا تھا۔ دشمنوں نے اسے کم از کم ایک ہفتے تک کے لیے اسپتال تک محدود کر دیا تھا۔ تبھی اچانک اس کے ذہن میں یہ خیال آیا۔ اگر ہائی وے ہوٹل اس کے لیے محفوظ نہیں ہے تو کیا یہ اسپتال اس کے لیے محفوظ ہو سکتا ہے؟ اس خیال نے اسے مزید مضطرب کر دیا، وہ جس قدر اس خیال پر سوچتا چلا جا رہا تھا، بہت سارے پہلو اس کے ذہن میں آتے چلے گئے۔ اس نے جلدی سے فون کال انوجیت کو ملائی، وہ ابھی جالندھر شہر سے نکلا ہی تھا۔

"خیریت تو ہے نا جسپال......" اس نے پوچھا تو جسپال نے اپنا خیال اسے بتایا۔

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو، خیر......! میں کچھ دیر بعد تمہیں فون کرتا ہوں......" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ جسپال نے کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

اس وقت وہ نجانے سوچ کی کس راہ پر نکلنے والا تھا، اس کے سامنے آنکھیں موندے ہرپریت پڑی تھی، جس کے لیے اس کے دل میں نجانے کس قدر پیار اُمڈ رہا تھا۔ اس کے ساتھ بتائے وقت کی بازگشت اسے جذباتی کرتی چلی جا رہی تھی۔ تبھی دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی، پھر اس کے ساتھ ہی انسپکٹر اندر آ گیا، جسپال نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولا۔

"اوئے انسپکٹر......! یہ تیری پولیس چوکی نہیں ہے جو تو بلا اجازت اندر آ گیا ہے، چل باہر نکل۔"

"میں تم سے بات کرنے آیا ہوں......" اس نے کافی حد تک دھیمے لہجے میں کہا تو جسپال نے اٹھ کر سرد سے لہجے میں کہا۔

"تجھے کہا ہے نہ نکل جا، تو بس نکل جا......"

"دیکھ میں تجھ سے بات کرنے آیا ہوں۔" اس نے غراتے ہوئے کہا تو جسپال نے پوری قوت سے تھپڑ اس کے منہ پر مار دیا۔ انسپکٹر کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اس لیے لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے جا لگا۔ جسپال نے اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا اور دوسرا تھپڑ مار دیا پھر بازو سے پکڑ کر باہر راہداری میں نکال لیا۔ باہر دو پولیس والے کھڑے ہوئے تھے، انہوں نے اپنے انسپکٹر کا حشر دیکھا تو چھڑانے کے لیے لپکے۔ تبھی اردگرد شور مچ گیا کہ پولیس والے ایک بندے کو مار رہے ہیں۔ وہ ایک نجی اسپتال تھا اور وہاں پر سیکورٹی والے بھی تھے۔ وہ سبھی تقریباً ایک سے ڈیڑھ دو منٹ تک آپس میں بھڑتے رہے۔ جسپال نے اگر دو ماریں تو انہوں نے چار ماردیں، تب تک سیکورٹی والے آن دھمکے، انہوں نے الگ الگ کرتے ہوئے جسپال کو ایک طرف کیا، تبھی ان کے بڑے نے پوچھا۔

"یہ ہنگامہ کیوں ہے؟"

"میں اس سے بات کرنے آیا تھا اور یہ میرے گلے پڑ گیا...... اسے نہیں معلوم کہ وردی کیا ہوتی ہے...... میں اب تجھے بتاتا ہوں......" انسپکٹر نے انتہائی غصے میں کہا۔

"اوئے بے غیرت سچ بتا، تو مجھ سے رشوت مانگنے آیا تھا، ورنہ سخت کارروائی سے ڈرا رہا تھا، یہ چھوڑو...... مجھے اسپتال کے ہیڈ سے ملواؤ، میں پوچھوں، یہ ہمارے کمرے میں اجازت کے بغیر کیسے آیا، چلو اس کے پاس چلو......" جسپال نے تیزی سے مگر اونچی آواز میں کہا۔

"انسپکٹر...... کیا آپ نے اجازت لی تھی؟" سیکورٹی گارڈ نے پوچھا۔

"ہمیں کیا اجازت لینے کی ضرورت ہے اوئے۔" انسپکٹر نے بھنا کر کہا۔

"تو چلو، پھر ہیڈ کے پاس...... وہی آپ کا فیصلہ کرتے ہیں۔" سیکورٹی گارڈ نے کہا۔

"تو ہمیں روک کے دکھا......" انسپکٹر نے غصے میں کہا تو جسپال نے ایک تھپڑ مزید جڑ دیا اور چیخ کر بولا۔

"میں روکوں گا تمہیں، تو یہاں سے جا کر دکھا۔"

اس چیخ و پکار میں لوگوں کا رش بڑھنے لگا تھا۔ تبھی اسپتال کا ہیڈ اور مالک بھاگتا ہوا، وہاں آ گیا۔ وہ موٹی توند والا شخص تھا، جس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔

"کیا بات ہو گئی......؟"

سیکورٹی گارڈ نے اپنی طرف سے تفصیل بتائی تو جسپال نے کہا۔

"یہ کیسا قانون ہے یہاں پر، گولی بھی ہم پر چلی اور یہ دھمکیاں بھی ہمیں لگا رہا ہے۔ اور آپ، کیا یہاں سیکورٹی ایسی ہی ہے، جو چاہے، جس وقت چاہے کسی کا آ کر گریبان پکڑ لے، کیا یہ آپ کی اجازت سے ہمارے کمرے میں گھسا ہے۔"

"میں اس کے پاس آیا تھا کہ زخمی کا بیان لے لوں۔" انسپکٹر نے حالات اور ماحول کو سمجھتے ہوئے کافی حد تک تحمل سے کہا تو ہیڈ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"تو آپ کو پہلے ہم سے اجازت لینی چاہیے تھی۔ ہم سے پوچھنا چاہیے تھا کہ مریض اس حالت میں ہے کہ وہ بیان دے بھی سکتا ہے یا نہیں، یہ تو کوئی طریقہ نہیں۔"

"میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا......" انسپکٹر نے کہا تو جسپال بولا۔

"اسے اپنے کمرے میں بٹھائیں اور میڈیا کو یہاں بلوائیں، اس کے سامنے اس کا چہرہ ننگا کریں...... کل سے اس کو حملہ آور پکڑ کر دیا ہے، اس کا اس نے کچھ نہیں کیا اور بیان لینے یہاں آ پہنچا

ہے۔‘‘ یہ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ اسے کیشو مہرہ کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ کچھ لوگ بھی تھے۔ اس نے آتے ہی صورت حال کے بارے میں آگاہی لی اور ہیڈ کو اپنا تعارف کرا کر بولا۔

’’یہ اب آپ کی ذمہ داری ہے‘ کہ آپ اس انسپکٹر کے خلاف کیس بنوائیں‘ اسے اپنے کمرے تک محدود رکھیں‘ میں ابھی میڈیا والوں کو بلاتا ہوں......‘‘ یہ کہہ کر اس نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر پش کرنے لگا۔ تبھی ہیڈ کی جان پر بن گئی۔ ظاہر ہے معاملہ میڈیا میں گیا تو اس کے اسپتال کے بارے میں بھی غلط تاثر جانے والا تھا۔ وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔

’’آپ...... ذرا ٹھہریں...... ہم آفس میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں...... آیئے......‘‘ یہ کہتے ہوئے اس نے میرا بازو پکڑا اور اپنے آفس کی جانب چل پڑا۔

انسپکٹر حالات کی نزاکت کو بھانپ گیا تھا۔ ممکن ہے آفس میں سکون سے بیٹھنے تک عقل آ گئی ہو۔ اس نے سب کے بیٹھتے ہی معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

’’بلاشبہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے‘ مجھے آپ سے اجازت لے کر ان کے کمرے میں جانا چاہیے تھا۔ میں اس پر معذرت خواہ ہوں۔‘‘

’’وہ تو ٹھیک ہے تم آئے کس لیے تھے؟‘‘ جسپال نے غصے میں پوچھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنا سارا غصہ اس پر اتار دے۔

’’دیکھیں...... آپ کو غلط فہمی ہوگئی ہے‘ آپ میری بات سنیں تو میں آپ کو بتاؤں......‘‘ اس نے تمیز سے کہا۔

’’اچھا چلو بولو۔‘‘ کیشو مہرہ نے تیزی سے کہا۔

’’میں انہیں بتانے آیا تھا کہ کل جو حملہ آور انہوں نے ہم تک پہنچایا تھا‘ وہ تھانے سے بھاگ گیا ہے‘ اور اس سے......‘‘

’’انسپکٹر کیوں جھوٹ بولتے ہو تم...... کل تم نے ہمارے سامنے اپنے دو حوالاتیوں کو اسپتال روانہ کیا تھا‘ کیا ایسا نہیں ہے؟‘‘ کیشو نے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ دھیرے سے بولا۔

’’میں بس اس پر آپ سے بات کرنے آیا تھا‘ وہ حملہ آور......‘‘

’’کیا ہوا اسے......؟‘‘ جسپال نے تیزی سے کہا۔

’’وہ دونوں حوالاتی اغوا ہو گئے ہیں یا ان کے ساتھی انہیں چھڑا کر لے گئے ہیں۔ میں اپنے کل والے رویے کی معافی مانگتا ہوں۔ میں چاہ رہا تھا کہ آپ سے مل کر اس صورت حال کو سلجھا لوں۔‘‘ انسپکٹر نے یوں کہا جیسے کہہ رہا ہو اس کے ہاتھ سے شیشے کا گلاس چھن کر ٹوٹ گیا ہو‘ تبھی کیشو نے کہا۔

’’تم ایسا کرو انسپکٹر......! اپنے تھانے جاؤ‘ میں نے عدالت میں آج کیس دائر کر دینا ہے‘ میں اے سی پی سے بھی ملوں گا اور تمہاری کارکردگی بتاؤں گا‘ انسانی حقوق کی تنظیمیں خود تم سے پوچھ لیں گی‘ مہیلا دل (خواتین محاذ) کو بھی متحرک کر دوں گا اور میڈیا خود بخود ان کی طرف متوجہ ہو جائے گا‘ تم جاؤ‘ اب ہم خود سنبھال لیں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے جی‘ اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو مزید کیا کہہ سکتا ہوں۔‘‘ انسپکٹر کو لگا کہ شاید ان تلوں میں تیل نہیں ہے یا پھر شاید اسے اپنی انسپکٹری کا جوش آ گیا ہوگا‘ یہ دونوں باتیں اپنی جگہ بجا‘ لیکن جسپال سمجھ رہا تھا کہ اسے انسپکٹر رن وید اور اس کے ڈیپارٹمنٹ کی پوری آشیرواد حاصل ہے‘ وہ وہاں سے اٹھا اور تیزی سے نکلتا چلا گیا۔ تبھی کیشو مہرہ نے ہیڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

’’دیکھیں جناب‘ آپ نے بھی سن لیا ہوگا‘ کہ اصل میں معاملہ کیا ہے۔ آپ فوراً اپنے متعلقہ اداروں کو اطلاع دیں‘ اس واقعہ کی‘ آپ اپنا تحفظ کر لیں‘ ممکن ہے کل کہیں جواب دہی ہو جائے۔‘‘

جسپال یہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ محض دھمکی ہے‘ ممکن ہے مستقبل میں ایسا کچھ نہ ہو‘ جس وقت کیشو مہرہ نہیں آیا تھا‘ اس کے دماغ میں یہ کہیں بھی نہیں تھا کہ وہ اس واقعہ کو کیسے استعمال کر پائے گا۔ لیکن اس کے شاطر دماغ نے کر لیا وہ تو محض اپنا غصہ انسپکٹر پر اتارنا چاہتا تھا‘ وہ دونوں ہیڈ کے کمرے سے باہر آ گئے تھے اور پھر تیزی سے ہرپریت کے کمرے کی طرف چلے گئے۔ جسپال نے ایک بار اندر جھانک کر دیکھا‘ ہرپریت محو خواب تھی۔

’’میں نہیں چاہتا کہ تم یہاں جالندھر میں ان لوگوں کے ساتھ دکھائی دو جو کسی نہ کسی حوالے سے جرم کی دنیا سے منسلک ہیں۔ میں نے گیتا کالونی ہی میں تمہارا بندوبست کر دیا تھا‘ مگر اس واقعے کے بعد مجھے نہیں لگتا کہ تم محفوظ رہو گے‘ اس لیے تمہیں کسی ایسے بندے کے ساتھ رکھنا ہوگا‘ جہاں کم از کم تمہارا تحفظ ہو سکے۔‘‘ کیشو نے سوچنے والے انداز میں کہا۔

’’لیکن یہاں ہرپریت......؟‘‘ جسپال نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

’’یہ انوجیت کی ذمہ داری ہوگی‘ دشمن ہمیں ایک جگہ محدود کر دینا چاہتے ہیں‘ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔‘‘

’’ہمیں محدود کرنے سے انہیں کیا فائدہ ہوگا؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’وہ ہمیں دیوار کے ساتھ لگا کر یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہم مدد کے لیے کس کی طرف دیکھتے ہیں یا کون ہماری مدد کو آتا ہے؟ اس سے سارا معاملہ آسانی سے سمجھ میں آ جائے گا۔ دوسرا ہمارے ایک جگہ محدود ہو جانے سے اگر ان پر کوئی حملہ نہیں ہوتا تو بھی وہ سمجھ جائیں گے...... تم ان کے سامنے بھی رہو‘ لیکن انہیں نقصان پہنچا دو...... میں یہی چاہتا ہوں۔‘‘

’’اب کرنا کیا ہے......؟‘‘

’’فوراً تم اوگی چلے جاؤ...... اور تمہارا آمنا سامنا بلجیت سے ہو جائے شرط یہ ہے کہ وہ تم پر حملہ آور ہو‘ ملازمین کی صورت میں کچھ بندے تیرے ساتھ بھیج دوں گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے‘ انوجیت آ جائے تو میں اوگی پنڈ چلا جاؤں گا۔‘‘

’’اوکے......! میں دوپہر دو بجے کے قریب تجھے ریزورٹ میں ملتا ہوں۔ وہیں تجھے بتاؤں گا کہ میں نے کیا کیا ہے۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ وہ چند لمحے کمرے کے باہر کھڑا رہا‘ پھر ہرپریت کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ ہنوز محو خواب تھی۔ اس کے چہرے پر پیلاہٹ واضح تھی‘ وہ اس میں کھویا ہوا تھا کہ انوجیت کا فون آ گیا۔

’’جسپال‘ اسپتال میں کیا ہنگامہ ہو گیا؟‘‘

’’ہو کر ختم بھی ہو گیا۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے اختصار سے ساری بات کہہ دی۔ تب وہ بولا۔

’’میں ایک گھنٹے میں اسپتال آ جاتا ہوں‘ لیکن میرے آنے سے پہلے ہی کچھ لڑکے وہاں آ جائیں گے۔ اب ہرپریت کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔‘‘

’’میں انتظار کر رہا ہوں۔‘‘ جسپال نے کہا تو اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد پھوپھو کلجیت کور کے ساتھ انوجیت آ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

’’جسپال......! اب تو آزاد ہے‘ جو چاہے کر‘ میں ہرپریت کو سنبھال لوں گا۔‘‘

’’پتر......! یہ حالات تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ اس سے آگے بہت سخت حالات آنے والے ہیں۔ دشمن بہت طاقتور ہے‘ اور یہ جنگ کب تک رہے گی‘ اس کا کوئی پتا نہیں‘ میری ہرپریت تو ایک دو ہفتے بعد ٹھیک ہو جائے گی لیکن رب تیری خیر کرے۔ دشمن تیری تاک میں ہیں۔‘‘

''رب خیر ہی کرے گا پھوپھو...... تو دل تھوڑا نہ کر، مجھے اوگی پنڈ جانے دے، پھر میں بلجیت سنگھ کو بھی دیکھ لیتا ہوں، اور رن ویر کو بھی، ایک نہ ایک دن تو آمنے سامنے ہونا ہی ہے۔'' اس کے لہجے میں سے غصہ چھلک رہا تھا۔

''جو کچھ بھی ہے پتر، لیکن جنگ میں جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ تیرے دشمن طاقتور ہی نہیں، انتہائی چالاک بھی ہیں۔'' کلجیت کور نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کی بات ذہن میں رکھوں گا پھوپھو جی......'' یہ کہہ کر اس نے انوجیت کی طرف دیکھا، پھر ایک نگاہ ہرپریت پر ڈالی اور باہر کی طرف نکلتا چلا گیا۔ اس کا رخ ریزورٹ کی طرف تھا، جہاں کچھ دیر بعد اس سے کیشو مہرہ نے آن ملنا تھا۔ وہ جالندھر بائی پاس پر موجود ریزورٹ پہنچا تو اسے یقین ہوگیا کہ کوئی اس کا تعاقب نہیں کر رہا ہے۔ اس نے جاتے ہی اپنا سامان سمیٹا اور بیگ تیار کر کے باہر کاؤنٹر تک آ گیا۔ اس نے وہاں ادائیگی کی، یہاں تک کہ اس میں دو بج گئے اور کیشو کا فون آ گیا۔ وہ وہیں پر پہنچ رہا تھا۔

وہ دونوں لابی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کیشو اسے بتا چکا تھا کہ اس نے اے سی پی کو مطلع کر دیا ہے اور دوسری۔ درخواست گزار دی ہے۔ چند چینل کے رپورٹرز کے ساتھ رابطہ کر کے، انہیں اس راہ پر لگا دیا ہے وہ خود ہی خبر بنا کر چلائیں گے۔ وہ صحافیوں کو چلانے کا ہنر جانتا تھا، اس نے کافی حد تک ان کی ضرورت پوری کر دی تھی اور وہ جی جان سے اس کی مدد کرنے کو تیار ہو چکے تھے۔

''اب تم سکون سے اوگی پنڈ جاؤ، اور تمہارا پہلا ٹارگٹ یہی ہونا چاہیے کہ بلجیت سنگھ کسی نہ کسی طرح اپنے بل سے نکلے اور پھر جس طرح پہلے دھمکیاں دے گیا تھا اسی طرح پھر دے، دوسری طرف تم نے رن ویر کو دباؤ میں رکھنا ہے کہ تم پر حملہ آوروں کا کیا بنا، چاہے روزانہ تمہیں پولیس چوکی جانا پڑے۔''

''میں سمجھ گیا کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو، یہاں ہر حال میں ہرپریت کا خیال رکھنا، میرا سارا دھیان ادھر رہے گا۔'' جسپال نے آہستگی سے کہا تو کیشو ہنستے ہوئے بولا۔

''اب اوگی اتنا بھی دور نہیں ہے یار، بیس منٹ کا راستہ ہے، جب دل چاہے آ جانا، اور پھر کبھی کبھی تجھے عدالت میں بھی آنا ہوگا شاید، میں نے مقدمہ بھی تو دائر کر دیا ہے، اگرچہ فیصلہ دو چار برسوں میں تو نہیں ہونے والا۔''

''کیشو......! تم میری جائیداد والا معاملہ جلد سے جلد حل کر دو، باقی میں دیکھ لیتا ہوں۔'' جسپال نے یوں کہا جیسے اس کی زنجیریں کھل جائیں گی۔

''صرف ایک یا دو ہفتے، تمہارا کیس متعلقہ محکمے کے اہلکاروں نے دیکھ لیا ہے، اب بس ان کے ساتھ رشوت طے ہونی ہے۔''

''تو وہ کرو نا...... دیر کس بات کی ہے؟'' جسپال نے تیزی سے کہا۔

''وہ بھی ہو گیا سمجھو، میں نے ایک دو دن میں فائنل کر لینا ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''اندازاً کتنی رقم مانگ سکتے ہیں، میں اس کا......''

جسپال نے کہنا چاہا تو وہ ٹوکتے ہوئے بولا۔

''نہیں ضرورت...... جسمیندر نے اکاؤنٹ میں خاصی رقم ڈال دی ہے، تم اس کی فکر نہ کرو۔ چل ٹھیک ہے پھر، میں نکلتا ہوں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں وہ میں نے تمہارے لیے دس بندوں کا انتظام کر دیا ہے، وہ تیرے ساتھ حویلی میں رہیں گے، میں نے انہیں اوگی بھیج دیا ہے۔'' کیشو نے اس سے اٹھ کر ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' جسپال نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور دونوں باہر کی جانب چل دیئے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اوگی پہنچ گیا۔ وہ سیدھا کوٹھی گیا۔ وہاں اس نے سامان وغیرہ رکھا پھر جوتی کو بتایا کہ حویلی میں رہنے کے لیے کوئی بندوبست نہیں ہے، وہاں چند لوگوں نے رہنا ہے، اس لیے کم از کم ان کے سونے کا بندوبست کرنے کے لیے بستر نکال دے اور رات کا کھانا تیار کر دے۔ ایسی ہی باتیں بتا کر وہ حویلی کی طرف چل پڑا۔ وہ راستے ہی میں تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ رن ویر کا فون تھا۔

''واپس اوگی آنے پر خوش آمدید کہتا ہوں جسپال......''

''اچھا کیا، تم نے خود فون کر لیا، ورنہ میں تیری طرف خود آنے والا تھا۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''تو اب آ جاؤ، میں چوکی ہی میں بیٹھا ہوا ہوں۔ کیا تمہارے ساتھ ہرپریت نہیں آئی، سنا ہے کسی نے اسے گولی مار دی ہے۔''

''اب تمہیں ساری بات کا پتا ہے تو کیوں چغل خور عورتوں کی طرح کن سوئیاں لے رہے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''سنا ہے تم نے حویلی میں بدمعاش بھی بلا لیے ہیں۔ دیکھنا، یہ جو کچھ بھی کریں گے، اس کی تمام تر ذمہ داری تم پر ہوگی۔''

''میں اپنی ذمہ داری جانتا ہوں رن ویر، تم نہیں جانتے ہو۔ اب تک کیا تفتیش کی تم نے...... لگتا ہے تمہیں اب اپنا نام بدلنا پڑے گا۔ وہ کیا کہتے ہیں انہیں جو کسی کا پھینکا ہوا اٹھا کر کھاتے ہیں۔'' اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ لیکن غصہ اس کے لہجے سے چھلک گیا تھا۔

''جسپال......! تم مجھے نہیں جانتے...... مگر آہستہ آہستہ جان جاؤ گے...... میں بندے پر فوراً ہاتھ نہیں ڈالتا، بلکہ اسے مجبور کر دیتا ہوں کہ وہ خود چل کر میرے پاس آئے، تمہیں بھی آنا ہوگا۔ پھر تم جتنے سوال کرنا، میں ان کے جواب دوں گا اور اگر سوال نہ کر سکے تو پھر جواب فوراً دینا۔'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''اب تو چل پڑے ہیں رن ویر...... دیکھنا، کیا ہوتا ہے۔'' جسپال نے کہا اور فون بند کر دیا۔

وہ اوگی پنڈ میں پہنچ کر حویلی کے سامنے جا رُکا تھا۔ حویلی کے باہر دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ایک ٹرک سائیڈ میں کھڑا تھا جس میں سے مزدور سامان اتار کر اندر لے جا رہے تھے۔ سامنے ہی ایک نوجوان سکھ لڑکا کھڑا تھا، جس نے سفید پتلون، پیلے اور ہلکے سبز رنگ کی شرٹ اور سفید ہی پگڑی پہنی ہوئی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی، وہ اس کی گاڑی کی طرف متوجہ تھا۔ جسپال جب کار سے اتر کر دروازہ بند کر چکا تو وہ آگے بڑھا اور زوردار انداز میں ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

''میں پریال سنگھ ہوں بائی جی، باقی کو میں ہی لیڈ کروں گا۔''

''اوہ پریال......! کیسے ہو؟ یہ دیگیں اور یہ سامان......؟'' اس نے ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیگیں اس لیے چڑھائی ہیں کہ لوگ یہاں سے آ کر کھانا لے جائیں۔ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے نا کہ حویلی آباد ہو گئی ہے اور باقی رہی سامان کی بات تو بائی جی ہم نے یہاں رہنا ہے بستے گھروں میں سامان کے بغیر کیسے رہا جا سکتا ہے۔''

''مطلب...... تم لوگ سارا بندوبست کر کے آئے ہو۔'' جسپال نے کہا۔

''جی بائی جی، کیشو صاحب نے کہا ہے کہ آپ کو فون کال بھی نہ کرنی پڑے، رقم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''کیشو صاحب بہت اچھے ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ حویلی کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

"آئیں' میں آپ کو سب سے ملواتا ہوں۔"
"ہاں چلو۔" جسپال نے کہا اور دونوں اندر کی جانب بڑھ گئے۔

❁ ❁ ❁

دن اچھا خاصا نکل آیا تھا جب میری آنکھ کھلی' میں چھت پر ہی پڑا تھا۔ مجھے کسی نے جگایا ہی نہیں تھا۔ میں رات سونا نہیں چاہتا تھا لیکن نجانے اتنے زوروں کی نیند کہاں سے آ گئی۔ سورج کی گرمی کا احساس ہی تھا' جس نے مجھے جاگنے پر مجبور کردیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا' پھر اٹھ کر نیچے آ گیا۔ میں سیدھا باتھ روم میں گیا۔ وہاں خوب نہا کر کسلمندی دور کی' واپس اندر کی طرف آیا تو کمرے میں ناشتہ لگا ہوا تھا۔ مگر نہ اماں دکھائی دی اور نہ سوہنی۔ میں نے ناشتہ کیا' ٹھنڈی لسی کے گلاس نے پرسکون کردیا۔ میں اس وقت گلاس رکھ کر تھوڑا سکون کرنا چاہ رہا تھا کہ سوہنی کمرے میں آئی' وہ کافی حد تک سوگوار سی تھی۔ میں نے ایک نگاہ اس کی طرف دیکھا' وہ ایک ٹک میری طرف دیکھے چلی جارہی تھی۔ اس کے لب دھیرے دھیرے لرزاں تھے۔ میں فی الحال اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے فوراً ہی باہر جانے کا سوچا' میں نے اپنا جوتا پہنا اور باہر جانے کی نیت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بھانپ لیا کہ میں جانا چاہتا ہوں' اس لیے سوہنی نے بڑے نرم انداز میں اپنا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر اسے دیکھا' اس نے ایک لمحہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور پھر میرے گلے لگ کر زاروقطار رونے لگی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ ہچکیوں اور سسکیوں میں اس کا بدن لرزنے لگا۔ میں نے اسے سنبھالا دیا اور خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کڑوا گھونٹ تو تجھے پینا ہی ہوگا سوہنی۔"

"میں...... میں...... تو ذہنی طور پر پہلے ہی تیار تھی۔ مگر اتنی جلدی ایسا ہوجائے گا' یہ میں نے نہیں سوچا تھا...... باپ...... ملا بھی...... تو بس چند گھنٹے......" یہ کہتے ہوئے وہ پھر سے رونے لگی۔

"سوہنی......! جتنا رو سکتی ہو' اپنے باپ کو رولو' پھر اس کے بعد نہیں رونا...... سوچو تم چند گھنٹے کے باپ کو رو رہی ہو' جو تمہیں بھی زندہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا' میں بھی تو ہوں...... جسے باپ کے لمس کا احساس تک نہیں' مجھ سے میرے باپ کی شفقت چھیننے والا وہی شخص تھا' اب رولو جتنا رونا ہے......" میں نے بہت حد تک اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کیا میں اپنے باپ کی میت پر جا نہیں سکوں گی۔ میں اس کا چہرہ آخری بار نہیں دیکھ سکوں گی؟" سوہنی نے کہا۔

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا' میں ابھی باہر جاؤں گا' باہر کی فضا کیا ہے' اس بارے میں معلومات لوں گا' پھر کچھ کہہ سکتا ہوں۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اگر ممکن ہوسکے تو خدارا......" اس نے منت بھرے انداز میں کہا تو میں نے اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"سوہنی...... اتنی نرم دل مت بنو' جو لوگ اس دنیا سے چلے جاتے ہیں' انہیں بھولنا پڑتا ہے۔ نہ بھولیں تو روگ بن جاتا ہے۔ جس کی مثال میں ہوں۔ مردہ چہروں کو آنکھوں میں مت رکھو۔ لیکن اگر تم چاہتی ہو تو حویلی چلی جاؤ' میں اماں کے ساتھ تمہیں بھیج دیتا ہوں۔ مجھے نہیں لگتا کہ......" میں نے فقرہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔

"اماں تو صبح کی وہاں چلی گئی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ مجھے وہاں دھتکار دیا جائے گا۔" سوہنی نے کسی حد تک خود پر قابو پالیا تھا۔

"پھر بھی تم چاہتی ہو؟" میں نے حیرت سے

پوچھا۔

"ضروری تو نہیں کہ بندے کی ساری خواہشیں پوری ہوجائیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک گہری سانس لی اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں بھی اس کے پاس وہیں بیٹھ جاؤں' میں نے لمحہ بھر کو سوچا اور پھر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"دیکھ سوہنی' تجھے چاہے جائیداد کی بھوک ہے یا نہیں' لیکن شاہ زیب کو ہے' وہ کسی صورت بھی تجھے زندہ نہیں دیکھنا چاہے گا۔ اب تجھے اپنے راستے سے ہٹانے کا وہ کوئی طریقہ بھی آزمائے' ممکن ہے وہ تجھے بہن کا مان اور عزت دے کر حویلی بھی لے جائے یا پھر سیدھے سبھاؤ قتل کروانے کی کوشش کرے یا ممکن ہے کوئی سازش کرکے قتل کروائے...... اس سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔"

"میں جانتی ہوں جمال......! مجھے جائیداد کی قطعاً کوئی بھوک نہیں۔ اور نہ ہی میں اس کے لیے کوشش کروں گی' میری ماں کے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ میں سکون سے زندگی گزار لوں' اور اگر میری ماں بھی مجھے اپنے گلے نہ لگائے تو مجھے اتنا یقین ہے تو مجھے ضرور اپنی جوتیوں میں جگہ دے دے گا۔" سوہنی نے کچھ اس انداز سے کہا کہ میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی' پیار اور محبت کی لہریں ایک دوسرے سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی کہیں دور تک پھیل گئیں۔

"یہ یاد رکھو' میں اب تجھے کبھی نہیں چھوڑوں گا' لیکن کبھی بھی تم پر نہ اپنا دعویٰ رکھوں گا اور نہ جبر کروں گا' تم اپنی مرضی کی مالک ہو' جو چاہو سو فیصلہ کرو۔" میں نے اپنی سوچ کا اظہار کردیا۔ تبھی اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولی۔

"میں تجھے اپنا دل دے چکی ہوں جمال' ایک عام لڑکی جب اپنا دل دے دیتی ہے نا' تو پھر وہی اس کا

aanchal.com.pk
تازہ شمارہ شائع ہوگیا ھے
آج ھی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
پرچہ نہ ملنے کی صورت میں دفتر سے رابطہ کریں۔ فون 35620771/2

سب کچھ ہوتا ہے' وہ چاہے جان لے لے یا زندہ رکھے...... میں تو پھر ایک طوائف ہوں' طوائف کا جس پر دل آجائے نا' وہ......" سوہنی نے کہنا چاہا تو میں نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔

"کیا تم ایسا نہیں کرسکتی ہو کہ خود کو طوائف سمجھنا چھوڑ دو' اس زندگی کو بھول جاؤ؟"

"تم چاہو تو......" اس نے بڑے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔

"سوہنی......! میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا' میں تم سے محبت محسوس کرتا ہوں اور بلاشبہ تم اتنی پیاری ہو' ایسی ہو کہ تم سے محبت کی جائے' لیکن مجھے خود پر اعتماد نہیں ہے' آج میں ہوں' پتا نہیں اگلے چند لمحوں میں' یا محض چند گھڑیوں میں نہ رہوں' کوئی بھی سنسناتی ہوئی گولی' میرا جسم ٹھنڈا کردے......اور پھر......"

"ایسا نہ کہو جمال......!" اس نے تڑپ کر کہا۔

"نہیں...... مجھے کہنے دو...... جس طرح کی جنگ میں نے چھیڑلی ہے اس میں بہت کچھ بھی کچھ نہیں ہے۔ کل اگر شاہ زیب مجھے اپنے ڈیرے پر مار دیتا تو کیا ہوتا' زندگی اور موت بے شک اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن یوں بھی تو ہوسکتا ہے نا میری باقی زندگی کسی جیل خانے میں گزر جائے' یا میں اشتہاری بن جاؤں۔ زندہ ہوتے ہوئے بھی تم تک رسائی نہ ہو؟" میں نے اسے اس حقیقت سے آگاہ کیا جس کے بارے میں وہ بھی اچھی طرح آگاہ تھی۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔

"تم ایسا کیوں نہیں سوچتے ہو کہ تمہارا جو مقصد تھا' وہ پورا ہوچکا۔ ہم یہ جگہ' یہ علاقہ ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ میں اپنی زندگی کو چھوڑ دیتی ہوں۔ ہم کسی دوسری جگہ ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ میں بھی ایک پرسکون زندگی چاہتا ہوں' ایک پرسکون گھر کا خواب میرے اندر بھی ہے' لیکن سوہنی' کیا یہ سب ایک دو دن میں ہوسکتا ہے' ہمیں یہاں سے سمیٹ کر کسی نئی جگہ پر جاکر' نئی زندگی شروع کرنے میں کچھ دن تو لگیں گے۔ میں تیری بات مان لیتا ہوں' پھر بھی اگر میری زندگی میں سکون نہ رہا' وہی سب کچھ ہوا' جو میں نے تمہیں پہلے کہا ہے تو پھر......؟" میں نے تیزی سے کہتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"وہ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔"

"سوہنی......تب مجھے وہ زندگی چھوڑتے ہوئے بہت دکھ ہوگا۔ اتنا دکھ کہ شاید تم اس کا تصور بھی نہ کرسکتی ہو۔ اس وقت میری اکیلی جان ہے' میرے ساتھ کچھ بھی ہوجائے' مجھے کچھ فرق نہیں پڑنا۔"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس وقت تم اکیلی جان ہو' کیا اماں نہیں ہے' کیا میں نہیں ہوں۔" اس نے تڑپ کر کہا۔

"سن......! جب اماں نے مجھے یہ راستہ دکھایا تھا تو ساتھ میں یہ سبق بھی دے دیا تھا کہ پتر' خود کو اکیلا ہی سمجھنا' میری فکر مت کرنا' میرے بارے میں سوچو گے تو کچھ بھی نہیں کرپاؤ گے' یہ سبق میں نے یاد رکھا' اس نے مجھے حوصلہ دیا' آج میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکا ہوں لیکن یہ کامیابی ابھی ادھوری ہے' شاہ زیب نے پلٹ کر مجھ پر وار کرنا ہے' اور میں بزدلوں کی طرح یہاں سے بھاگ جانا نہیں چاہتا' یہیں رہنا چاہتا ہوں' اور جہاں تک تمہاری بات ہے' تمہارا یہ چند دن کا ساتھ مجھے یوں لگتا ہے جیسے ہم صدیوں سے ایک ہوں۔ بلاشبہ تم مجھے اچھی لگتی ہو' لیکن تم بتاؤ' کیا میں ان حالات میں ایک گھر بنا سکتا ہوں' تمہارے خوابوں میں رنگ بھر سکتا ہوں۔" میں بے حد جذباتی ہوگیا تھا' اس لیے کہتا چلا گیا۔

"جمال......! تم جو سوچو' جو چاہو' میں تمہاری ہوں'

زندگی کے آخری لمحے تک میں تیری منتظر رہوں گی' میں اپنا آپ تیرے لیے وقف کرچکی ہوں۔" اس نے آہستگی سے کہا اور اپنا سر میرے کاندھے پر رکھ دیا۔ تبھی میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"زندگی میں بھی جینا چاہتا ہوں' لیکن اک ذرا صبر' میں نے خود یہاں نہیں رہنا' یہاں سے دور بہت دور چلے جانا ہے' تم جانتی ہو کہ میں یونہی اچانک اس کھیل سے نہیں نکل سکتا۔ ذرا وقت لگے گا' اور تم میرے ساتھ اس وقت تک کا انتظار کرلو۔"

"میں تمہاری ہوں' تم میری زندگی کے مالک ہو۔ جو چاہو اور جیسا فیصلہ کرو' مجھے قبول ہوگا۔" اس نے حتمی انداز میں کہا۔ تبھی میں نے اس کی زلفوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"بس یہی یقین رکھنا کہ میں تمہارا ہوں اور تمہارا ہی رہوں گا۔ یہ چند دن' چند ہفتے بھی ہوسکتے ہیں' چند مہینے' پھر ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے اور اگر میں نہ رہا تو......"

"ایسا مت سوچو......" اس نے جلدی سے خود کو الگ کرکے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تم یہ باتیں برداشت نہیں کرپارہی ہو' تمہیں تو میرے ساتھ چلتے ہوئے بہت بہادر ہونا پڑے گا۔ بہت حوصلہ رکھنا پڑے گا۔" میں نے اس کے ہونٹوں کی نرماہٹ کو اپنی انگلی کی پور سے محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"تم دیکھنا جمال' میں تیرے رنگ میں خود کو کیسے رنگتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دوبارہ میرے کاندھے سے لگ گئی۔ میں کچھ دیر اس کی پیٹھ تھپکتا رہا' ایسے میں گیٹ بجنے کی آواز آئی......وہ مجھ سے الگ ہوگئی' میں اٹھا اور گیٹ تک گیا۔ باہر چھاکا تھا' وہ خاموشی سے چلتا ہوا میرے ساتھ دالان میں آکر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ادھر ادھر دیکھا اور پوچھا۔

"اماں نہیں ہے؟"

"وہ حویلی گئی ہے۔ سنا ہے سردار شاہ دین قتل ہوگیا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ مقصد یہی تھا کہ وہ اس حوالے سے مجھے مزید باتیں بتائے۔

"ہاں......سنا تو یہی ہے' کوئی کہتا ہے اس نے خودکشی کرلی ہے' اور کوئی کہتا ہے قتل ہوا ہے' وہ کوئی بہت ہی ظالم قاتل تھا جس نے اس کے نرخرے پر خنجر پھیر دیا۔ ویسے اگر وہ خودکشی کرلیتا تو زیادہ اچھا نہیں تھا؟" چھاکے نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"میرے خیال میں اس کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی ہوگی۔ خیر...... پتا چلا کہ شاہ زیب کیا کہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ابھی تک خاموش ہے۔ پولیس آئی تھی صبح صبح...... کیونکہ قتل کا پتا ہی صبح چلا ہے۔ رات سارے ملازمین اور سیکورٹی گارڈ ڈیرے پر تھے۔ وہاں کیا کھچڑی پکتی رہی ہے یہ تو ابھی معلوم نہیں ہوا۔ مجھے چاچا بیرو ابھی نہیں ملا' میں ایک چکر اس کے گھر کا لگا آیا ہوں' وہ حویلی میں ہے' آتا ہے تو معلوم ہوجائے گا۔"

"تو پولیس کے آنے کے بارے میں بتا رہا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں پولیس آئی تھی' انہوں نے لاش کو قبضے میں لے لیا ہے اور قصبے والے اسپتال میں لے گئے ہیں۔ شاہ زیب بھی ساتھ ہے' یقیناً اب ایف آئی آر درج ہوگی' سردار تو پورا زور لگادیں گے قاتل پکڑنے کے لیے۔"

"علاقے کی کیا صورت حال ہے' کیا علاقے میں یہ بات گردش نہیں کررہی ہے کہ شاہ زیب اپنے باپ کا قاتل خود بھی ہوسکتا ہے' اس نے کسی کرائے کے قاتل سے یہ قتل کروایا' کیونکہ وہ اپنے باپ سے ناراض تھا' سیکورٹی والوں کے ساتھ ڈیرے پر تھا'

شک تو جاتا ہے نا اس کی طرف......" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... یہ تو ممکن ہے کہ ایسی بازگشت بھی ہو' پھر ناراضگی کی وجہ بھی سامنے آئے گی' پولیس والے تو جانتے ہیں نا کہ شاہ زیب ناراض تھا' ایک دوسرے کے ساتھ اچھی خاصی جھڑپ بھی ہوچکی تھی۔" چھاکے نے بھی سوچتے ہوئے کہا۔

"تو اچھا ہے ناراضگی کی وجہ معلوم ہوجائے' علاقے میں لیش چلے گا تو ساری کہانی لوگوں پر کھل جائے گی' میرا خیال ہے سوہنی کو اس علاقے میں عزت واحترام ملنا چاہیے۔ یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ طوائف نہیں ہے۔" میں نے چھاکے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"سب کچھ ممکن ہے' جمالے...... دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ شاہ زیب پر ہی ہے نا کہ وہ شک کی انگلی کس کی طرف کرتا ہے۔ پھر وہیں سے بات چلے گی۔ میرے خیال میں یہ چند دن تو وہ کچھ نہیں کرپائے گا۔ ظاہر ہے ان کے تعلق کا دائرہ وسیع ہے۔ اس کا اپنا ایک سیاسی اثر ورسوخ بھی تھا' یہ سلسلہ چلے گا' پھر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔" وہ یوں بولا جیسے راوی ابھی چین ہی چین لکھتا ہے۔

"گاؤں کے لوگ کیا کہتے ہیں۔ نور نگر میں تو حیرت پھیل گئی ہوگی۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں' حیرت تو ہے وہ سوچ رہے ہیں کہ اتنے بڑے بندے پر ہاتھ کس نے ڈال دیا۔ خیر......! جمالے جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا' تم ذہن میں رکھنا کہ اس قتل کی تفتیش بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوگی اور ہوسکتا ہے اگر شاہ زیب نے چاہا تو...... ورنہ کچھ بھی نہیں ہوگا۔" اتنا کہہ کر اس نے آہستگی سے کہا۔ "تم بہت محتاط رہنا۔"

"میں محتاط ہی ہوں۔ میں بہت کچھ سوچ چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ شاہ زیب کیسی سوچ رکھتا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کرنا' ہاں اگر اس نے کچھ کیا تو اپنا دفاع کرنا تو بنتا ہے چھاکے......"

"وہ تو ہے...... خیر......! اب دیکھتے ہیں کہ اپنے منہ سے ہوا کیا نکالتا ہے تو پھر سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے......" یہ کہہ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پوچھا۔ "اماں تو حویلی گئی ہے' کیا سوہنی بھی گھر پر نہیں ہے۔"

اس نے اتنا ہی پوچھا تھا کہ کچن میں سے سوہنی نے آواز دی۔

"ہاں چھاکے کیا بات ہے' میں ادھر چائے بنا رہی ہوں تمہارے لیے۔"

"بس یہی کہنا تھا میں نے...... جلدی سے بنالاؤ......" اس نے کہا اور میری طرف دیکھ کر مسکرادیا۔ اس سے پہلے کہ ہم کوئی بات کرتے' گیٹ پر دستک ہوئی' میں قدرے حیران ہوا کہ اماں کو دستک دینے کی کیا ضرورت' دروازہ تو کھلا ہوا ہے ممکن ہے کوئی اور ہو' یہی سوچ کر میں اٹھا اور گیٹ تک گیا۔ میں نے باہر جھانکا تو سامنے ڈی ایس پی کھڑا تھا' اس کے اردگرد بہت ساری پولیس کی نفری تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں باہر والا کمرہ کھولتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے گیٹ بند کرنا چاہا تو اس نے میرا بازو پکڑلیا' پھر بڑے سرد سے لہجے میں بولا۔

"میں تمہیں گرفتار کرنے کے لیے آیا ہوں۔ چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو گولی ماردوں گا۔" میں نے اس کے چہرے پر دیکھا اور پھر پلٹ کر اندر کی جانب نگاہ دوڑائی' سوہنی اور چھاکا مجھے دیکھ رہے تھے۔ میرے سامنے ڈی ایس پی' میرا بازو پکڑے ہوئے میری گرفتاری کا اعلان کرچکا تھا۔

(باقی آئندہ)

احساس

خلیل جبار

زندگی جہد مسلسل کا نام ہے اس میں اگر اتار چڑھاؤ نہ آئے تو وقت گویا ٹھہر سا جاتا ہے اس کی زندگی بھی حوادث کا شکار تھی' وقت نے اسے آسمان سے زمین پر لا پٹخا تھا لیکن اس کی ہمت اور نیت اس کے ارادوں کو نہ توڑ سکی۔ اک نوجوان کی سچی کہانی' وہ اپنے برے وقت کو بھول نہ پایا تھا۔

دو دن کی بندش کے بعد رات بارہ بجے سی این جی اسٹیشن کھل گئے تھے' سی این جی اسٹیشن پر گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں لگ گئی تھیں۔ میں بھی اپنا رکشہ لیے قطار میں تھا' طویل انتظار کے بعد میرا نمبر آیا تھا' سی این جی بھروا کر میرا رخ اب گھر کی طرف تھا۔ آج دن بھر مسافروں سے مغز ماری کرتے میرا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا' میں اب سکون کے لمحات میں وقت گزارنا چاہتا تھا اور سکون گھر پر ہی مل سکتا تھا۔

جب سے میں نے اپنا سی این جی رکشہ خریدا ہے خود کو بہت پرسکون محسوس کرتا تھا جب کہ کرائے کا رکشہ چلا کر اس میں گزارا کرنا بہت مشکل ہوگیا ہے۔ سی این جی رکشہ سے ڈرائیور بہت خوش تھے کہ پیٹرول کے مقابلے سی این جی بہت سستی تھی۔ گزر بسر اچھی ہوجاتی تھی اکثریت نے اپنے رکشہ سی این جی پر تبدیل کرلیے تھے' کرایہ زیادہ مل جاتا تھا اور سی این جی سستی تھی کسے خبر تھی کہ ہفتے میں دو دو دن سی این جی بند رہا کرے گی جب سے سی این جی بند رہنے لگی تھی ہمیں رکشہ پیٹرول پر چلانا پڑتا تھا۔ پیٹرول مہنگا ہونے کے ساتھ ساتھ بہت جلدی ختم ہوتا تھا مسافر ہم سے یہی توقع رکھتے ہیں کہ ہم کرایہ کم لیں' ہم کرایہ کس طرح کم لیں مہنگائی کا دور ہے پیٹرول جتنا خرچ ہوتا ہے اسی حساب سے کرایہ بھی لینا پڑتا ہے ورنہ کس طرح گزارا ہوگا۔ سواری اپنا مطلوبہ کرایہ دے کر فارغ ہوجاتی ہے' ہمیں دوبارہ اسٹاپ پر آنے کے لیے خالی آنا پڑتا ہے یہ اتفاق ہی ہوتا ہے کہ واپسی پر کوئی سواری مل جائے جو کرایہ پر رکشہ چلاتے ہیں وہ حکومت کو برا بھلا کہتے ہیں۔ اس طرح برا بھلا کہنے سے حکومت کو نقصان پہنچنے لگے تو حکومت چند ماہ سے زیادہ نہ چل سکے وہ بھی بے چارے کیا کریں دل کی تو بھڑاس نکالنی ہی ہوتی ہے۔ رات کو جب رکشہ مالک کے پاس جاتے ہیں وہ دن بھر کا کرایہ مانگتا ہے وہ نہیں جانتا کہ دن بھر دھندا ہوا ہے یا نہیں' اسے کرائے سے مطلب ہوتا ہے اگر اسے یہ کہیں کہ سی این جی کی بندش والے دن دھندا نہیں ہوتا تو وہ غصے سے گرم ہوتے ہوئے کہتا ہے۔

"ٹھیک ہے میاں اگر سی این جی بندش میں دھندا نہیں ہوتا ہے نا پھر اس دن رکشہ لے کر نہ جایا کرو گھر پر آرام کیا کرو۔"

اب بھلا ان سے کیا کہیں کہ یہ ہوائی روزی ہوتی ہے کبھی دھندا ہوجاتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔ دھندا ہونے پر رکشہ ڈرائیور کرایہ دے دیتا ہے جس دن دھندا نہ ہو رکشہ مالک کو ڈرائیور سے رعایت کرتے ہوئے رکشہ کا کرایہ نہیں لینا چاہیے۔ میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ میرا ذاتی رکشہ ہے اور مجھے یہ فکر نہیں ہوتی کہ

بھاڑ ادینا ہے جو کماتا ہوں وہ سب میرا ہے۔

ہر انسان کامیابی کے خواب دیکھتا ہے اور خواب دیکھنا کوئی جرم نہیں ہوتا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میں رکشہ چلاؤں گا' مجھے بچپن سے انجینئر بننے کا شوق تھا' میرے والد ندیم احمد کا بہت اچھا کاروبار تھا' پیسے کی خوب ریل پیل تھی' تعلیمی اخراجات ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہ تھے۔ میری بہن ڈاکٹر بننا چاہتی تھی' چھوٹا بھائی اسکول میں زیر تعلیم تھا لیکن میری طرح وہ بھی انجینئر بننے کے خواب دیکھ رہا تھا' وہ کہتے ہیں نا وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ ایسا ہی ہمارے ساتھ بھی ہوا' والد کا کاروبار بھی ان دنوں کم چل رہا تھا۔ ہمارے علاقے میں موبل آئل کی کئی دکانیں کھل گئی تھیں اور خوب چل رہی تھیں۔ والد صاحب کے پاس اتنا پیسہ تھا کہ وہ اس علاقے میں موبل آئل کی ہول سیل کی دکان کھول سکتے تھے۔ اس طرح چھوٹے دکان دار ان سے ہی آئل خریدتے' یہ سوچ کر انہوں نے اپنے موجودہ کاروبار سے رقم نکالنا شروع کردی تھی۔

ایک شام میں کرکٹ کھیل کر گھر آرہا تھا میں نے چند لڑکوں کو اپنے گھر کے باہر مشکوک انداز میں چہل قدمی کرتے دیکھا ان کے مشکوک انداز کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا' دل میں آئی کہ ان سے پوچھوں کہ تم کون ہو لیکن میں نے پھر یہ خیال چھوڑ دیا کہ بلاوجہ ان سے الجھنا بے کار ہے یہ لفنگے قسم کے نوجوان ہیں میرے منہ سے کچھ نکل گیا تو ہاتھا پائی ہوجائے گی' میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔

آج میں بہت خوش تھا اور میں اپنی خوشی کو برباد نہیں کرنا چاہتا تھا' میرا انجینئرنگ میں ایڈمیشن ہوگیا تھا میرے لیے یہ بہت بڑی خوشی تھی۔

رات سوتے ہوئے میرا ذہن پھر ان ہی نوجوانوں کی طرف چلا گیا وہ کون لوگ تھے اور ہمارے گھر کے باہر مشکوک انداز میں کیوں گھوم رہے تھے' یہ سوچتے سوچتے مجھے نیند آگئی۔ ناجانے وہ رات کا کون سا پہر تھا شور سے میری آنکھ کھل گئی اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بیدار ہونے پر میں نے جو منظر دیکھا' وہ دل ہلادینے کے لیے کافی تھا وہ اوباش نوجوان ہمارے گھر میں تھے ان کے ہاتھوں میں پستول تھے' میرے والد اور والدہ ان کی زد پر تھا۔

"چابیاں ہمارے حوالے کردو ورنہ تمہارے ساتھ تمہارے بچوں کو بھی گولیوں سے ہلاک کردیں گے' جلدی کرو' ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

ابو کا چہرہ خوف سے فق تھا وہ آج ہی بینک سے جمع رقم نکلوا کر لائے تھے اور صبح انہیں موبل آئل پارٹی کو ادائیگی کرنا تھی' رقم دیتے ہی ابو کی دکان پر موبل آئل آنا شروع ہوجانا تھا' یہ رقم ان اوباش نوجوان کے ہاتھ لگنے سے ابو دیوالیہ ہوجاتے اور پھر وہ اس پوزیشن میں نہیں رہتے کہ کاروبار جاری رکھ سکیں' ان کا دماغ تیزی سے کام کررہا تھا' وہ سوچ رہے تھے کہ کس طرح انہیں دھوکہ دے کر اپنی رقم کو بچالیں۔ وہ نوجوان بھی ہوشیار تھے وہ سب سمجھ رہے تھے کہ ابو کے چابی دینے سے دیر کرنے کا مطالبہ یہی تھا وہ کچھ بھی کرسکتے تھے جوان کے پھنسنے کا سبب بن سکتا تھا ابو کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ دونوجوانوں نے خود ہی گھر کی تلاشی لینی شروع کردی باقی تین نوجوان ہم سب کو نشانے پر رکھے ہوئے تھے۔

ان دونوں کی تھوڑی بہت محنت رنگ لے آئی اور سیف کی چابی مل گئی' چابی دیکھ کر وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگے اور ابو کا منہ حیرت سے کھلا کا

کھلا رہ گیا۔ وہ چابی کو بہت چھپا کر رکھتے تھے تا کہ کوئی سیف پر ہاتھ نہ دکھا سکے لیکن اس نوجوان کی خوش قسمتی تھی کہ فوراً ہی چابی مل گئی تھی۔ ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر سیف سے ساری رقم اور زیورات نکال کر ایک تھیلے میں بھر لیے' ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں سے اتنی دولت مل جائے گی۔ اس لیے وہ خوشی سے قہقہے لگانے لگے تھے' ایک لمحے کو ان کی توجہ ابو کی طرف سے ہٹ گئی تھی۔ تینوں میں سے دو نوجوانوں نے پستول جیب میں رکھ لیا تھا' تیسرا ابھی پستول جیب میں رکھنے ہی والا تھا کہ ابو کے ناجانے کیا دل میں آئی کہ وہ تیزی سے اچھلے اور اس کے ہاتھ سے پستول نکل کر دور جاگرا' ابو لپک کر پستول اٹھانا ہی چاہتے تھے۔ ان دو نوجوانوں نے جیب سے پستول نکال کر ابو پر فائر کردیئے' کئی گولیاں ابو کے جسم میں پیوست ہوگئیں اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگئے۔ ابو کو مرتا دیکھ کر وہ رکے نہیں اور ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہوگئے۔

ہمارا گھر جو خوشیوں کا گہوارا تھا وہ ماتم کدہ میں تبدیل ہوگیا' پولیس آئی اپنی کارروائی کرکے چلی گئی۔ ملزمان کے نام معلوم نہ ہونے پر ان کی گرفتاری عمل میں نہ آسکی ہم بہن بھائی کے سر سے باپ کا شفقت بھرا سایہ اٹھ گیا تھا' ہم سب کا روشن مستقبل تاریکی میں تبدیل ہوچکا تھا' میرے انجینئر بننے کا خواب' خواب ہی رہ گیا تھا۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی تعلیم اس صورت میں جاری رہ سکتی تھی جب میں اپنے خواب کی قربانی دے دیتا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ اپنی تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر نوکری کی تلاش شروع کردی۔ میری تعلیم ہی کیا تھی جو نوکری ملتی' مجھ سے زیادہ تعلیم والے دھکے کھاتے پھر رہے تھے' میرا دوست راجو رکشہ کرائے پر چلاتا تھا ایسے کڑے وقت اس نے مجھے رکشہ چلانا سکھادیا اور اس دن سے آج تک رکشہ چلا رہا ہوں۔

ابتداء میں جب میں نے رکشہ چلانا شروع کیا میرے دل میں بڑے وسوسے آتے تھے کہ کہیں کوئی مجھ سے رکشہ چھین کر نہ لے جائے۔ اکثر سواری ویران علاقے میں لے جاکر رکشہ ڈرائیور کو لوٹ لیتے ہیں' اس بنا پر ڈرائیور چوکنا رہتے ہیں رات میں ایسی ویران جگہوں پر جانے سے گھبراتے ہیں' سواری ڈبل پیسوں کا بھی لالچ دیتی ہے کہ کس طرح رکشہ والا مان جائے' دن کی روشنی میں پھر بھی رسک لے لیتے ہیں' ایک بار میرے دوست راجو کے ساتھ بھی اس طرح کا واقعہ ہوچکا ہے وہ زیادہ پیسے کے چکر میں رات میں کورنگی سے آگے نکل گیا جیسے ہی ویران علاقہ آیا رکشے میں موجود دونوں سواریوں میں سے ایک نے پستول نکال لیا اور اس کی پشت سے لگادی۔

"خبردار ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہیں کرنا۔"

راجو کا چہرہ فق ہوگیا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ ایسا ہوجائے گا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ دور دور تک اس کی مدد کو آنے والا کوئی نہیں تھا اور ہوتا بھی تو پستول کے سامنے کون پڑسکتا ہے۔

"زندگی چاہتے ہو تو رکشے کی چابی دے کر فوراً رکشے سے اتر جاؤ۔" وہ بولا۔

"بھائی یہ رکشہ میرا نہیں ہے کرایہ پر چلاتا

ہوں۔ رکشہ چھن جانے پر میرا کوئی بھی اعتبار نہیں کرے گا اور یہی سمجھیں گے کہ میں نے رکشہ کسی کو بیچ دیا ہے۔'' راجو نے گلوگیر آواز میں کہا۔

''یہ تمہارا مسئلہ ہے ہمیں رکشہ چاہیے۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے پستول کی نالی راجو کی پشت پر زور سے چبھوئی۔

دور سے پولیس موبائل آتی دیکھ کر راجو نے رکشہ کو اسپیڈ دے کر جھٹکے سے بریک لگایا' پستول والے آدمی کا سر زور سے رکشہ میں لگی لوہے کی راڈ سے ٹکرایا اور پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ راجو نے پھر رکشہ کو اسپیڈ دے کر بریک لگایا' دوسری بار دونوں کے سر پھر لوہے کی راڈ سے ٹکرائے اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے' موبائل بھی ان کے نزدیک آ گئی تھی راجو زور سے چلایا۔

''میری مدد کرو' یہ مجھے لوٹ رہے ہیں۔''

وہ دونوں بدحواسی میں تیزی سے رکشہ سے نکل کر بھاگے' ان کا پستول رکشہ میں ہی رہ گیا تھا۔ پولیس نے ان کو پکڑ لیا اور ان کا پستول بھی اپنے قبضے میں لے لیا' راجو نے ان کے پکڑے جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور پھر رات میں ویران جگہوں پر سواری لے جانے سے توبہ کر لی تھی۔ وہ زیادہ کرائے ملنے کی امید پر بھی نہیں جاتا تھا۔ مجھے بھی یہی نصیحت کرتا ہے کہ کبھی لالچ میں نہیں آنا۔ رکشہ چلانے میں وہ مجھ سے سینئر تھا' اس لیے میں اس کی بات پر مکمل عمل کرتا تھا۔

میں نے رکشہ بند کر دیا اور گھر پہنچ کر کھانا کھا کر بستر پر لیٹا ہی تھا کہ نیند آ گئی تھکن اتنی تھی کہ صبح ہونے پر بیدار ہوا۔ میری عادت بن گئی ہے جس دن میں زیادہ تھک جاتا ہوں اس رات میں جلدی سو جاتا ہوں' گھر والے بھی سوجانے پر نہیں اٹھاتے۔ امی جان نے میرے لیے ناشتا لگا دیا تھا۔ ریموٹ سے میں نے ٹی وی آن کر دیا۔ خبریں دیکھتے ہوئے مجھے زور کا جھٹکا لگا' ایک سیاسی تنظیم نے یوم احتجاج کے نام پر ہڑتال کی کال دی تھی' ناشتا کرتے ہوئے میرے ہاتھ رک گئے اور میں سوچ میں پڑ گیا اب کیا ہوگا۔ ہڑتال کے دنوں میں ہمارے لیے پریشانی بڑھ جاتی ہے' خاص کر صبح کے وقت دکانیں بند کرانے کے لیے فائرنگ ہوتی ہے' گولی کی آنکھ نہیں ہوتی وہ جس کے بھی جا کر لگے اسے زخمی یا ہلاک کر دیتی ہے۔ زخمی ہونے والا شخص صحت یاب ہو جاتا ہے لیکن جو انسان مر جائے اس کا پورا خاندان بری طرح متاثر ہو جاتا ہے۔ کوئی گھر کا واحد کفیل اور کوئی کسی کا اکلوتا بیٹا ہوتا ہے ان کے دلوں پر پیاروں کی جدائی کس قدر اذیت ناک ہوتی ہے یہ وہی زیادہ بہتر جان سکتے ہیں۔

ہڑتال کے دنوں میں میں بہت احتیاط برتتا ہوں' صبح سویرے باہر نہیں جاتا' دیر سے رکشہ گھر سے لے کر نکلتا ہوں تاکہ صبح کے وقت میں جو وقفے وقفے سے گولیاں چلتی رہتی ہیں' ان سے محفوظ رہا جا سکے اکثر رکشہ ڈرائیور اسے میری بزدلی قرار دے کر مذاق اڑاتے ہیں حسب معمول آج بھی میں تاخیر سے اسٹاپ پر پہنچا تھا۔

''کیوں بھئی اتنی دیر کیسے ہوگئی۔'' نجم الدین نے کہا۔

''ہڑتال ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہڑتال میں ہی موقع ہوتا ہے زیادہ کمانے کا' پچاس روپے کی جگہ سواری ایک سو پچاس یا دو سو

روپے آسانی سے دے دیتی ہے۔ عام دن میں اتنے پیسے سواری سے لے کر دکھاؤ' میں تمہیں مان جاؤں۔'' توصیف نے کہا۔

''صبح ہی صبح دو ہزار روپے کما لیے ہیں۔'' نجم الدین نے پیسے دکھائے۔

''میں نے ہزار روپے کما لیے ہیں۔'' توصیف نے کہا۔

''ہاں ہاں مجھے معلوم ہے اور پورا یقین ہے کہ تم نے اتنے کما لیے ہوں گے' میں بھی اتنے کما لیتا ہوں لیکن میں کیوں رسک لوں جب اللہ تعالیٰ مجھے بغیر رسک لیے دے رہا ہے پھر میں اس کا فائدہ نہ اٹھاؤں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا وہ میری بات پر زوردار قہقہے لگانے لگے۔

''بھئی تمہاری سوچ پر ہم کوئی تبصرہ نہیں کر سکتے۔''

''بھائی! سول اسپتال پہنچا دو۔'' ایک کمزور سی آواز پر میں چونکا۔

وہ کمزور سی خاتون تھی' ایک چھوٹی لڑکی اس کے ساتھ تھی۔ خاتون نے اپنے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا اس لیے میں اس کی صورت نہ دیکھ سکا۔

''پیسے مناسب لے لینا' میں زیادہ پیسے نہ دے سکوں گی۔'' وہ بولی۔

''بے فکر رہو میں مناسب پیسے ہی لیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ رکشہ میں بیٹھ گئی' میرا رکشہ تیزی سے دوڑ رہا تھا' راستے میں جگہ جگہ سڑک پر پتھر پڑے تھے کہیں ٹائر جل کر بجھ چکے تھے۔ سڑک پر ٹریفک برائے نام ہی تھا۔ لڑکے سڑکوں کو کھیل کا میدان سمجھ کر کرکٹ کھیل رہے تھے' ہڑتال میں اتنا طویل سفیر نہیں کرتا تھا لیکن اس عورت کی آواز میں اتنا درد تھا کہ میں انکار کی جرأت نہ کر سکا اور ہامی بھر لی۔

عورت کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی' اسے بڑی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ چھوٹی لڑکی بھی بار بار اس عورت کو دیکھ رہی تھی' عورت نے اپنا سر رکشہ کی بیک سے لگا لیا' مجھے رکشہ میں لگے آئینہ میں سے وہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی خراب طبیعت کو دیکھ کر مجھے تشویش ہو رہی تھی' اس حالت میں بھی اس کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا۔ عورت نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں' اس کے چہرے پر پڑا نقاب بھی سرک کر نیچے ہونے سے اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چہرہ بیمار زدہ ضرور تھا مگر اس کے نقوش دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا یہ چہرہ میرا دیکھا بھالا ہے' ذہن پر تھوڑا زور ڈالنے پر مجھے یاد آیا کہ یہ مازیہ تھی' اسے میں کس طرح بھول سکتا ہوں۔ وہ میری خالہ کی بیٹی تھی ہم بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ بڑے ہونے پر بھی ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے اور ان ملاقاتوں میں مستقبل کے سہانے خواب دیکھا کرتے تھے۔ دونوں خاندانوں کی بھی یہی خواہش تھی کہ جیسے ہی میری تعلیم مکمل ہو ہم دونوں کی شادی کر دی جائے۔ میں اپنی قسمت پر بہت خوش ہوتا تھا جو مجھے بچپن سے پسند ہے وہ میری شریک حیات بنے گی' قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے' جب ہمارے حالات خراب ہوئے' خالہ بھی بدل گئی تھیں' اس ڈر سے کہ کہیں ہم ان سے مالی امداد کا تقاضا نہ کر دیں انہوں نے ہمارے گھر آنا ہی چھوڑ دیا تھا کبھی کسی تقریب میں ملاقات ہونے پر بھی مصروفیت کا بہانہ بنا کر اپنی جان چھڑا لیتی

تھیں۔ مازیہ بھی مجھ سے کھنچی کھنچی رہتی تھی۔ میں بھی انسان تھا' اس کے بدلے رویے سے صاف محسوس کرسکتا تھا اس سے ملاقات ہونے پر اس کی باتوں میں جو خلوص ہوا کرتا تھا وہ اب نہیں ہوتا تھا اس بات کا مجھے بہت دکھ تھا کہ کیا سارے رشتے ناتے پیسے کے دم سے ہوتے ہیں' احساسات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی' ان ہی دنوں سنا کہ مازیہ میرے ہی ایک کزن ارمغان سے خوب ملاقاتیں کررہی ہے' اکثر موٹر سائیکل پر گھومنے بھی جاتی ہے یہ بات سن کر میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی میں یہ کس طرح برداشت کرسکتا کہ جو لڑکی میرے نام سے منسوب ہو وہ کسی اور کی ہوجائے۔ وقتی طور پر ہمارا برا وقت ضرور آ گیا تھا لیکن یہ وقت تبدیل بھی ہوسکتا تھا میں دن رات محنت کررہا تھا' میرے چھوٹے بہن بھائی پڑھ رہے تھے جب ان کی تعلیم مکمل ہوجائے گی پھر کیسے ہمارے حالات تبدیل نہیں ہوتے۔ گھر پہنچنے پر میں نے مازیہ کو فون کیا' اس نے میری کال کاٹ دی' کئی بار کال کرنے پر اس نے کال اٹینڈ کرلی۔

''کیا بات ہے شہریار! کیوں تنگ کررہے ہو۔'' اس کی غصے بھری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''تم سے صرف کچھ باتیں پوچھنا ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں ذرا جلدی پوچھو' مجھے ارمغان کے ساتھ کہیں جانا ہے۔'' مازیہ ناگواری کے انداز میں بولی۔

''میں نے سنا ہے کہ تم آج کل ارمغان کے ساتھ بہت زیادہ گھوم پھر رہی ہو۔''

''ہاں میں اس کے ساتھ گھوم رہی ہوں پھر......''

''مازیہ تم مجھ سے منسوب ہوکر اس کے ساتھ گھوم رہی ہو۔'' میں نے کہا۔

''منسوب تھی اب نہیں ہوں' مجھے میرے خوابوں کا شہزادہ مل گیا ہے اور عنقریب ہم دونوں کی شادی ہونے والی ہے۔''

''مازیہ وہ اچھا لڑکا نہیں ہے' میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تم اس کے جال میں کس طرح پھنس گئی ہو۔'' میں نے اسے سمجھانا چاہا۔

''تمہارے کہنے کے مطابق وہ لڑکا خراب ہے تو میں کیا کروں۔'' مازیہ نے کہا۔

''تم اس سے ہوشیار رہو' میری غریبی اگر ہم دونوں کے درمیان آرہی ہے تو وہ ہمیشہ نہیں رہے گی۔ ہمارے حالات پھر ویسے ہی ہوجائیں گے۔''

''مجھے تمہاری غریبی یا امیری سے کوئی غرض نہیں ہے' میں ارمغان کو پسند کرنے لگی ہوں اور اس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔''

''دیکھو مازیہ! تم میرے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی ہو تو نہ کرو لیکن اپنا مستقبل تاریک مت کرو' وہ تمہیں دھوکہ دے رہا ہے تمہاری زندگی تباہ و برباد کردے گا۔''

''ہر انسان اپنا اچھا برا خوب جانتا ہے' تمہیں میرے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے مازیہ نے کال کاٹ دی۔

مجھے جو تھوڑی بہت امید تھی وہ بھی اس گفتگو کے بعد دم توڑ گئی اور میں سمجھ گیا تھا کہ ہم دونوں اس زندگی میں اب کبھی نہیں مل سکیں گے۔ ارمغان کو میں بہت اچھی طرح جانتا تھا وہ اچھے کردار کا

مالک نہیں تھا' میں خالہ سے بھی ملا مگر وہ بھی اس رشتے پر راضی تھیں۔ اس لیے انہوں نے میری باتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا' میں خود حالات کا مارا تھا میری کون سنتا۔ اس سبب خاموشی اختیار کرلی چند ماہ گزرنے پر مازیہ اور ارمغان کی شادی ہوگئی' میں اس شادی میں شریک ضرور تھا لیکن غیروں کی طرح مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ملی کہ اس کی زندگی کیسے گزر رہی ہے اور معلوم بھی کیسے ہوتا سارا دن میں رکشہ چلاتا رہتا تھا' رات گئے لوٹنے پر اتنا تھک جاتا ہے کہ بستر پر پڑتے ہی سوجاتا تھا۔ میرا دل ٹوٹ چکا تھا اور میں اس سے متعلق یادوں کو بالکل ہی بھلا چکا تھا' اس لیے میں نے کسی سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی بھی سنجیدگی سے کوشش نہیں کی تھی۔

''مازیہ کیسی ہو؟'' بے اختیار میرے منہ سے نا چاہتے ہوئے بھی یہ جملہ نکل گیا۔

ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے دل کے کسی گوشے میں ابھی مازیہ کے لیے درد موجود تھا' اس لیے میں اسے اس حالت میں دیکھ کر تڑپ گیا تھا۔

''شہریار......! تم شہریار ہو؟'' مازیہ نے میری آواز سن کر آنکھیں کھول دیں۔

''ہاں میں شہریار ہوں' کیا ہوا ہے تمہاری طبیعت کو؟'' میں نے پوچھا۔

''میری طبیعت ان دنوں اچھی نہیں ہے۔''

''کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ نا۔'' میں نے کہا۔

''اچھے ڈاکٹر کے لیے اچھے پیسے بھی ہونے چاہئیں' میرے پاس پیسے کہاں؟''

''کیوں ارمغان تمہیں دبئی سے پیسے نہیں بھیجتا۔''

''وہ کنگلا کہاں سے پیسے لائے گا' شادی سے پہلے جو خرچہ کیا وہ بھی نا جانے کس' کس سے پیسے ادھار لے کر خرچہ کرتا رہا تھا وہ امی نے قرض داروں کے شور کرنے پر چکائے۔ شادی کرکے ہمارے مقدر ہی پھوٹ گئے' میرے شور کرنے پر وہ دو دن کام پر جاتا اور چار دن گھر بیٹھ کر کھاتا تھا۔

ایک دن زیادہ شور کرنے پر اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اب دل لگا کر محنت کرکے کمائے گا' ایک ہفتے وہ مسلسل کام پر جاتا رہا' پھر نا جانے اس کے دل میں کیا سمائی اسے ملک سے باہر جانے کا شوق پیدا ہوا' کسی شخص نے اس کے باہر جانے کے اخراجات اپنے ذمہ لے لیے تھے میں بھی حیران تھی کہ اس اجنبی شخص کو ارمغان سے کیا دلچسپی ہے جو باہر بھجوانے پر سارے اخراجات خود اٹھا رہا ہے جس دن وہ دبئی جارہا تھا بہت خوش تھا' اتنا خوش میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں بھی خوش تھی کہ اچھا ہے وہ دبئی جاکر اتنا کما لائے گا کہ ہم اپنی زندگی سکھ چین کی گزار لیں گے لیکن قسمت کا لکھا کس کو پتا ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ دبئی میں اس کے بیگ سے ہیروئن برآمد ہونے پر وہ گرفتار کرلیا گیا۔ دبئی ایئر پورٹ پہنچنے سے پہلے اس نے کال کرکے بتایا تھا کہ وہ میرے لیے ایک لفافہ چھوڑ گیا ہے وہ دیکھ لے' جب میں نے وہ لفافہ کھولا اس میں ایک خط اور کچھ کاغذات نکلے' خط میں لکھا تھا کہ وہ میرے روز روز کے طعنے سن کر بے زار ہوچکا ہے اس لیے وہ اپنی اچھی اور خوش گوار زندگی گزارنے دبئی جارہا ہے ہمیشہ کے لیے اس خط کے ساتھ جو کاغذات تھے وہ دراصل طلاق نامے کے کاغذات تھے اس نے مجھے اپنی

زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد کردیا تھا۔"
"کیا...... تمہیں طلاق ہوگئی ہے لیکن یہ بات خاندان میں کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔" میں نے کہا۔
"یہ بات امی نے چھپائی ہوئی ہے وہ نہیں چاہتیں کہ ہماری جو رہی سہی عزت ہے وہ داغدار ہوجائے۔ خاندان میں سب نے ہی اس رشتے کی مخالفت کی تھی' صرف میری ضد کے سبب یہ شادی ہوئی تھی اس لیے طلاق کو چھپایا گیا ہے اور سب کو یہی بات بتائی ہے کہ ارمغان میرے اچھے مستقبل کے لیے دبئی گیا ہوا ہے۔"
"اوہ یہ تو تمہارے ساتھ بہت برا ہوا۔" میں نے کہا۔
"لالچ...... لالچ انسان کی عقل کو کھو دیتا ہے میں بھی امی کے کہنے میں آ کر جو وہ کہتی گئیں میں کرتی گئی۔ میری شادی کی ضد اور امی لالچ میں آ گئی تھیں جس کا انجام یہ ہوا ہے کہ امی کے گھر پر پڑی ہوئی ہوں' سوچ سوچ کر بیمار رہنے لگی ہوں۔"
"ہاں ایسے حالات میں سوچیں ہی آتی ہیں' اس کا حل یہی ہے کہ انسان خود کو مصروف کرلے ورنہ سوچیں انسان کو وقت سے پہلے ہی بوڑھا کردیتی ہیں میری مثال تمہارے سامنے ہے کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا تھا' میرے ہمت ہارنے پر سب کچھ ختم ہوجاتا۔ میں نے ہمت پکڑی اور گھر کا بوجھ اپنے کاندھوں پر رکھ لیا' جس کا نتیجہ یہ نکلا چھوٹے بھائی کو انجینئرنگ کی اور بہن کو ڈاکٹری کی ڈگری ملنے والی ہے۔" میں نے کہا۔
"ہاں شہریار! تم بہت باہمت ہو' تم نے جو قربانی دی اس کا اللہ تعالیٰ نے صلہ بھی دے دیا ہے۔" اس نے کہا۔

سول اسپتال آجانے پر میں مازیہ کو لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا' اس نے ڈاکٹر سے چیک اپ کرا کے اسٹور سے دوائیاں لیں اور آ گئی۔ میں اسے رکشے میں بٹھا کر لے آیا اور خالہ کے گھر چھوڑ دیا' مازیہ نے مجھے کرایہ دینے کی کوشش کی مگر میں نے کرایہ نہیں لیا۔
میرے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ ان دنوں مازیہ شدید بیمار ہے ورنہ میں ضرور اس کی عیادت کو جاتا اب جب کہ مجھے اس کی بیماری کا علم ہوچکا تھا اس لیے عیادت کو جانا میرا فرض بن گیا تھا۔ میں وقتاً فوقتاً مازیہ کی عیادت کرنے کو جانے لگا تھا' وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوجاتی تھی' خالہ بھی میری آؤ بھگت کرنے لگی تھی' میرے منع کرنے پر کھانے کی کئی چیزیں لاکر رکھ دیتی تھیں۔
میں خالہ کے اچانک مہربان ہوجانے پر بہت حیران تھا' مازیہ بھی جو برسوں کی بیمار لگتی تھی اس کی طبیعت تیزی سے بہتر ہونے لگی تھی۔ دو ہفتوں میں ہی وہ پہلے کی طرح تروتازہ دکھائی دینے لگی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اسے کوئی بہت بڑی خوشی ملی ہو' میں نے خود ہی حیران ہونے سے بہتر سمجھا کہ اس سے ہی پوچھ لیا جائے کہ اسے کیا خوشی مل گئی ہے۔
"مازیہ! ماشاء اللہ سے تم جلد صحت یاب ہوگئی ہو' لگتا ہی نہیں ہے کہ تم شدید بیمار تھیں۔ ایسی کیا خوشی مل گئی ہے جو تم اتنا خوش ہو۔" میں نے کہا۔
"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو' خوشی ایسی چیز ہے جو انسان کو بہت جلد صحت یاب کردیتی ہے۔" مازیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"مجھے بھی بتاؤ ایسی کیا خوشی ملی ہے۔" میں نے اسے چھیڑا۔
"وقت آنے پر سب پتا چل جائے گا۔" وہ زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔
"تمہاری مرضی مت بتاؤ۔" میں نے کہا۔
مازیہ کی خوشی کے پیچھے کوئی بات ضرور تھی شاید کوئی اچھا رشتہ آ گیا ہوگا' اس خوشی میں پھولے نہیں سما رہی تھی۔ آج نہیں تو کل ضرور یہ بات کھل جانی تھی اس لیے میں خاموش تھا۔ خالہ کے گھر جاتے ہوئے دو ماہ ہوچکے تھے لیکن ابھی تک مازیہ کے رشتے کے حوالے سے کوئی بات سننے میں نہیں آئی تھی۔ امی کو میرے خالہ کے گھر جانے کا علم تھا' ان کے چہرے سے محسوس ہوتا تھا کہ انہیں میرا وہاں جانا اچھا نہیں لگتا لیکن وہ زبان سے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ خالہ کا جو رویہ ماضی میں رہا تھا اس کا مجھے بھی دکھ تھا' بحیثیت رشتہ دار میرا یہ فرض بن گیا تھا جب تک مازیہ مکمل صحت یاب نہ ہوجائے ان کے گھر اس کی عیادت کرنے جاتا رہوں۔ خالہ اور مازیہ کی مجھ پر مہربانیاں بڑھ رہی تھیں' میرا شدت سے انتظار کیا جاتا تھا چند دن نہ جانے پر کبھی خالہ اور کبھی مازیہ موبائل پر کال کر کے شکایتی لہجے میں گھر نہ آنے کا پوچھتی تھیں اور مجھے مجبوراً گھر جانا پڑ جاتا تھا۔
ایک دن جب میں خالہ کے گھر گیا مازیہ توقع سے زیادہ خوش دکھائی دے رہی تھی اس کے ہاتھوں میں ٹیسٹ رپورٹ تھیں۔
"خیریت ہے اتنی رپورٹس کس کے لیے جمع کر کے رکھی ہوئی ہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔
"یہ میری رپورٹس ہیں ان کے مطابق میں بالکل فٹ ہوں' مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔" اس نے کہا۔
"یہ بڑی خوشی کی بات ہے پھر اس خوشی میں مٹھائی کہاں ہے۔" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔
"امی شہریار صحت یابی کی خوشی میں مٹھائی کا تقاضا کررہے ہیں۔" مازیہ نے زوردار آواز لگائی۔
"شہریار مٹھائی کا تقاضا کرے اور اسے مٹھائی نہ ملے ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔" خالہ مٹھائی کا ڈبہ لیے کمرے میں داخل ہوئیں۔
"لو منہ میٹھا کرلو۔" مازیہ نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔
"ہاں ہاں بھئی میں ضرور منہ میٹھا کروں گا لیکن میری یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں مٹھائی مانگوں گا۔"
"یہ فطری بات ہے خوشی کے موقع پر جو عزیز ہوتے ہیں وہ مٹھائی کا تقاضا ضرور کرتے ہیں۔" مازیہ نے کہا۔
"ہاں یہ بات تو ہے۔" میں نے مٹھائی کھاتے ہوئے کہا۔
"یہ ساری کی ساری مٹھائی تمہیں ہی کھانی ہے۔" مازیہ نے کہا۔
"ارے باپ رے میں اتنی ڈھیر ساری مٹھائی کس طرح سے کھا سکتا ہوں' میں جن نہیں انسان ہوں۔"
"کیا جن ڈھیر ساری مٹھائی کھاتے ہیں؟" مازیہ نے پوچھا۔
"پتا نہیں سنا ہے کہ رات میں جنات مٹھائی کی دکانوں سے مٹھائی خرید کر لے جاتے ہیں' وہ کھاتے ہی ہوں گے جبھی مٹھائی خرید کر لے جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ میری بات پر مسکرا کر رہ گئی' خالہ کمرے سے جا چکی تھی' کمرے میں ہم دونوں ہی تھے۔

"شہریار کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم دونوں ساری زندگی یونہی ہنستے مسکراتے زندگی گزار دیں۔" ماز یہ نے کہا۔

"ناممکن......" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں؟" وہ چونکی۔

"زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں تو پھر ہم جلد زندگی سے اکتا جائیں گے' خوشی کی بڑی سے بڑی خبر پر کوئی مسرت نہیں ہوگی' دکھ اور سکھ دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہنے سے زندگی اچھی لگتی ہے اور چھوٹی سی خبر پر ہم بہت خوش ہو جاتے ہیں۔"

"میں کچھ اور بات کہنا چاہ رہی تھی۔" وہ بولی۔

"بولو' میں سن رہا ہوں۔" میں اسے خاموش دیکھ کر بولا۔

"میں سوچ رہی ہوں قسمت نے ہمیں پھر ملا دیا ہے' ہمیں اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شادی کر لینی چاہیے۔" ماز یہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے ماز یہ کی بات سن کر بری طرح سے جھٹکا لگا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"کیوں میں نے کوئی غلط بات کہہ دی' امی کی بھی خواہش ہے اور تم بھی مجھے بچپن سے پسند کرتے ہو پھر اس میں حرج ہی کیا ہے۔"

"ماز یہ حرج ہے جبھی کہہ رہا ہوں' ایسا اب ممکن نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟" اس کے چہرے پر ایک کرب کی لہر آ گئی تھی۔

"تم نائلہ کو جانتی ہی ہو' میری اس سے منگنی ہو چکی ہے۔"

"منگنی ٹوٹ بھی سکتی ہے۔" وہ بولی۔

"ہاں منگنیاں ٹوٹ جایا کرتی ہیں لیکن یہ منگنی نہیں ٹوٹ سکتی۔" میں نے ایک سرد آہ بھری۔

"کیوں؟ شہریار کیوں یہ منگنی نہیں ٹوٹ سکتی۔" ماز یہ نے میرا شانہ پکڑ کر جھنجوڑا۔

"ماز یہ جب تمہاری شادی ہوئی تھی میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا' نائلہ مجھے پسند کرتی تھی میری تم سے منگنی ہو جانے پر وہ مجھ سے محبت کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ تمہاری شادی ہو جانے پر اس نے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے سہارا دیا اور میں نے خود کو سنبھال لیا میں اتنا کم ظرف نہیں ہوں کہ جس نے میرے بُرے حالات میں قبول کیا اسے حالات بہتر ہو جانے پر ٹھکرا دوں۔ نائلہ میری زندگی ہے اور میں کسی قیمت پر اسے نہیں چھوڑوں گا۔" یہ کہتے ہوئے میں ماز یہ کا جواب سنے بغیر ہی اٹھ گیا' جانے سے پہلے میں نے ایک لمحے کے لیے اسے پلٹ کر دیکھا ضرور تھا' اس کے چہرے پر دنیا بھر کی حسرت موجود تھی اور آنکھوں میں ایک آس تھی مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی کیونکہ مجھے ٹھکرائے جانے کے دکھ کا احساس تھا اور وہ دکھ میں کسی قیمت پر نائلہ کو دینا نہیں چاہتا تھا۔

O

انتقام

ریاض بٹ

محبت اور نفرت دو ایسے جذبے ہیں جو عموماً انسان کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں سلب کر لیتا ہے اور بندہ بس اپنے مؤقف اور سوچ کو ہی درست قرار دیتا ہے۔ اگر وہ محبت کے جھیٹے میں ہو تو اسے اپنے محبوب کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور اگر وہ نفرت کا شکار ہو تو انتقام خون بن کر اس کی رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔

کچرے کے ڈھیر پر آنکھ کھولنے والے ایک نوجوان کی کتھا انسپکٹر خالد کی زبانی

وہ ایک سو بستروں کا پرائیوٹ اسپتال تھا۔ بہت خوبصورت عمارت تھی جہاں صفائی ستھرائی کا معیار اعلیٰ تھا البتہ کافی مہنگا اسپتال تھا' غریب آدمی اسے صرف دور سے دیکھ ہی سکتا تھا یہاں علاج کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک پرانا واقعہ یا لطیفہ سنا دیتا ہوں۔ ایک بڑے سے گاؤں میں ایک دفعہ وزیر صحت صاحب تشریف لے گئے اور گاؤں کے چوہدری صاحب سے لوگوں کی صحت کے متعلق پوچھا۔

چوہدری صاحب نے کہا' پچھلے کچھ ماہ میں صرف ایک بندہ فوت ہوا ہے۔

"وہ بدنصیب کون تھا؟" وزیر صحت نے استفسار کیا۔

"بیچارہ ایک ڈاکٹر تھا' جو فاقے کرنے سے مر گیا۔"

لیکن قارئین! ہم اس وقت جس لیڈی ڈاکٹر کی لاش کے پاس کھڑے تھے' وہ فاقے سے نہیں مری تھی۔ بلکہ اسے قتل کیا گیا تھا۔ سارے اثرات زہر کے تھے' ہونٹ نیلے ہو گئے تھے۔

لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کے بعد میں اسی کمرے میں بیٹھ گیا۔ یہ کمرہ مقتولہ کا تھا۔ آج کل وہ رات کی ڈیوٹی پر تھی' رات کی ڈیوٹی میں اس کے ساتھ چھ سات نرسیں اور پانچ میل ڈسپنسر بھی تھے۔ مقتولہ کا کمرہ الگ تھلگ تھا۔

میں نے دو نرسوں کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ پریشان اور غم زدہ تھیں۔

"بی بی......" میں نے ایک نرس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگوں کو کس طرح پتہ چلا کہ شازیہ (مقتولہ) مری پڑی ہے۔"

"تھانیدار صاحب! آج کل ہمارے اسپتال میں زیادہ تر خواتین داخل ہیں۔ اس لیے شازیہ صاحبہ رات کی ڈیوٹی پر ہوتی ہیں' مرد مریض دو تین ہی ہیں۔ ہم ہی انہیں دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ اپنے کمرے میں ہی ہوتی ہیں۔ اگر کسی مریض کی زیادہ طبیعت خراب ہو تو ہم انہیں بلا لیتے ہیں۔ اس وقت صبح کے پانچ بجے ہوں گے جب اچانک ایک مریضہ کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی...... نگہت......" اس نے دوسری نرس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "انہیں بلانے گئی اور......"

اس نے ایک جھرجھری سی لی اور خاموش ہوگئی۔

میں نے نگہت کی طرف دیکھا۔ تو اس نے سر ہلا کر اس بات کی تصدیق کر دی۔ اس طرح لاش

دریافت ہوئی اور ہمیں اطلاع دی گئی۔ یہاں میں اس بات کی وضاحت کردوں کہ یہ اسپتال کبیر خان نامی ایک پٹھان کی ملکیت تھا...... آج کل وہ اپنے گاؤں گیا ہوا تھا...... اس سے ابھی تک رابطہ نہیں ہوسکا تھا۔ وہ موبائل کا دور تو تھا نہیں، صرف ٹیلیفون کی سہولت موجود تھی۔

اس وقت دن کی ڈیوٹی والا عملہ بھی آچکا تھا۔ لیکن میں نے رات والے عملے کو ابھی تک روکا ہوا تھا۔

میں نے کافی مغز کھپائی کی لیکن دونوں نرسوں سے اور بعد میں باقی عملے سے پوچھ گچھ کے بعد کوئی سراغ ہاتھ نہیں لگا تھا۔

میرے ساتھ دو سپاہی بھی آئے تھے۔ جن کو میں نے لاش کے ساتھ بھیج دیا تھا۔

ابھی میں اسپتال سے رخصت ہونے ہی لگا تھا کہ ایک ڈسپنسر بوکھلایا ہوا آیا اور جلدی جلدی بتانے لگا۔ ''تھانیدار صاحب جلدی آئیں...... ایک مریض غائب ہے۔''

پھر وہ مجھے ایک وارڈ میں لے گیا۔ وہاں سے ایک مریض غائب تھا۔ اس نے اپنا نام رجسٹر میں رمضان لکھوایا تھا۔ اسے گردے کی تکلیف تھی اور وہ پچھلی رات ہی داخل ہوا تھا۔ کوئی بھی تسلی بخش جواب نہ دے سکا کہ وہ کس وقت غائب ہوا...... البتہ اتنا بتایا گیا کہ وہ رات بارہ بجے آیا تھا، درد سے کراہ رہا تھا، لیڈی ڈاکٹر شازیہ نے اسے چیک کیا تھا اور گلوکوز کی بوتل لگانے کے لیے کہا تھا۔ صبح اس کے ایکسرے اور باقی ٹیسٹ ہونے تھے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ وہ اکیلا آیا تھا۔

گلوکوز کی بوتل خالی ہوگئی تھی، صرف چند قطرے رہ گئے تھے۔ جس بیڈ پر وہ لیٹا تھا، اس کے ساتھ ہی اسٹینڈ پر گلوکوز کی خالی بوتل ٹنگی ہوئی تھی۔ سوئی نیچے لٹک رہی تھی۔

حساب لگا کر بتایا گیا کہ بوتل تقریباً ساڑھے تین چار بجے خالی ہوئی ہوگی اور یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ ہر کوئی اونگھ رہا ہوتا ہے۔

لاش کے پاس مجھے کسی قسم کا سراغ نہیں ملا تھا۔ فرش پکا تھا، مجھے یہ شک تھا کہ مقتولہ کو زہر کا ٹیکہ لگایا گیا ہے، لازمی نہیں تھا کہ فرار ہونے والا مریض ہی قاتل ہوتا۔ لیکن شک تو بہرحال اس پر جاتا تھا۔

رجسٹر میں پتہ بھی لکھا ہوا تھا۔ جو میں نے اپنے پاس نوٹ کرلیا اور اسپتال سے اٹھ کر تھانے میں آگیا۔ یہاں اے ایس آئی ابرار میرے کمرے میں میرا منتظر تھا۔ یہ جون کے آخری ایام تھے۔ کچھ دیر کے بعد ہم ستو کے شربت سے گرمی کا علاج کررہے تھے۔ میں نے آتے ہی تمام باتیں اے ایس آئی کے گوش گزار کردی تھیں۔ میں نے کاغذی کارروائی مکمل کرلی تھی۔ پھر ہمارے درمیان اس کیس پر بحث شروع ہوگئی۔

''سر...... اب کیا ارادہ ہے؟''

''دیکھو بھئی، اس کیس میں ہمیں ذرا ایڈوانس چلنا پڑے گا۔''

''کیا مطلب سر؟''

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے سے پہلے ہی کارروائی کرنی پڑے گی۔ میں نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے سر، جو حکم......'' اس نے مودب لہجے میں کہا۔

''ایک مخبر کو کسی بھیس میں اسپتال بھیج دو، اس نے وہاں مقتولہ کے متعلق معلومات حاصل کرنی ہیں۔

ویسے میں نے دن اور رات کی ڈیوٹی سرانجام دینے والے سارے عملے کو پابند کردیا ہے کہ وہ تھانے میں بتائے بغیر کہیں نہ جائیں۔'' میں نے چند لمحے توقف کیا تھوک نگلا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے گویا ہوا ''مفرور مریض کو ڈھونڈو۔''

پھر میں نے مفرور مریض کا حلیہ اچھی طرح اس کے ذہن نشین کروادیا۔

وہ مجھے سلام کرکے چلا گیا اور میں کاغذات کی طرف متوجہ ہوگیا۔

مقتولہ کسی اور شہر کی رہنے والی تھی۔ وہاں اسپتال کا ایک بندہ اطلاع دینے گیا ہوا تھا۔

شام کو ایک مرد اور ایک عورت تھانے میں آئے۔ دونوں رو رہے تھے۔ مقتولہ ان کی واحد اولاد تھی، میں نے انہیں بٹھایا۔ ٹھنڈے مشروب سے ان کی پیاس بجھائی، لیکن ان کے اندر جو غم کی بھٹی جل رہی تھی وہ بار بار آنسوؤں کی صورت میں اپنا دھواں چھوڑ رہی تھی۔

اس وقت میں انہیں صرف تسلی دلاسہ ہی دے سکتا تھا۔ وہ میں نے دینے کی کوشش کی، بڑی مشکل سے انہوں نے چند باتوں کا جواب دیا۔

ابھی میں ان کو مزید کریدنا چاہتا تھا، وہ غم سے نڈھال تھے...... وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ ہمیں بیٹی کی لاش کب ملے گی؟

میں نے انہیں کل دوپہر تک آنے کا کہا۔ وہ چلے گئے۔

تھانیدار کو پتھر بننا پڑتا ہے۔ ورنہ وہ تھانیداری نہیں کرسکتا، اگلے دن گیارہ بجے کے قریب لاش اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آگئی۔

والدین کو کب صبر آسکتا تھا، وہ دس بجے کے آئے بیٹھے تھے۔ میں نے کاغذی کارروائی مکمل کرکے لاش ان کے حوالے کردی اور قتل کی جو رپورٹ میں نے پہلے اپنے طور پر ان کے نام سے لکھی تھی، ان پر بھی ان کے دستخط کروالیے۔ یہ قانونی تقاضے ہوتے ہیں۔ میں زیادہ ان میں آپ کو نہیں الجھاؤں گا۔

بہرحال پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے میرے بیشتر اندازوں پر تصدیق کی مہر ثبت کردی۔

مقتولہ کو زہر کا ٹیکہ لگایا گیا تھا، گردن پر سوئی کا نشان تھا۔ زہر بہت سریع الاثر تھا، آگے زہر کا نام بھی لکھا تھا۔ جو میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ مرنے کا ٹائم چار اور پانچ بجے کے درمیان لکھا تھا۔ جس زہر کا ذکر کیا گیا تھا، وہ ایسا تھا جو دس منٹ کے اندر اندر انسان کی جان لے سکتا تھا۔

بہرحال اب مجھے قاتل کو ڈھونڈنا تھا، یہی میری ڈیوٹی تھی۔ جو معلومات تھوڑی بہت مجھے مقتولہ کے والدین سے حاصل ہوئی تھیں، ان کا ذکر آگے آئے گا۔

اس دن اس کیس کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی، سوائے اس کے کہ مخبر نے مقتولہ کے متعلق معلومات سے مجھے آگاہ کردیا، ان معلومات میں (وہ معلومات جو مقتولہ کے والدین سے حاصل ہوئی تھیں) ملا کر مختصراً آپ کی خدمت میں پیش کردیتا ہوں۔

مقتولہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی، اس لیے ان کی خواہش تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ پڑھے، ان کے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی، پھر مقتولہ لائق تھی۔ ہر امتحان اس نے امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ وہ اپنی دھن میں مگن تھی، اس لیے اس نے کسی اور طرف توجہ ہی نہیں دی۔ نہ اس کا کسی کے ساتھ کبھی کوئی افیئر بنا۔ آخر اس نے ایم بی بی ایس کا امتحان بھی امتیازی نمبروں سے پاس کرلیا۔ کبیر خان مقتولہ کے والد کا

دوست تھا۔ وہ اسی انتظار میں تھا کہ جونہی شازیہ ایم بی بی ایس کرے اسے اپنے اسپتال میں رکھ لے۔

اس طرح شازیہ (مقتولہ) اس اسپتال میں آ گئی۔ اور اسے یہاں آئے ہوئے تین سال ہو گئے تھے۔

کچھ بچے ایسے بھی ہوئے ہیں' جو فطری تقاضوں کو دبا کر اپنے آپ کو صرف اپنے مقصد کے حصول کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ شازیہ (مقتولہ) بھی ایسی ہی تھی۔

اسپتال میں بھی اس کا کسی قسم کا چکر نہیں تھا۔ بہر حال ایک بات تھی کہ وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی' کئی ڈاکٹرز اور ایک صنعت کار نے اسے پروپوز کیا تھا۔

لیکن اس نے معذرت کر لی تھی۔

اس کی وجہ کیا تھی؟ یہ ابھی پردے میں تھی۔ وہ قتل ہو چکی تھی۔ البتہ اس کی کوئی وجہ ضرور تھی۔ وہی وجہ ہمیں معلوم کرنی تھی۔ جیسا کہ ذکر آ چکا ہے کہ کبیر خان نے یہ اسپتال بنایا تھا۔ وہ بڑا سخت تھا' ایک ایک پیسہ مریضوں سے وصول کرنے کا حکم دیا ہوا تھا۔ اس کا ایک رشتے دار زمرد خان اس کام پر مامور تھا' وہ ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ سرخ وسفید رنگت کا مالک' البتہ وہ کلین شیو تھا۔ میری اس سے ملاقات ہوئی تھی اس نے بھی مقتولہ کے اخلاق اور کردار کی تعریف کی تھی۔ وہ بھی حیران تھا کہ اتنے اچھے اخلاق کی حامل مسیحا کو کون قتل کر گیا ہے اور وہ بھی ایسے طریقے سے۔

یہ اگلی صبح کی بات ہے...... کہ کبیر خان مجھے ملنے آ گیا۔

رات مقتولہ کو منوں مٹی تلے دبایا جا چکا تھا۔ جب وہ مجھ سے مصافحہ کر چکا تو میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ ڈھے سا گیا' صدمے اور غم سے نڈھال لگتا تھا۔ وہ بھی سرخ وسفید رنگت کا مالک ایک فربہ بندہ تھا۔ دائیں آنکھ کے نیچے موٹا مسہ تھا' عمر چالیس سال سے اوپر لگتی تھی۔ بڑی بڑی مونچھیں' چہرے کو بارعب بنا رہی تھیں۔

''جناب تھانیدار صاحب یہ کیا ہو گیا۔ مجھے لگتا ہے جیسے میری سگی بیٹی یا بہن قتل ہو گئی ہے' ہماری طرف تو یہ نہیں ہوتا' ہم للکار کر بندہ مارتے ہیں یا خود قتل ہو جاتے ہیں۔ یہ تو بہت بزدلانہ کام کیا ہے اس...... کے بچے نے۔'' خان صاحب نے زہریلے لفظوں میں اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔

''اگر وہ میرے ہاتھ آ جائے تو میں......''

میں سمجھ گیا کہ وہ آگے کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس لیے میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''خان...... صاحب' آپ اپنے غصے کو قابو میں رکھیں۔ اس کام کے لیے ہم بیٹھے ہیں اور سرکار ہمیں اس کام کی ہی تنخواہ دیتی ہے۔''

پھر میں دھیرے دھیرے اسے اپنے مطلب کی طرف لے آیا۔

''خان صاحب' جب کوئی بندہ یا بندی قتل ہوتی ہے' تو اس کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

ان آنکھوں میں مجھے بیک وقت غصے اور غم کے ملے جلے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا' پھر گویا ہوا۔

''آپ بالکل بجا بولتا ہے لیکن ہم اس سلسلے میں کوئی وجہ نہیں بتا سکتا۔''

''خیر چھوڑیں' اس بات کو......'' میں نے ایک اور زاویے سے سوال کرتے ہوئے کہا۔

''مقتول اب تک شادی سے گریز کیوں کر رہی

تھی۔''

''تھانیدار صاحب' ہم خود حیران تھا۔ شاید آپ کے علم میں آ چکا ہو' کہ مقتولہ کا باپ میرا دوست ہے' میرا بیٹی اور بیوی نے کئی بار اس سے وجہ پوچھا' لیکن اس نے ہر دفعہ ایک ہی بات کی۔'' وہ خاموش ہوا۔ تو یوں محسوس ہوا' جیسے کائنات کی نبض رک گئی ہو۔

''کونسی بات...... خان صاحب۔'' جب اس کی خاموشی طویل ہوئی تو میں نے استفسار کیا۔

''ابھی دل نہیں کر رہا۔''

''اچھا......'' میں نے ہنکارا بھرا۔ اچانک میں نے ذہن میں اٹھنے والے سوال کو اس کی طرف اچھال دیا۔

''خان صاحب' آپ کے کتنے بیٹے ہیں؟''

''ماشاء اللہ ایک بیٹا ہے...... پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی' یوں محسوس ہوا' جیسے غم کی بدلی سے مسکراتا چاند نکل آیا ہو۔

''جو کچھ آپ کے ذہن میں ہے' میں سمجھ گیا ہوں' میرا بیٹا شادی شدہ ہے' پھر وہ للکار کر وار کرنے والا ہے۔'' پتہ نہیں' اس نے میرے سوال سے کیا مطلب نکالا تھا۔

اس دوران چائے اور سموسے وغیرہ آئے تھے اور ہم نے ان سے دو دو ہاتھ کر لیے تھے۔ اس کے بعد خان صاحب چلے گئے تھے۔ اور مجھے وہیں چھوڑ گئے تھے جہاں میں پہلے ہی سوچوں کے بھنور میں پھنسا ہوا تھا۔

قاتل کا کوئی کھرا کھوج نہیں مل رہا تھا۔ یہاں یہ بات بھی بتا دیتا ہوں کہ مقتولہ کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں کی گئی تھی' لگتا یہی تھا کہ اس وقت وہ شاید سو گئی تھی یا کم از کم اونگھ رہی تھی اور قاتل نے پھرتی سے زہریلے ٹیکے کی سوئی اس کی گردن میں داخل کر دی تھی اور اس وقت تک اسے دبائے رہا ہوگا جب تک اس کی جان نہ نکل گئی ہوگی' وہ وقت ویسے بھی اونگھنے کا تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا اسی وقت سامنے آ سکتا تھا' جب قاتل پکڑا جاتا' زیادہ شک ہمیں مفرور مریض پر ہی تھا۔

اے ایس آئی ابرار کے ذمے میں نے مفرور مریض کو ڈھونڈنے کی ڈیوٹی لگائی ہوئی تھی۔ جو پتہ اس نے لکھوایا تھا وہ غلط ثابت ہو چکا تھا۔

میں نے مفرور مریض کے حلیے کا خاکہ بنا کر مختلف تھانوں میں بھجوا دیا تھا۔

لیکن کسی طرف سے ابھی تک کوئی حوصلہ افزا رپورٹ نہیں ملی تھی۔ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو بیٹھے نہیں تھے۔ مخبر اپنا کام کر رہے تھے۔ جیسا کہ میری پچھلی ایک دو کہانیوں میں ذکر آ چکا ہے کہ میرے موجودہ تھانے کی حدود میں غلہ منڈی بھی آتی تھی......

ایک دن میرا ایک اہلکار وہاں سے ایک بندے کو پکڑ لایا' ساتھ وہاں کا ایک آڑھتی بھی آ گیا تھا۔

دونوں کو میرے کمرے میں لایا گیا' جس بندے کو پکڑ کر لایا گیا تھا اس کو دیکھ کر میں اچھل پڑا۔

یہ بندہ ہمارے بنائے ہوئے خاکے پر بالکل فٹ بیٹھتا تھا۔ صرف ایک فرق تھا' اس کی مونچھیں نہیں تھیں' جبکہ خاکے والے بندے کی مونچھیں تھیں' اس وقت اے ایس آئی ابرار بھی میرے کمرے میں ہی بیٹھا ہوا تھا۔

''جناب...... تھانیدار صاحب' دیکھیں' آپ کے اہلکار کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے' یہ معزز بندہ ہے' کئی سالوں سے یہ ہمارے گاہک ہیں۔ پہلے اس کے والد صاحب آتے تھے' اب چھ سات مہینوں سے یہ

آرہا ہے۔" ابھی ہم بندے کا (جو کہ جوان آدمی تھا عمر تیس سال کے لگ بھگ ہوگی) جائزہ ہی لے رہے تھے کہ ساتھ آیا آڑھتی بول پڑا" اس کو میں جانتا تھا' نام دلاور تھا' ایک دو دفعہ چھوٹے موٹے لڑائی کے کیس میں ضمانتی کے طور پر آیا تھا۔

"دلاور صاحب' اس کا فیصلہ کرنے تو ہم بیٹھے ہیں۔ آپ بھی بیٹھ جائیں...... اور ہمیں اپنا کام کرنے دیں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

وہ بیٹھ گیا۔

میں جوان کی طرف متوجہ ہوگیا' جو حیران پریشان ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"ہاں...... جوان' تمہارا کیا نام ہے؟"

"جی...... فہیم......" اس کی گھبراہٹ برقرار تھی۔

"مونچھوں کا کیا کیا......؟" اے ایس آئی ابرار نے اسے گھورتے ہوئے۔

"جی کیا مطلب......؟" اس نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

زیادہ اداکاری نہ کر' سیدھی طرح بتاؤ۔ اے ایس آئی نے دبکا مارتے ہوئے کہا۔

"جناب آپ کی کوئی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آرہی۔"

دلاور صاحب' آپ جائیں' یہاں کام لمبا لگ رہا ہے۔" میں نے دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جناب میں ہر قسم کی ضمانت دینے کو تیار ہوں۔" وہ ملتجیانہ انداز میں بولا۔

لیکن ہم نے اس کی ایک نہ سنی...... اور اسے چلتا کردیا۔

پھر ہم نے فہیم کو کانسٹیبل کی بیرک میں بٹھادیا اور ایک اہلکار کو زمرد خان کو لانے کے لیے بھیج دیا۔

جب وہ آکر میرے کمرے میں بیٹھ گیا تو میں نے فہیم کو بلالیا۔ جونہی وہ سامنے آیا۔

زمرد خان بے ساختہ چیخ پڑا۔" جناب یہی تھا' مفرور مریض لیکن اس کی مونچھیں......؟"

"اب بتاؤ...... فہیم صاحب' تم نے سنا ہوگا کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ اور تھانے میں تو...... میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

پھر مختصراً ہم نے ساری صورت حال اس کے گوش گزار کردی۔

"جناب...... میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں' مجھے کبھی گردے کا درد نہیں ہوا اور اس لیے ان کے اسپتال میں داخل ہونے اور بعد میں مفرور ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

اس کے چہرے کے تاثرات سے ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔

پھر یہ سب کیا تھا۔ ہم اسے چھوڑنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے تھے' ہم نے اسے فی الحال کانسٹیبل کی بیرک میں بٹھادیا۔

اور زمرد خان کو رخصت کردیا۔

اور سر جوڑ کر بیٹھ گئے' اس طرح شام ہوگئی۔

"سر...... عجیب گورکھ دھندا ہے' کیوں نہ فہیم کو ذرا ڈرائنگ روم کی سیر کروائیں۔" اے ایس آئی ابرار بولا۔

"دیکھو' فی الحال ہمارے پاس اس پر تشدد کا کوئی جواز نہیں ہے۔ نہ ہمارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت ہے۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا کیا جائے سر؟"

ذرا صبح ہونے دو۔" میں نے معنی خیز نظروں سے

اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر ہم نے فہیم کے متعلق اپنے عملے کو ہدایات دیں جس میں یہ بھی شامل تھا کہ اس کے کھانے پینے کا بندوبست کیا جائے اور اسے آرام سے رکھا جائے۔

اور خود اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

دوسری صبح جب میں تیار ہوکر تھانے پہنچا تو مجھے اطلاع دی گئی کہ صبح سویرے سے فہیم کا باپ اور چچا آئے بیٹھے ہیں۔ میں نے فوراً انہیں بلالیا' مجھے اسی بات کی توقع تھی' جس کی طرف شام کو میں نے اشارہ کیا تھا کہ ذرا صبح ہونے دو۔

جب دونوں افراد میرے سامنے آئے تو میں بھونچکا رہ گیا۔

دونوں کی شکلیں آپس میں کافی حد تک ملتی تھیں لیکن سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ ایک شخص کی شکل میں اور فہیم کی شکل میں انیس بیس کا فرق تھا۔ یہ بھی میں نے اندازے سے بتایا ہے' ورنہ دونوں میں عام نظر سے دیکھنے سے کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔

تعارف ہونے پر پتہ چلا کہ وہ فہیم کا باپ تھا' اور دوسرا چچا۔

میں نے انہیں اپنے سامنے بٹھالیا۔

اس وقت میں کمرے میں اکیلا تھا۔

جناب دلاور صاحب نے کل ساری صورت حال ہمیں ٹیلی فون پر بتادی تھی' وہ خود بھی آئیں گے' آپ نے بے گناہ میرے بیٹے کو پکڑا ہوا ہے' جس رات کی آپ بات کررہے ہیں' اس رات فہیم کے دوست ذاکر کی شادی تھی' وہ ساری رات وہاں رہا تھا۔ فہیم کے باپ نے زبان کھولتے ہوئے کہا۔

بزرگو......! کیا خان اسپتال والوں کی آپ کے ساتھ کوئی دشمنی ہے۔" میں نے تیکھی نظروں سے باری باری دونوں بھائیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب...... تھانیدار صاحب؟" چچا نے حیران نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جب سب کچھ دلاور صاحب نے آپ کو بتادیا ہے پھر......" میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ویسے ان کی باتوں سے میری سوچ کے گھوڑے کسی اور طرف جارہے تھے۔

"لیکن جناب' ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ فہیم کا لیڈی ڈاکٹر کے قتل سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ ہماری اس کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں تھی بلکہ میں تو آپ کو اس حد تک یقین دلاسکتا ہوں کہ ہم نے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ چچا نے کسی ماہر اور کینہ مشق وکیل کی طرح بھتیجے کا دفاع کرتے ہوئے لمبی چوڑی تقریر جھاڑدی۔

اچھا...... آپ یہ بتائیں' کہ کیا آپ کا کوئی جڑواں بیٹا بھی ہے۔" میں نے اپنی سوچوں کو زبان دیتے ہوئے کہا۔ مخاطب فہیم کا باپ تھا۔

"نہیں' تھانیدار صاحب' فہیم کے باپ نے فوراً جواب دیا۔ لیکن میری تجربہ کار نگاہیں بھانپ چکی تھیں کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے کیونکہ میرے سوال پر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر چکا تھا۔

"آپ ذرا باہر تشریف رکھیں" میں نے فہیم کے چچا سے کہا۔

وہ حیران نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے باہر چلا گیا۔

فہیم کے باپ کا نام علیم الدین تھا۔

"ہاں تو علیم صاحب...... میرے سوال کا سچ سچ جواب دیں' ورنہ آپ کا بیٹا پہلے حوالات میں بند ہوگا

پھر سیدھا جیل جائے گا' فی الحال ہم نے اسے آرام سے رکھا ہوا ہے۔'' میں نے اسے حالات کی سنگینی سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب' میں آپ کو اپنی غلطی سے آگاہ کردیتا ہوں لیکن میں نے کچھ حد تک اس کا ازالہ کردیا ہے۔ علیم الدین شکست خوردہ لہجے میں بولا لیکن لازمی نہیں ہے' وہی ہو' جو آپ سوچ رہے ہیں' اس کے بعد اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی تھی۔

فی الحال اس کا ذکر مناسب نہیں ہے۔

بعد میں' میں نے فہیم کے چچا کو بلا کر یہ بات سمجھائی تھی' کہ فی الحال ہم فہیم کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اسے حوالات میں بند نہیں کریں گے۔ پھر میں نے ان کی ملاقات کروادی تھی اور انہیں رخصت کردیا تھا۔

اس کیس کا سنسنی خیز موڑ آ گیا تھا۔

میں نے اے ایس آئی ابرار کو بلا کر اسے کچھ ہدایات دیں اور تھانے کے دوسرے کاموں میں مصروف ہوگیا۔

مصروفیت میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور رات کے سائے آہستہ آہستہ دھرتی پر اتر آئے۔

میں ایک سینئر اہلکار کے سپرد تھانے کا انتظام وانصرام کر کے اپنے کوارٹر میں چلا گیا تاکہ تازہ دم ہو کر اگلے دن اس کیس پر کام کرسکوں۔

ویسے مجھے قوی امید تھی کہ یہ کیس ضرور حل ہوگا۔ ابھی تک قتل کی وجہ اندھیرے میں تھی۔ اس بار لگ یہی رہا تھا کہ پہلے قاتل گرفتار ہوگا' پھر وجہ معلوم ہوگی۔ کبھی کبھی ایسے بھی ہوتا ہے۔

ابھی تھوڑا اندھیرا ہی تھا کہ میرے کوارٹر پر دستک ہوئی۔ میں اٹھ چکا تھا اور نماز پڑھ کر ابھی ابھی فارغ ہوا تھا۔ تھانیدار کی زندگی کو لاحق خطرات سے آپ آگاہ ہی ہوں گے۔ میں نے اپنا سروس ریوالور ہاتھ میں لیا اور دروازے کے پاس جا کر تیز آواز میں بولا۔

''کون ہے' بھئی؟'' ریوالور کے دستے پر میرے ہاتھوں کی گرفت مضبوط تھی۔ اور انگلی ٹرائیگر پر تھی۔

لیکن مجھے کسی قسم کی کارروائی ڈالنے کی ضرورت نہیں پڑی' باہر تھانے کا ایک اہلکار تھا' دروازہ کھول کر میں نے اسے اندر بلالیا۔ اور اس سے آنے کا مقصد پوچھا۔

''سر...... ایک حکیم کے قتل کی اطلاع آئی ہے۔ لوگوں نے قاتل کو پکڑ لیا ہے...... وہ دیوار پھاند کر بھاگ رہا تھا کہ حکیم کے پڑوسیوں نے پکڑلیا۔

میں جلدی سے تیار ہو کر اس کے ساتھ تھانے پہنچ گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل دو سپاہیوں کو ساتھ لے کر حکیم کے گھر جا چکا تھا۔ رات کی ڈیوٹی والے یہی کرتے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد قاتل اور لاش تھانے پہنچ گئی۔ قاتل کو دیکھ کر مجھے حیرانگی کا شدید دھچکہ لگا۔

یہ ہو بہو فہیم کا ہم شکل تھا۔ صرف اس کے چہرے پر مونچھوں کا اضافہ تھا۔

جو کارروائی ہم نے کرنی تھی' وہ کی اور قاتل کو حوالات میں بند کردیا۔

حیرانگی کی بات یہ تھی کہ قاتل کے ساتھ کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ میری حیرانگی اس وقت دور ہوئی جب میں قاتل کی زبانی اس کی کہانی سن رہا تھا' لیجیے آپ بھی سنیے۔

'تھانیدار صاحب...... میرا باپ کون ہے......؟ یہ مجھے آج تک نہیں معلوم ہوسکا اور ادھر تھانے میں جو کارروائی ہوئی میں اس سے بھی لاعلم ہوں' جب میں نے ذرا ہوش سنبھالا تو خود کو ایک رحم دل خاتون کی گود میں پایا۔ جسے میں نے اپنی ماں سمجھا' وہ مجھ سے

بہت پیار کرتی تھی' آہستہ آہستہ میں شعور کی منزلیں طے کرتا گیا۔ جب میرے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں بیدار ہوگئیں تو میں نے ماں سے اپنے باپ کے متعلق پوچھا۔ وہ مجھے ٹالتی رہی' ادھر ادھر سے مجھے صرف اتنا پتہ چلا کہ میری ماں نے لوگوں کو بتایا تھا کہ یہ میرا بھانجہ ہے' میری بہن اور بہنوئی ایک حادثے میں اللہ کو پیارے ہوگئے تھے' مجھے اپنے آس پاس اپنی ماں کے سوا کوئی نظر نہ آیا وہ سلائی کڑھائی کا کام کرتی تھی' اس کی نظر آہستہ آہستہ کم ہورہی تھی۔ اس نے مجھے پڑھایا لکھایا' میں نے ویلڈنگ کا کام سیکھا' ایک دوست نے مجھے کہا کہ باہر چلے جاؤ' میں نے ماں سے بات کی تو وہ رونے لگ گئیں۔

میں خود بھی انہیں اکیلا چھوڑ کے جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن مجبوری تھی...... ہم کرائے کے مکان میں رہ رہے تھے' میں اپنا مکان بنانا چاہتا تھا' انہیں آرام دینا چاہتا تھا' وہ میرے سر پر سہرا بھی دیکھنا چاہتی تھیں' آخر میں نے ماں کو راضی کرلیا' جانے سے پہلے ایک رات میں نے بچوں کی طرح ان کی گود میں سر رکھ دیا اور ضد کرنے لگا کہ وہ مجھے سب کچھ بتادیں۔

آخر کافی تگ ودو کے بعد ان کے لب آہستہ آہستہ ہلے۔ تھانیدار صاحب' مجھے آج بھی وہ رات یاد ہے' ایک بھیانک خواب کی طرح...... لیکن جو کچھ ماں کہہ رہی تھی' وہ حقیقت تھا۔ ماں نے مجھے بتایا کہ ایک دن صبح صبح وہ بازار جارہی تھیں۔ راستے میں کوڑے کے ڈھیر کے پاس انہیں کچھ ہلچل محسوس ہوئی' انہوں نے قریب جا کے دیکھا' تو یہ ایک نومولود بچہ تھا' بمشکل چند گھنٹوں کا ہوگا' انہیں سب کچھ بھول گیا' وہ اسے اٹھا کر گھر لے آئیں۔ ان کے والدین فوت ہوچکے تھے' کرائے کے چھوٹے سے گھر میں اکیلی رہتی تھیں۔ سلائی کڑھائی کر کے اپنا گزارہ کرتی تھیں۔

کچھ دن کے بعد محلے میں روایتی کھسر پھسر شروع ہوگئی' ماں اس ننھی سی جان کو لے کر اس شہر میں آ گئی۔

تھانیدار صاحب' آپ سمجھ گئے ہوں گے' وہ میں ہی تھا۔

میں نے سر ہلادیا۔ وہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا' پھر بولا تو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آواز کسی گہرے کنویں سے آرہی ہو۔

میں باہر چلا گیا' بمشکل ایک سال میں وہاں رہ سکا' ماں کی یاد مجھے ستانے لگی' ویسے میرے پاس اتنے پیسے جمع ہوگئے تھے کہ میں ایک پلاٹ خرید سکتا تھا' کم از کم...... کچھ پیسے بچ بھی جاتے۔

میں نے سوچا تھا تھانیدار صاحب کہ پلاٹ خرید کر باقی پیسوں سے ویلڈنگ کا ایک ٹھیہ جمالوں گا اور باقی کام آہستہ آہستہ ہوجائیں گے لیکن...... یہاں آ کر میرے سارے خواب بکھر گئے۔ تھانیدار صاحب' وہ شفیق ہستی مجھ سے چھن گئی اور ان کو مجھ سے چھیننے والی لیڈی ڈاکٹر شازیہ تھی۔ ایک دن اس نے اپنی تیز رفتار کار سے انہیں کچل دیا۔ مجھے بتایا گیا کہ تمہاری خالہ نے (کیونکہ انہوں نے مجھے یہاں اپنا بھانجا ظاہر کیا تھا) لیڈی ڈاکٹر کو معاف کردیا تھا' اپنا خون' کیونکہ لیڈی ڈاکٹر نے جان بوجھ کر (بقول لوگوں کے) انہیں نہیں کچلا تھا۔ ایکسیڈنٹ کے بعد وہ صرف چند گھنٹے زندہ رہی تھیں مگر تھانیدار صاحب' میں یہ سن کر پاگل ہوگیا' میرا دماغ ماؤف ہوگیا۔ مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا لیکن میں نے بڑی مشکل سے اپنے دل اور دماغ کو اس بات پر راضی کیا کہ قتل ایسے کیا جائے کہ شک مجھ پر نہ آئے' مجھے یہ پتہ چل چکا تھا کہ وہ خان اسپتال میں ہوتی ہے اور کبھی کبھار رات کی

ڈیوٹی بھی کرتی ہے۔

اس رات مجھے گردے کا شدید درد ہوا' اور میرے علم میں یہ بات بھی آئی کہ آج رات لیڈی ڈاکٹر اسپتال میں ہے۔

قتل کا منصوبہ میں کافی دنوں سے بنا رہا تھا۔ میں حکیم کے پاس گیا اور اسے کہا۔ میں نے ایک کتا رکھا ہوا ہے' وہ آج کل پاگل ہو رہا ہے' مجھے اس کتے سے بڑا پیار ہے مجھے ایسا سریع الاثر زہر دو جو فوری اثر کرے' میں اپنے پیارے کتے کو زیادہ دیر تڑپتا ہوا نہیں دیکھ سکتا...... آپ کو پتہ ہے' کہ حکیموں اور سنیاسیوں کے پاس ایسے زہر ہوتے ہیں۔ جنہیں مار کر دوائیاں تیار ہوتی ہیں' بہر حال بڑی تگڑی رقم کے عوض میں زہر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس رات میں نے پانی میں وہ زہر گھول کر ایک ٹیکہ تیار کر لیا۔ باقی باتیں آپ کے علم میں آ چکی ہیں۔ اتنا بتا دیتا ہوں کہ جونہی گلوکوز کی بوتل خالی ہوئی' میں نے اردگرد دیکھا' کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں تھا اور جب میں لیڈی ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوا' تو وہاں بھی حالات میرے موافق تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دوں کہ مجھے قانون کی گرفت میں آنا تھا' اس لیے میں چھری لے کر حکیم کو قتل کرنے چلا گیا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں حکیم بھانڈا نہ پھوڑ دے...... حالانکہ یہ حماقت ہی تھی' کیوں تھانیدار صاحب؟ وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس وقت اس کو تو کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن آپ کو علیم الدین کی کہانی بھی سنا دیتا ہوں' ویسے تو آپ بہت کچھ سمجھ گئے ہوں گے۔

علیم الدین اور ربیعہ (موجودہ بیوی) آپس میں محبت کرتے تھے۔ ایک دن تنہائی میں وہ بہک گئے۔ جس کے نتیجے میں ربیعہ امید سے ہو گئی۔ ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا لیکن دونوں خاندانوں نے سمجھداری سے کام لیا' دونوں کا آپس میں رشتہ کر دیا لیکن ایک پھانس اٹکی ہوئی تھی۔ دنیا والوں سے ڈرتے تھے' کافی کوشش کرنے کے باوجود بچہ ضائع نہ ہوا تو لیڈی ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ حاملہ کی جان کو خطرہ ہے' آخر ایک دور پار کی رشتے دار کو اعتماد میں لے کر ربیعہ کو اس کے پاس بھیج دیا۔ جب بچہ پیدا ہوا تو دائی کو کہا گیا کہ اسے لے جائے۔ اور گلہ دبا کر کہیں دفن کر دے۔ انسان ایسے حالات میں اتنا سنگ دل بھی ہو جاتا ہے۔ علیم الدین کے والدین نے یہ شرط رکھی تھی کہ جب تک ربیعہ فارغ نہیں ہو جاتی وہ اسے اپنی بہو نہیں بنائیں گے۔

شاید دائی تو اس وقت تک مرکھپ گئی تھی لیکن ایک بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس نے ترس کھا کر بچے کو مارنے کی بجائے کوڑے کے ڈھیر کے پاس رکھ دیا تھا۔

قارئین آپ کا کیا خیال ہے......؟

اس کام کے لیے دائی کو ایک تگڑی سی رقم دی گئی تھی۔ ظاہر ہے فہیم کو ہم نے چھوڑ دیا تھا کیا واقعی یہ ایک انوکھا انتقام تھا۔

❖

روحانی علاج

حافظ شبیر احمد

نسیم فاطمہ...... بھکر

ج:۔ رشتے کے لیے:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

بھابی کے لیے:۔ سورۃ ال عمران آیت نمبر 38 ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ پڑھیں اور دعا بھی کریں۔

ساحرہ...... راولپنڈی

ج:۔ گھر بدلنے کی ضرورت نہیں۔ والدہ اور والد پڑھیں دونوں بھائیوں کے لیے۔ "یا حکم یا عظیم" ہر فرض نماز کے بعد 313 بار اور صبح و شام 7'7 بار سورۃ الاخلاص' سورۃ الفلق سورۃ الناس پڑھ کر پانی پہ پھونک مار کر سب گھر والے پئیں اور چھڑکیں بھی۔ پانی زمین پر نہ گرے۔ باتھ روم والی سائیڈ پر نہ چھڑکیں۔ 3 ماہ تک۔

ع ظ...... شیخوپورہ

ج:۔ "یا حکم" اس کا ورد بغیر تعداد کے رکھیں۔ نیت' چچا میری بات مانیں اور والدہ کے ساتھ رہنے دیں۔ بی بی اللہ سے مانگیں۔ معلوم تو یوں ہوتا ہے کہ ابو کے خاندان میں شادی ہو گی۔

بشریٰ پروین...... میر پور خاص

ج:۔ دونوں بچیاں سورۃ الاخلاص 41 بار پڑھیں۔ رات سونے سے پہلے اللہ سے بندش ٹوٹنے کی دعا کریں۔ بعد فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74' 70 بار پڑھیں۔ پڑھ کر رشتے کی دعا کریں۔ اللہ عطا کرے گا۔ 3 ماہ تک پڑھیں۔

محمد احسان...... سرگودھا

ج:۔ استغفار کی کثرت کریں۔ علاقے کے مفتی صاحب سے رجوع کریں یہ شرعی مسئلہ ہے۔

سعیدہ...... سیالکوٹ

ج:۔ سورۃ الفلق' سورۃ الناس 141'141 بار دونوں سورتیں دن میں۔ اول و آخر 11'11 بار درود شریف۔ ایک بار پڑھ کر پانی پہ پھونک مار کر خود بھی پئیں سب کو پلائیں اور گھر میں چھڑکیں اور پڑھتے وقت نیت کریں کہ جو بھی بندش و رکاوٹ ہے وہ ختم ہو۔

بیٹا 125 بار "سورۃ النصر" اول و آخر 25'25 بار درود ابراہیمی روزانہ رات کو پڑھے۔ کامیابی کے لیے۔

پری...... چشتیاں

ج:۔ کزن سورۃ القریش ہر نماز کے بعد 41 بار پڑھ کر دعا کرے کامیابی کے لیے۔ بہتر ہے نام تبدیل کر دیں۔

سدرہ...... جہلم

ج:۔ آیۃ الکرسی کا ورد رکھیں۔ رات سوتے وقت 7 بار پڑھ کر اپنے جسم پر پھونک کر سوئیں۔ "اللہ الصمد" ہر نماز کے بعد پڑھ کر بھولنے کی دعا کریں۔

محمد عزیر شاہ...... میانوالی

ج:۔ ا:۔ ہر نماز کے بعد "یا قوی" 11 مرتبہ سر پر ہاتھ رکھ کر پڑھیں یاد رہے گا۔ جب یاد ہو گا تب شوق بھی پیدا ہو گا۔ ۲:۔ والدہ بھائی کے سرہانے رات کو کھڑی ہو کر 21 مرتبہ سورۃ العصر پڑھیں۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف نیت یہ ہو کہ بھائی فرمانبردار ہو رہا ہے۔ ۳:۔ خالہ رات کو 101 مرتبہ سورۃ لھب اول و

آخر 11'11 مرتبہ درود شریف کے ساتھ پڑھیں۔ نیت یہ رکھیں کہ بیٹا واپس گھر کی طرف آرہا ہے ہمیشہ کے لیۓ دعا بھی کریں۔

سعدیہ فیاض......فیصل آباد

ج:۔ رشتے کے لیے:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74‘ 70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف دعا بھی کریں۔

گھر میں آسیب نہیں ہے۔ جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل اول وآخر 7'7 مرتبہ درود شریف پڑھ کر دم کردیا کریں۔ چینی سب گھر والوں کے استعمال میں آئے۔ یہ عمل ہمیشہ رکھیں ان شاء اللہ گھر میں لڑائی جھگڑے نہیں ہوں گے۔

بھائی ”یا رزاق یا فتاح“ کا ورد رکھیں۔

نسرین اختر......میانوالی

ج:۔ لحاظ ومروت اتنی ہو کہ اپنا نقصان نہ ہو۔ سورۃ الاخلاص ہر فرض نماز کے بعد 21 دفعہ پڑھ کر چچا کے لیے دعا کریں۔ کم از کم 3 ماہ تک۔

شمیم اختر......میانوالی

ج:۔ سورۃ الاخلاص روزانہ اول وآخر 11'11 بار درود شریف 1001 بار پڑھیں۔ 3 ماہ تک۔ جائیداد کا حصہ اور بھائی کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے۔

محمد یسٰین......ساہیوال

ج:۔ ”یا حکم“ ہر نماز کے بعد 121 بار پڑھ کر بچے کا تصور کریں کہ وہ ٹھیک اور کہنا ماننے لگا ہے۔

شوہر کو سورۃ طحہٰ کی پہلی 5 آیت ہر نماز کے بعد ایک گھونٹ پانی پہ 11 بار پڑھ کر پلائیں۔

نسرین، شریفاں بی بی......حجرہ شاہ مقیم

ج:۔ ”یا لطیف یا ودود“ 101 مرتبہ روزانہ رات کے وقت تنہائی میں اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف نیت شوہر کے تمام برے کام چھوٹ جانے کی اور ان کے دل میں آپ کی محبت اور گھر کی ذمہ داری پیدا ہورہی ہے۔ خلوص کے ساتھ یہ وظیفہ کریں اور دعا بھی کریں۔

جب نعمان سو جائے اس کے سرہانے کھڑے ہوکر سورۃ العصر 21 مرتبہ پڑھیں اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف نیت یہ رکھیں کہ فرمانبردار ہورہا ہے۔ وظیفہ باآواز پڑھیں۔ اتنی آواز سے کہ لڑکا نیند سے اٹھ نہ جائے۔

فائزہ صدیق......نامعلوم

ج:۔ نیم کے 41'41'41 پتے لے کر پھر سات نلکوں کا پانی لے کر (اتنا ہو کہ تین بار غسل کرسکیں) سب کو مکس کرلیں۔ ایک کلو پانی لے اس میں 41 نیم کے پتے جس پر آخری 3 قل 3 بار پڑھ کر پتوں پر پھونک ماریں اور اتنا سرسوں کا تیل لیں کہ آپ کے پورے جسم پر مالش ہوجائے۔ پانی میں پتے اور تیل ڈال دیں اور پکائیں۔ اتنا پکائیں کہ تیل اور پتے رہ جائیں۔ تیل سے رات کو جسم پر مالش کریں صبح ہی نہالیں۔ تینوں بار یہی عمل دہرائیں۔ اس کے بعد، بعد فجر کی نماز 70 بار سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74 پڑھیں 3 ماہ تک۔ پڑھنے کے بعد اچھے رشتے کی دعا کریں۔

ثمرین شہزاد......کینیڈا

ج:۔ شہزاد کھلے ہاتھ کے ہیں (میانہ روی اختیار کریں)۔ آپ برکت کے لیے کچھ نہ کچھ اللہ کی راہ میں برکت کا کہہ کر نکالا کریں روزانہ معمول بنالیں۔

سورۃ القریش، اذا جاء ہر نماز کے بعد 11'11 بار پڑھا کریں۔

ش۔ن......نامعلوم

جواب:۔ مسئلہ 1:۔ فجر کی نماز کے بعد سورۃ الفرقان آیت نمبر 74‘ 70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ دعا یہ مانگیں کہ جہاں حق میں بہتر ہو وہیں رشتہ ہو۔ عشاء کی نماز کے بعد 1 تسبیح استغفار 1 تسبیح درود شریف (درود ابراہیمی) دعا بھی کریں۔

مسئلہ 2:۔ بیٹے کے سرہانے کھڑے ہوکر جب وہ سو جائے سورۃ العصر پڑھیں 41 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف اتنی آواز میں کہ اگر جاگ رہا ہو تو سن سکے۔

تمثیلہ شہزادی......حافظ آباد

جواب:۔ مہینہ نہانے کے بعد لگاتار 3 دن ملنے سے پہلے سورۃ والضحیٰ 21 بار پڑھ کر دعا کیا کریں۔

نسرین اختر......ہری پور ہزارہ

جواب:۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھ کر اپنے بچوں کے لیے دعا کریں۔ مالی حالات کے لیے سورۃ القریش 1 تسبیح روزانہ۔

سعدیہ......چمبڑ

جواب:۔ ”رجوع الی اللہ“ سب کچھ بھول کر اللہ سے تعلق جوڑو۔

بعد نمازِ فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74‘ 70 بار پڑھیں۔ اول وآخر 11'11 بار درود شریف۔ بہتر رشتے کی دعا بھی کریں۔ دونوں بہنیں و بھتیجیاں۔ عمل 4 ماہ۔

آمنہ اعوان......حیدر آباد

جواب:۔ ”یا حکیم یا اللہ“ تعداد 1000 مرتبہ روزانہ رات کے وقت اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف (درود ابراہیمی)۔ دعا بھی کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے اس کے تمام مسائل حل فرمائے۔

پڑھتے وقت مسائل حل ہونے کا تصور ذہن میں رکھ کر پڑھیں۔

انوری بیگم......قریشیاں والا

جواب:۔ 1:۔ رشتوں کے لیے:۔ سورۃ الفرقان آیت نمبر 74‘ 70 مرتبہ بعد نماز فجر (اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف)۔

2:۔ فجر کی نماز کے بعد 3 مرتبہ سورۃ یسین پڑھیں اپنے تمام مسائل کا تصور رکھ کر سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ان شاءاللہ۔

3:۔ گھٹنے کے درد کے لیے:۔ زیتون کے تیل پر اللہ کے تمام نام 1 مرتبہ پڑھ کر دم کرلیں اسے روزانہ لگائیں۔

نورین شفیع......ملتان

جواب:۔ 1:۔ بھائی کو درود شریف کا پانی پلایا کریں روزانہ جتنی مرتبہ ہوسکے پڑھ کر۔

2:۔ جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر دم کردیں (اول وآخر 3'3 مرتبہ درود شریف) چینی گھر کے تمام افراد کے استعمال میں آئے۔

3:۔ معاشی مسائل کے لیے ہر نماز کے بعد 7 مرتبہ سورۃ قریش گھر کے تمام افراد پڑھیں۔

4:۔ بسم اللہ پڑھ کر چیزیں رکھا کریں۔

صبا......لاہور

جواب:۔ سورۃ یسین کی آیت نمبر 65 روزانہ 1 تسبیح پڑھ لیں۔ پہلے اس کا ترجمہ پڑھ لیں۔ اس کے بعد شروع کیجیے گا۔ ہر نماز کے بعد۔

شازیہ بی بی......نامعلوم

جواب:۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ اتنا کچھ پڑھتی ہو بہر حال اپنے قریبی اچھے عامل سے رجوع کریں۔ علاج ضروری ہے۔

سعدیہ مسعود......جہلم

جواب:۔ مسئلہ نمبر 1:۔ ہوائی مخلوق تنگ کر رہی ہے۔"سورۃ جن" روزانہ 7 مرتبہ پڑھ کر پانی پر دم کر کے پورے گھر میں چھڑکیں باتھ روم کے علاوہ روزانہ۔

مسئلہ نمبر 2:۔ یہی پانی اسے بھی پلائیں۔

خالدہ پروین......فیصل آباد

جواب:۔ وظیفہ جاری رکھیں چھوڑیں نہیں مسئلہ ضرور حل ہوگا۔ ان شاءاللہ' صدقہ بھی دیں۔

بھائی کے لیے بھی دعا کریں کہ اگر حق میں بہتر ہے تو ہو جائے ورنہ کہیں اور۔

شمائلہ ایاز' فوزیہ سلطانہ......بھکر

جواب:۔ مسئلہ نمبر 1:۔"یا وھاب" 1 تسبیح روزانہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ جب تک منزل مقصود تک نہ پہنچ جائیں۔

مسئلہ نمبر 2:۔ سورۃ ال عمران آیت نمبر 38 ہر نماز کے بعد 7 مرتبہ اولاد کے لیے۔ علاج بھی ساتھ ہی شروع کرائیں۔

عائشہ......سرگودھا

جواب:۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھیں۔ دعا کریں کہ جہاں حق میں بہتر ہو وہیں ہو۔

صباء حسن......سیالکوٹ

جواب:۔ رشتے کے لیے:۔ بعد نمازِ فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ (اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف) اگر آپ مجبوری کے تحت جاب کرنا چاہتی ہیں تو کرلیں۔

جاناں......چکوال

جواب:۔ سورۃ الفلق' سورۃ الناس 21'21 مرتبہ۔ بعد نماز عشا بیماری کے ٹھیک ہونے کا تصور رکھ کر پڑھیں۔ ہر نماز کے بعد سورۃ ال عمران آیت نمبر 38 سات مرتبہ پڑھیں اولاد کے لیے دعا کریں۔

نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail@gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے اکتوبر 2013ء

نام.................. والدہ کا نام.................. گھر کا مکمل پتا..................

....

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں..................

خوشبوئے سخن

عمر اسرار

حمد

میرا غم بہت طویل ہے مولا
میرا وقت بڑا قلیل ہے مولا
امتی ہوں تیرے حبیب کا
بس یہی میرے پاس دلیل ہے مولا
سبھی اختیار ہے تیرا میرا خواہشوں کے انبار پر
میری ناک میں تیری نکیل ہے مولا
نالاں ہے کیوں میری خود فراموشی سے لوگ
میرے خوں میں تحلیل ہے مولا
اے چاک گریباں عابد
لگتا ہے تیرا کفیل ہے مولا

اللہ دتہ عابد......منچن آباد

نعت رسول مقبول ﷺ

جن پر ہمیں ہے مان رسول کریمؐ ہیں
ہم عاصیوں کی جان رسول کریمؐ ہیں
وہ دل کسی کے سامنے جھکتا نہیں کبھی
جس دل پہ حکمران رسول کریمؐ ہیں
امت کو یہ خبر بھی نہیں ہے کہ کس قدر
امت پہ مہربان رسول کریمؐ ہیں
کرتے ہیں کسبِ فیض جہاں سے جہاں کے پھول
خوشبو کا وہ جہان رسول کریمؐ ہیں
اشکوں کی قدر اور کوئی جانتا نہیں
اشکوں کے قدر دان رسول کریمؐ ہیں
شانِ خدا کے باب میں سوچا تو یہ کھلا
میرے خدا کی شان رسول کریمؐ ہیں
قدرت کے ہم پر راز جو کھلتے نہ کسی طرح
قدرت کے ترجمان رسول کریمؐ ہیں
بندوں سے باز پرس کرے بھی خدا تو کیا
دونوں کے درمیان رسول کریمؐ ہیں
مسرور ہم جہاں بھی رہیں جس جگہ رہیں
رحمت کا سائبان رسول کریمؐ ہیں

مسرور کیفی

غزل

ہم کنارے کھڑے سمندر کے
غم ڈبوتے ہیں روز اندر کے
جب بھی پہنچے قریب بستر کے
یاد آئے ستم ستمگر کے
کچی مٹی سے عشق ہے اپنا
گھر بناتے کیا سنگ مرمر کے
روشنیوں کے شہر کا سوچو
بجھ رہے ہیں چراغ ہر گھر کے
ذرہ ذرہ جو پل میں ہوجائیں
اپنے وعدے نہیں ہیں پتھر کے

رانا حنیف عاطر......راولپنڈی

مجھے تم سے محبت ہے

یہ کہنا کتنا ممکن ہے
اسے سمجھنے میں لیکن
اسے نباہنے میں......ہاں
مگر
بہت ہی وقت لگتا ہے
مجھے تم سے محبت ہے
یہ کہنا کتنا سہل ہے
محبت کے رنگ میں ڈھلنے میں
اپنی انا مصلوب کرنے میں......ہاں
مگر
بہت ہی وقت لگتا ہے
مجھے تم سے محبت ہے

یہ تو کہہ دیا تم نے
اس سودے کے سود و زیاں میں
عمر رائیگاں کرنے میں......ہاں
مگر
بہت ہی وقت لگتا ہے

ریحانہ سعیدہ......لاہور

گیت

بے وفا! پیار جو تجھ سے ہوا' یار پھر کیسا ہوا
دلربا! اعتبار کیا تیرا ہوا' یار یہ کیوں ہوا
سوچ کی نگری میں چپکے سے آئے تھے تم
کھڑی تھی پیپل کے نیچے جب سائے تھے تم
ساتھیا! دل لے کر توڑ دیا' تنہا اکیلا چھوڑ دیا
اعتبار کیا تیرا ہوا' یار یہ کیوں ہوا
باغ کے مکھڑے پر پڑنے لگی ہے چاندنی
جیسے ندیا کے سحر میں ڈوب جاتی ہے زندگی
ماہیا! تیرے ساتھ نے دھوکا دیا' آرزوؤں کا خون
کیا
اعتبار کیا تیرا ہوا' یار یہ کیوں ہوا
تنہائی گھیرے میں لے کر ہوئے تھے غم آشنا
پھر دل کا گرا ہے ٹوٹ کر آئینہ
ساجنا' اشکوں کا سیل رواں دیا' موج موج رسوا کیا
اعتبار کیا تیرا ہوا' یار یہ کیوں ہوا
بے وفا! پیار جو تجھ سے ہوا' یار پھر کیسا ہوا

سید عبداللہ شاہد......حیدر آباد

غزل

کہیں پھول مہکے تیری یاد میں
کہیں درد ملا تیری صدا میں
کوئی بھٹک گیا ہے منزل سے
وہ پہلا سا رنگ نہیں حنا میں
شرمندہ ہوں میں بھی تیری طرح
کوئی راحت نہیں ملتی اب وفا میں
غم ستائے گا عمر بھر تیرا ہمیں
جیسے کوئی دیوانہ پھرتا ہوا صحرا میں
کسی کی نظر سے عیاں ہے اداسی جاوید
شمع جلے پھر کوئی کیسے تیز ہوا میں

محمد اسلم جاوید......فیصل آباد

غزل

یہ درد بڑا پر آشوب ہے
کسی کا حساب کیا دے گا
آنے والا وقت لگتا ہے مجھے
اک سنہرا خواب کیا دے گا
وہ میرے دور کا چنگیز ہے
نجانے اور عذاب کیا دے گا
غریب باپ کھانے کو کچھ دے نہ سکا
بچوں کو وہ بھلا کتاب کیا دے گا
خود ہی اجاڑ ڈالا باغباں نے
اب یہ چمن گلاب کیا دے گا

وسیم اختر......راولپنڈی

غزل

عکس اس کا آئینوں کے نظاروں میں ڈھونڈنا
ہو جائے شب تو چاند ستاروں میں ڈھونڈنا
شاخوں کے ساتھ ساتھ ہوں میں صورتِ گلاب
آئے جو رت تو مجھ کو بہاروں میں ڈھونڈنا
میں نغمۂ بہار ہوں تم مجھ کو دوستو
گاتی ہوئی ندی کے کناروں میں ڈھونڈنا
میں پیکرِ خلوص ہوں ملتا ہوں خال خال
جو ہو سکے تو مجھ کو ہزاروں میں ڈھونڈنا
قوسِ قزح ہے میرا ہی اک پر تو جمال
میرے لہو کا رنگ چناروں ڈھونڈنا

سمیع جمال......کراچی

غزل

انتہا یہ سادگی کی ہے مگر میں کیا کہوں
پتھروں کے شہر میں شیشے کا گھر میں کیا کہوں
لوٹنے والوں کا بن کر راہنما آیا وہی
جو رہا اک عمر میرا ہمسفر میں کیا کہوں
میں انہی کے غم میں گھلتا جا رہا ہوں دوستو
جو ہیں میرے حال سے بھی بے خبر میں کیا کہوں
آ گئے آنسو سر مژگاں کسی کی یاد میں
کر گیا دل پر غمِ فرقت اثر میں کیا کہوں
دور منزل' پاؤں میں چھالے کٹھن ہے راستہ
حوصلے ہیں صورتِ زادِ سفر؟ میں کیا کہوں
کیا کسی کے کام آؤں رہگزار زیست میں
زندگی ہے صورت تنہا شجر میں کیا کہوں
لوگ اونچے شاعروں کی بات کرتے ہیں یہاں
شاعری پر ہے کمر بستہ قمر میں کیا کہوں

ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

غزل

غم کی کالی رات ہے پیارے
تنہا اپنی ذات ہے پیارے
آنکھوں میں جل تھل کا منظر
کیسی یہ برسات ہے پیارے
جیون خوش خوش کٹ جائے گا
جب تک تیرا ساتھ ہے پیارے
تیری محفل میں آ جائیں
اپنی کیا اوقات ہے پیارے
یاد جسے کہتے ہیں رانا
کیسی یہ سوغات ہے پیارے

قدیر رانا......راولپنڈی

چلو کچھ دیر ہنستے ہیں......!

محبت پر، عنایت پر
کہ بے بنیاد باتیں ہیں
سبھی رشتے سبھی ناتے
ضرورت کی ہیں ایجادیں
کہیں کوئی نہیں مرتا کسی کے واسطے جاناں
کہ سب بے پھیر لفظوں کا
ہے سارا کھیل حرفوں کا
نہ ہے محبوب کوئی بھی' محبت ناں زمانے میں
پرائے بھی ہیں پھر اپنے اگر ہے کچھ خزانے میں
کہ اس جذبے پہ اب اکثر سبھی جملے سے کستے
ہیں
چلو کچھ دیر ہنستے ہیں
اسی کو یاد کرتے ہیں
جسے ہم زیست کہتے تھے
کہ لینا سانس بن جس کے ہمیں اک جرم لگتا تھا
کہ سنگ جس کے ہر اک لمحہ خوش و خرم لگتا تھا
جسے ہم زندگی کہتے جسے تھے' شاعری کہتے
غزل کا قافیہ تھا جو' نظم کا جو کہ عنواں تھا
وہ لہجہ جب بدلتا تھا قیامت خیز لگتا تھا
وقت سے آگے چلتا تھا بلا کا تیز لگتا تھا
جو سایہ بن کے رہتا تھا جدا اب اس کے رستے
ہیں
چلو کچھ دیر ہنستے ہیں
چلو کچھ دیر ہنستے ہیں......!

انتخاب: ثمرین......جہلم

غزل

اس نیلے آکاش کی گہرائی میں کھو جاؤں میں
تپ کر ہجر میں تیرے، ساجن کندن ہو جاؤں میں
میرے اپنے لوگ بھلا کیوں دور ہوئے جاتے ہیں
دل تو چاہے ان سب کو مالا میں پرو جاؤں میں
دکھ میں غم میں' تھکی ہوئی ہوں' پاؤں میں چھالے ہیں

ماں! کچھ دیر تیری گود میں سر رکھ کر سو جاؤں میں
جب بھی ساون کے بادل برسائیں، ڈھیروں اداسی
اتنا برسیں آنکھیں کہ ساون کو بھگو جاؤں میں
برسوں سے میں قید ہوں تیرے ہجر کے زندانوں میں
روشانے اب چاہوں غم سے پاک ہی ہو جاؤں میں
روشانے سبعین...... فیصل آباد

سنو مسافر......!
گئے موسم میں بچھڑی تھی
دسمبر کی سہانی شام
یادوں کی بارات لیے
میرے آنگن میں اتری ہے
کھلے امبر کی باہوں میں
میری پرسوز راتوں کا
اک اک حرف امر لکھا ہے
میرے ہاتھوں میں تیری یاد کے جگنو
ابھی تک قید بیٹھے ہیں
کبھی اداس پیڑوں کے
بچھڑے سوکھتے پتے
میرے دل کی غمازی ہیں
میری دنیا کا اک اک پل
اب بھی تیرے نام سے
کڑی میری مسافت ہے
پلٹ آؤ کہ
"مجھے تیری ضرورت ہے"
حنا راجہ...... ساگری

نظم
پیاسے موسم میں
اب کی خواہش بن کر
تیرے دل میں اتروں
تم کو سیراب کر جاؤں
تمہاری ویران راتوں میں مہکوں
تمہاری نیندوں کو مہتاب کر جاؤں
اپنا آپ پانے سے پہلے
چند تمہارے نام کر جاؤں
صرف تتلیاں بچے میری قبر پر
پکڑنے کے لیے وقت تیرے نام کر جاؤں
ناہید غفور...... گنگا پور

غزل
وہ شخص تھا بالکل میرے جذبات کی طرح
لیکن وہ نہیں تھا میری ذات کی طرح
تھا پاس ہو کے بھی میری دسترس سے دور
میں دنیا سے جیتا بھی تھا اک مات کی طرح
ہم نے دیارِ یار پہ وقف کر دی زندگی
جانے کیوں بدلا تھا وہ حالات کی طرح
کچھ اس لیے بھی تھا دل و جان سے عزیز
کیونکہ وہ تھا میری خواہشات کی طرح
بچھڑا کچھ اس طرح سے کہ کچھ یاد بھی نہیں
آیا نہ پلٹ کے گزرے لمحات کی طرح
ایسے بھلا دیا ہے اس نے مجھے نیش
جیسے میں ہوں ماضی کی کسی بات کی طرح
نیش نسیم شیخ

ذوقِ آگہی

عفان احمد

فرمان مصطفی ﷺ

1۔ جو مجھ پر درودِ پاک پڑھنا بھول گیا وہ جنت کا راستہ بھول گیا۔

2۔ جس نے کتاب میں مجھ پر درود پاک لکھا تو جب تک میرا نام اس کتاب میں لکھا رہے گا، فرشتے اس کے لئے استغفار کرتے رہیں گے۔

3۔ جو مجھ پر ایک مرتبہ درود پڑھتا ہے اللہ اس کے لئے ایک قیراط اجر لکھتا ہے اور ایک قیراط اُحد پہاڑ جتنا ہے۔

عرفان شبیر عرف فخر پوٹھوہار...... چھینہ گوجر خان

سیرۃ پر عمل تمام مسائل کا حل ہے

اللہ رب العزت نے جب ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین اور سید الانبیاء کا عظیم مرتبہ عطا فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو قیامت تک کے انسانوں کے لیے ہدایت کا مرکز بنایا تو ہم سب کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ رحمتہ للعالمین سے بڑھ کر کوئی عزت و شرافت والا نہیں ہوسکتا اور نبی آخر الزماں اس کائنات کے سب سے بڑے مدبر، معاملہ فہم، انسانیت پر مہربان، سب انسانوں سے زیادہ عقل و دانش اور قوت و صلاحیت میں سب سے بڑھ کر ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نوع انسانیت کے لیے ہدایت کے لیے عظیم مینار ہیں اور رہتی دنیا تک انسان رشد و ہدایت کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا محتاج ہے۔ اللہ خالق کائنات کے یہاں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مقام اور مرتبہ حاصل ہے کسی دوسرے انسان کے لیے اس مقام کا تصور بھی محال ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہونا وہ اعزاز ہے، جس پر دنیا اور اس کی تمام حسن و رنگینیاں قربان ہیں، آج اگر ہمیں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کا شرف حاصل ہے تو ہمیں اس عظیم نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس کامل نبی کی اتباع کرنی چاہیے تاکہ ہم بھی کل قیامت کے دن کامیابی حاصل کرسکیں۔ ہمارا یہ یقین ہونا چاہیے کہ اس نبی برحق کی تعلیمات سے بڑھ کر کوئی تعلیم نہیں ہوسکتی کہ زمانہ کتنا بھی بدل جائے مگر وہ مبارک تعلیمات ہمیشہ کارآمد رہیں گی، معاشرتی تقاضے ان تعلیمات نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باہر نہیں ہوسکتے، یہ کہنا کہ ہمارا مذہب موجودہ دور کے تقاضے پورے نہیں کرسکتا، جہالت کی آخری حد ہے کیونکہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جس مذہب کو قیامت تک کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنایا گیا ہو وہ آپ کے مسائل کا حل نہ دے سکتا ہو؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن کریم اور اس کی تشریح احادیث مبارکہ تو موجود ہوں مگر وہ رہنمائی کا فریضہ ادا کرنے سے قاصر ہوں؟ نعوذ باللہ یہ کبھی بھی نہیں ہوسکتا، زمانہ کتنا ہی جدید کیوں نہ ہو جائے، وہ اپنے مالک و خالق اللہ رب العزت کے قبضۂ قدرت سے کبھی زمانوں کا احاطہ نہیں ہوسکتا اور ہمارے رب کا علم اول و آخر تمام زمانوں کا احاطہ کرتا ہے تو کوئی زمانہ بھی اس کی تعلیمات کے دائرے سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا، ہمیں اپنے ان باطل خیالات کو ختم کرکے اپنے عقیدے کے مطابق یہ یقین اپنانا ہوگا کہ ہمارا دین اسلام ہی

ہمارے تمام مسائل کا حل ہے۔

لائبہ زبیر..... ناظم آباد، کراچی

زندگی گزارنے کے رہنما اصول

- اللہ سے مانگو عاجزی کے ساتھ
- عبادت کرو توجہ کے ساتھ
- زندگی بسر کرو خوشی کے ساتھ
- علم سیکھو شوق کے ساتھ
- کام کرو دلجوئی کے ساتھ
- روزی کماؤ عزت کے ساتھ
- خرچ کرو اختیار کے ساتھ
- نیکی کرو ہر ایک کے ساتھ
- بحث کرو دلیل کے ساتھ
- بات کرو تمیز کے ساتھ
- مجلس میں بیٹھو ادب کے ساتھ
- محنت کرو تندہی کے ساتھ
- مقابلہ کرو بہادری کے ساتھ
- مطالعہ کرو اچھے انتخاب کے ساتھ
- دوستی کرو اہل علم شریفوں کے ساتھ
- کاروبار کرو دیانتداری کے ساتھ
- برائی کا جواب بھلائی کے ساتھ
- مصیبت جھیلو حوصلے کے ساتھ

شجاع جعفری..... تلہ گنگ

آپ سے کیا پردہ

☆ محبت کرنے والے سائے سے بھی کیوں ڈرتے ہیں؟ کیونکہ یہ سایہ عموماً والد بزرگوار کا ہوتا ہے۔

☆ محبت کے میچ میں جیت کس کی ہوتی ہے۔ پیسے والے کی، غریب تو ہمیشہ زیرو پر آؤٹ ہوتا ہے۔

☆ سر توڑنا جرم ہے لیکن دل توڑنا جرم نہیں ہے۔

☆ پہلے بچوں کو بولنا سکھایا جاتا ہے اور بعد میں خاموش رہنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

ریاض بٹ..... حسن ابدال

انمول موتی

۞ حضرت علیؓ کا فرمان ہے کہ دولت تو چرائی جاسکتی ہے مگر تعلیم اور علم کو کوئی نہیں چرا سکتا۔

۞ ہمیشہ سچ بولو تاکہ تمہیں قسم کھانے کی ضرورت نہ پڑے۔

۞ حقیقی عابد وہ ہے جو خدمت خلق میں مصروف ہے۔

۞ تین چیزوں سے بچو، یہ انسان کو تباہ کردیتی ہے۔ قرض، حسد اور غرور۔

۞ دولت مندی کی مستی سے خدا کی پناہ مانگو کہ اس سے بہت دیر سے ہوش آتا ہے۔

۞ گم نامی کی زندگی کو پسند کر، کہ اس میں نام وری کی نسبت بڑا امن ہے۔

۞ خوشامدی لوگ تیرے لیے تکبر کا تخم (بیج) ہیں۔

۞ مومن جس قدر بوڑھا ہوتا ہے اس کا ایمان طاقت ور ہوتا ہے۔

۞ اللہ تعالیٰ کو ہر وقت اپنے ساتھ سمجھنا افضل ترین عبادت ہے۔

۞ غصہ منہ کھول دیتا ہے اور آنکھیں بند کردیتا ہے۔

۞ قول بے عمل اور عمل بغیر خلوص، ناقابل قبول ہے۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی..... راولپنڈی

ایک ہنس مکھ نوجوان کا قصہ

ایک چست، پاکیزہ طبیعت، شیریں زبان ہنس

مکھ نوجوان ہماری محفل کا ساتھی تھا۔ اس کے دل میں کسی قسم کا غم نہ آتا تھا اور ہونٹ ہنسی سے کھلے رہتے تھے۔ ایک زمانہ گزرا کہ ہمیں اس سے ملاقات کا اتفاق نہ ہوا اس کے بعد میں نے اس کو دیکھا کہ اس نے شادی کرلی اور بچے ہوگئے اور اس کا تمام عیش ونشاط جاتا رہا۔ میں نے اس سے پوچھا کیسے ہو اور کیا حالت ہے؟ اس نے کہا جب سے میرے بچے ہوگئے میں نے بچپن چھوڑ دیا یعنی اپنی بے فکری اور سرور۔ (گلستان ص ۱۸۰)

فائدہ: جوانی کی مسرتیں بوڑھے کے پاس تلاش نہ کرو ندی کو گیا ہوا پانی پھر ندی میں واپس نہیں آتا' جب کھیتی کاٹنے کا وقت آپہنچا پھر وہ نئے سبزہ کی طرح نہیں لہلہاتی' بڑھاپے میں ہنسی دل لگی کھیل کود نہ کرو بلکہ اسے جوانوں کے لیے چھوڑ دو۔

وسیم کیانی..... دینہ

اقوال زریں

۱:۔ دعا کی قبولیت کا انحصار خلوص پر ہوتا ہے۔

۲:۔ انسان کے چہرے کا حسن خدائے تعالیٰ کی عمدہ عنایت ہے۔

۳:۔ عقل مندوں کی دوستی اختیار کر اس میں بہت فائدے ہیں۔

۴:۔ جو آخرت کو دنیا سے بہتر جانے وہ ایمان والا ہے۔

۵:۔ فتنہ انگیز سچائی سے مصلحت آمیز جھوٹ بہتر ہے۔

۶:۔ وہ ضعیف ترین ہے جو اپنی بات پر قائم نہ رہے۔

شمائلہ رزاق..... منچن آباد

وجہ

نئے کھلنے والے ایک بڑے اور فیشن ایبل ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں ہر سیلز مین کو ہدایت کی گئی تھی کہ اگر کوئی گاہک کوئی بھی چیز خریدے بغیر چلا جائے تو ایک مخصوص رجسٹر میں اس کی وجہ درج کی جائے۔ ایک خاتون نے ملبوسات کے شعبے میں آکر صرف سیاہ رنگ کے بیسیوں لباس دیکھے لیکن کوئی بھی خریدا نہیں۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد سیلز مین کی سمجھ میں نہ آیا کہ خاتون کے کوئی ڈریس نہ خریدنے کی وجہ کیا لکھے؟ کچھ دیر سوچنے کے بعد آخر کار اس نے رجسٹر میں نوٹ لکھا۔ خاتون نے بہت سے سیاہ ڈریس دیکھے مگر ایک بھی خریدا نہیں۔ وجہ غالباً یہی ہے کہ ابھی ان کے شوہر کا انتقال نہیں ہوا۔

محمد ولی اللہ ہمدرد بیگ..... کوہاٹ

پیپر ویٹ

ناشتہ کرتے ہوئے گاہک نے بیرے کو بلا کر کہا۔ ''دو ٹوسٹ اور لے آؤ مگر ذرا جلدی آنا۔ آملیٹ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

''جی صاحب!'' بیرا بولا۔ ''اور کچھ؟''

''ہاں۔'' گاہک بولا۔ ''ٹوسٹ کے ساتھ ایک پیپر ویٹ بھی لیتے آنا۔ کیونکہ پہلے والے دونوں ٹوسٹ ہوا میں اڑ گئے ہیں۔''

ذیشان..... کراچی

شادی

''میری شادی کو 6 مہینے ہوگئے مگر ابھی تک مجھے اپنی بیوی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے کو نہیں ملا۔'' جاوید نے اپنے دوست ظفر سے کہا۔ ''وجہ؟'' ''کبھی میری ساس گھر آکر پکا جاتی ہے اور کبھی مجھے کھانا ہوٹل سے لانا پڑتا ہے۔''

''پھر تو تم بڑے خوش قسمت ہو یار!'' دوسرے دوست ظفر نے کہا۔ ''میری شادی کو چھ سال

ہو گئے اور مجھے روزانہ بیوی کے ساتھ کھانا کھانا پڑتا ہے۔" ظفر نے کہا۔

طارق خان...... منچن آباد

جدید محاورے

1۔ میں نے سنا اور بھول گیا' دیکھا اور یاد ہے' کہا اور سمجھ گیا۔ (چینی محاورہ)

2۔ پڑھانے والے پڑھنے والوں سے زیادہ سیکھتے ہیں۔ (چینی محاورہ)

3۔ ہنسی ایک ایسا علاج ہے جس کا کوئی سائیڈ افیکٹ نہیں ہوتا۔ (آرنلڈ گلاسو)

کامران علی...... کراچی

انمول موتی

1۔ جو شخص حسد کو دوست رکھتا ہے اس کا نفس قائم ودائم نہیں رہتا اور اسے مرنے سے پہلے مار دیتا ہے۔ (حکیم بقراط)

2۔ قابل سے قابل شخص کو بھی غصہ کبھی کبھی بے وقوف بنا دیتا ہے۔ (حکیم بقراط)

3۔ دنیا میں سب سے بہترین سوال یہ ہے کہ میں دنیا میں کون سی نیکی کر سکتا ہوں (فرینکلن)

4۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ مرنے کے بعد بھی لوگ تمہیں نہ بھولیں تو کچھ ایسی باتیں سیکھو جو پڑھی جائیں یا ایسا کام کرو جو دیکھے جانے کے قابل ہو۔ (فرینکلن)

5۔ بزدل آدمی موت آنے سے پہلے کئی بار مرتا ہے لیکن بہادر آدمی صرف ایک بار ہی مرتا ہے۔ (شیکسپیئر)

6۔ دلوں کو فتح کرنے کے لئے تلوار کی نہیں عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ (شیکسپیئر)

7۔ مشکلات کو دور کرنے' خواہشات کو دبانے اور تکلیف کو برداشت کرنے سے انسان کا کردار اعلیٰ، مضبوط اور پاکیزہ ہو جاتا ہے۔ (شیکسپیئر)

8۔ خدا اور موت کو کبھی نہ بھول! اپنی نیکی اور دوسروں کی بدی کو بھول جا! (حکیم لقمان)

ثمرین...... کراچی

بیوی کی تلاش

بزرگ ہمیشہ اپنی اولاد کو مختلف نصیحتیں کرتے آئے ہیں اور یہ نصیحت بھی ایک عربی بزرگ نے اپنے بیٹوں کو کی کہ چھ قسم کی عورتوں سے شادی نہ کرنا۔

1۔ انانہ' 2۔ منانہ' 3۔ احنانہ' 4۔ صداقہ' 5۔ براقہ' 6۔ شداقہ۔

1۔ انانہ یعنی وہ عورت جو ہر وقت سر پر پٹی باندھے درد' شکوہ شکایت کرے۔

2۔ منانہ۔ ایسی عورت جو ہر وقت شوہر پر احسان جتاتی رہے کہ میں نے تجھ پر احسان کیا اور تجھ سے مجھے کیا ملا۔

3۔ احنانہ۔ ایسی عورت جو ہر وقت اپنے سابقہ شوہر کو یاد کرتی رہے اور کہے وہ تو بڑا اچھا تھا لیکن تیرے اندر کوئی خوبی نہیں۔

4۔ صداقہ۔ وہ عورت جو شوہر سے ہر وقت فرمائش کرتی رہے' یہ لادو' وہ لادو۔

5۔ براقہ۔ ایسی عورت جو ہر وقت اپنے فیشن و سنگھار میں لگی رہے اور اپنے شوہر پر توجہ نہ دے۔

6۔ شداقہ۔ بہت تیز زبان ہو' ہر وقت بلاوجہ بولتی رہے۔

فرزانہ آفندی...... شکار پور سندھ

قسط نمبر 2

جگت سنگھ

شمیم نوید

تاریخ کے صفحات میں محفوظ سرزمین پنجاب کی ایسی دلگداز داستان جو کلاسک داستانوں میں شمار ہوتی ہے...... جور و جبر کے خلاف بغاوت کی آتشیں آندھیوں کا احوال' جو حاکمانہ غرور کے کوہساروں کے ساتھ پورے جاہ و جلال سے ٹکراجاتی ہیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کے لیے بھی فسانۂ عبرت ہے' جو آنے والی نسلوں کو انتقام اور دشمنی کے جذبات منتقل کرتے رہتے ہیں اور سیدھے سادھے نوجوان "جگت سنگھ" بن جاتے ہیں اور پھر حالات کسی کے قابو میں نہیں رہتے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار "جگت سنگھ" ایک ایسا ڈاکو ہے جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ دراصل فطری طور پر امن و آشتی کا پیامبر ہے۔ "جگت سنگھ" کے کردار کا رومانی پہلو' جو شروع سے آخر تک "چندن" اور "ویرو" کی صورت میں اس کہانی میں رچا بسا نظر آتا ہے اس بات کا معتبر ترین گواہ ہے کہ لطیف جذبات رکھنے والا نوجوان جسے دنیا خطرناک ڈاکو کے طور پر جانتی ہے اندر سے کتنا نرم اور محبت کرنے والا ہے۔ "جگت سنگھ" کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا' آئیے قارئین یہ جاننے کے لیے ہم بھی زیر نظر کہانی میں "جگت سنگھ" کے ساتھ ساتھ گاؤں کے سرسبز کھلیانوں' اونچے نیچے ٹیلوں اور پر خطر کھنڈرات کے نشیب و فراز میں سفر کرتے ہیں۔

ویرو نے میاں کے منہ سے بات سنی تو حیران ہو کر بولی۔ "اور مجھے اکیلا چھوڑ دو گے؟"

"کیوں...... تجھے اکیلے سونے میں اعتراض ہے؟"

ویرو نے بڑی ادا سے کہا۔ "مجھے تمہارے بغیر نیند کیسے آئے گی؟"

بوڑھے موہن سنگھ نے جوان بیوی کے منہ سے ایسی بات سنی تو بہت خوش ہوا اور دل ہی دل میں بولا۔ اب آتی جا رہی ہے راستے پر' ویرو اب تک بڑی لگاوٹ سے میاں کو دیکھ رہی تھی۔ آخر موہن سنگھ نے بھی پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "ویرو! بس کچھ دن کی بات ہے پھر ہم لوگ ساتھ ہوں گے۔"

"جو حکم سردار! ویسے نیند پھر بھی مجھے اکیلے نہیں آئے گی۔" ویرو نے آنکھیں میچتے ہوئے کہا۔

موہن سنگھ بیوی سے ایسے جملے سن کر پھولا نہیں سما رہا تھا۔ جاتے جاتے اس نے ویرو کو ذرا قریب کیا تو ویرو نے بڑے پیار بھرے لہجہ میں فرمائش کی۔

"کل صبح سنت بابا کے درشن کو جاؤں گی مجھے تھوڑے سے پھول منگوا دینا تا کہ بابا کو ہار پہنا کر دعا مانگ سکوں' منگوا دو گے نا؟"

موہن نے بیوی کے پیار بھرے لہجے سے متاثر ہو کر کہا۔ "ہاں' ہاں...... صبح ہی منگوا دوں گا۔ پھولوں کے لیے کیوں پریشان ہو رہی ہے؟" یہ بات کہہ کر موہن سنگھ کمرے سے نکلنے لگا اور پھر یاد دلاتا گیا۔

"ویرو کمرہ اندر سے بند کرنا نہ بھولنا۔"

بڑے بھائی کی آواز لکھن نے سنی اور ساتھ ساتھ وہ مشورہ بھی کان میں پڑا جو موہن سنگھ نے ویرو کو دیا تھا۔ اسے غصہ تو بہت آیا مگر کہتا کیا؟ ادھر ویرو کو اور کیا چاہیے تھا کمرہ اندر سے بند کرنے کی بات سن کر وہ بھی خوش ہو گئی۔ اس نے ذرا ہی دیر بعد دروازہ اندر سے

بند کردیا۔ پہلے وہ کچھ سوچتی رہی پھر اس نے چھپائے ہوئے کنگن اور انگوٹھی نکالی۔ میاں کے حساب لکھنے والی کاپی اور پنسل لی جگت کو خط لکھا اور پڑیا بنا کر رومال میں باندھ لی۔ پھر یہ سوچتے ہوئے سوگئی کہ صبح یہ رومال کسی طرح ماں جی کے سپرد کردوں گی۔

جگت نے ویرو کی چٹھی چار پانچ مرتبہ پڑھی لیکن پھر بھی دل نہ بھرا۔ آج سے پہلے اسے یہ پتا ہی نہیں تھا کہ ویرو لکھ پڑھ بھی سکتی ہے۔ وہ خود بھی تین چار جماعتیں ہی پڑھا تھا لیکن اب تک سب بھول چکا تھا۔ اسے پھر یہی خیال آنے لگا کہ ویرو نے کتنی ذہانت اور ہوشیاری سے زیورات ماں کے ہاتھ بھجوا دیے۔ وہ ویرو کی ذہانت سے مرعوب سا ہوگیا۔ پھر اسے یکا یک خیال آیا کہ وہ نیچے ہنومان کو کھڑا کر آیا تھا اس خیال کے آتے ہی جگت تیزی سے نیچے اتر کر باہر پہنچا۔ ہنومان اب تک کھڑا تھا۔ جگت نے جاتے ہی ہنومان سے کہا۔

''تیرے حصے کا مال بھنانے کی ابھی ضرورت نہیں ہے ہنومان' لیکن تجھے میرا ایک اور کام کرنا ہوگا۔'' یہ کہہ کر اس نے رومال میں بندھے ہوئے کنگن اور انگوٹھی ہنومان کی طرف بڑھائے۔

''ہنومان! اسے بیچ کر مجھے پیسے لادے۔ ہے ذرا جان جوکھم کا کام لیکن چوری کا مال خریدنے والے قابل اعتماد قسم کے سناروں سے تو ہی واقف ہوگا' ہے نا اور ہاں گاؤں سے کم از کم پانچ میل دور جا کر اس کا سودا کرنا اور کوشش کرنا وہ زیور تیرے سامنے ہی گلا ڈالیں۔''

ہنومان' جگت کی بات سن کر مسکرایا اور بولا۔ ''تجھے یہ سب سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے یہ تو میرے الٹے ہاتھ کا کام ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ہنومان نے سر سے پگڑی کھولی اپنے اور جگت کے زیور اس میں باندھے اور شام سے پہلے واپس آنے کا وعدہ کرکے چل دیا۔

مقدمہ سوا مہینے تک چلتا رہا۔ فریقین انصاف کے پلڑے اپنی اپنی طرف جھکانے کے لیے پورا پورا زور لگائے ہوئے تھے۔ جگت کا نانا بھی اپنے تمام تعلقات اور پرانے مراسم استعمال کررہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پیسا بھی پانی کی طرح بہتا رہا اور آخر کار وہی ہوا جو یہ چاہتے تھے۔ قتل کے الزامات سے سب بری کردیے گئے اس لیے کہ پولیس کوئی ثبوت پیش نہیں کرسکی۔ عینی شاہد بھی جو ملے وہ سب کے سب خود اس بلوے میں شریک تھے۔ پھر مقتول کسی ایک گھر یا خاندان کے لوگ بھی نہیں تھے۔ اس لیے یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کس نے کس کو مارا؟ جبکہ مرنے والوں سے نہ جگت سنگھ کی دشمنی تھی نہ موہن سنگھ کی اور اس خونیں ڈرامے کو ایک بلوے کی شکل دے دی گئی اور اتنا بڑا ہنگامہ کرنے کے الزام میں ہزارہ سنگھ کو سوا سال اور رام اور شیام کو نو نو مہینے قید کی سزا سنادی گئی۔ قتل کا مقدمہ تو ختم ہوگیا مگر ہزارہ کی سزا سن کر جگت کا خون پھر کھول گیا۔ اسے اس بات پر غصہ زیادہ تھا کہ دونوں دشمنوں کو اس کے ماموں سے کم سزا دی گئی۔ جگت کا خیال تھا کہ اگر رام اور شیام بری ہو گئے تو وہ عدالت سے باہر نکلتے ہی حساب چکا دے گا۔ مگر اس فیصلے نے اس کی ساری آرزوؤں پر پانی پھیر دیا۔ یہ باتیں سوچ سوچ کر جگت کا خون کھولنے لگا۔ اسے خیال آیا کہ اب میں تنہا ہی بدلہ لوں گا۔ قتل ایک کا ہو یا چار کا زیادہ سے زیادہ سزا تو پھانسی ہی ہے۔ پھر ایک ساتھ ہی ان سب کا ادھورا حساب پورا کردیا جائے گا۔ اگر قدرت کو نو مہینے اور انتظار کرانا

مقصود ہے تو یہ بھی سہی۔ ایسی باتیں سوچ سوچ کر جگت خود کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر اسے لگتا تھا کہ اگر اور سوچتا رہا تو اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ اسی بے چینی میں اس نے نانا کی دی ہوئی پیاری گھوڑی مانک کو تیار کیا اور سوار ہو کر ایڑ لگادی۔ مانک آن کی آن میں ہَوا سے باتیں کرنے لگی وہ جگت سے پیار کرتی تھی۔ اس کا ایک ایک اشارہ پہچانتی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا مگر آج روز کی طرح گرمی کی شدت نہیں تھی گھوڑی پر بیٹھے بیٹھے جگت نے آسمان کی طرف دیکھا۔ مانک کی طرح آج آسمان پر بادل بھی دوڑ رہے تھے۔ دونوں ہی اپنی منزل سے بے گانہ تھے۔ نہیں جانتے تھے کہ کہاں جانا ہے۔ مانک دوڑتی رہی اب جگت کو ہَوا میں خنکی محسوس ہونے لگی۔ پیڑ اور پودے بارش کے استقبال کے لیے تیار تھے۔ زمین کی دھول اڑ اڑ کر بادلوں سے ہمکنار ہونے کو بے چین تھی۔ دھول اڑتی تو پیڑ بھی جھوم جھوم کر گلے ملنے لگتی۔ موسم خوشگوار ہوگیا تھا ایسے میں جگت کے دل میں یکا یک ویرو کی یاد نے انگڑائی لی۔ اسے لگا جیسے سینے میں دل ٹھہر جائے گا۔ جگت نے تیزی سے مانک کی لگام کھینچی اور اسے واپس موڑ لیا۔ تیز رفتار گھوڑی رکتے رکتے بھی فاصلہ طے کرگئی۔ جگت نے مانک کی چکنی پیٹھ کو تھپتھپایا اور بولا۔ ''چل گھر کی طرف چل۔''

مانک نے جگت کی آواز سنی' کان کھڑے کیے اور چل دی۔ ابھی چند کھیت ہی پار کیے ہوں گے کہ بادل ٹوٹ پڑے۔ بوندا باندی کب ہوئی جگت کو پتا نہیں چلا اسے تو اس وقت ہوش آیا جب موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ مانک سر جھکائے بھاگی جارہی تھی۔ جگت ویرو کی یاد میں گم بارش میں بھیگ رہا تھا۔ تازہ ہَوا میں اب پیاسی مٹی کی سوندھی مہک بھی شامل ہوگئی تھی۔

موسم کی پہلی بارش ہو اور پنجاب کے دیہات خاموش رہیں ناممکنات میں سے ہے۔ سب بارش کی آمد کا انتظار کرتے ہیں۔ پانی پڑنے کی دیر تھی ننگ دھڑنگ بچے گلیوں میں شو مچاتے بارش میں نہانے نکل آئے۔ سہاگنیں چھتوں پر جا کر پڑوسنوں سے باتیں کرتے ہوئے برسات کا مزہ لے رہی تھیں لیکن ویرو اس وقت بھی چار دیواری میں قید تھی۔ کھلے صحن کو آج صبح ہی ڈھانپ دیا گیا تھا۔ چھت پر جانے والے دروازے پر تالا پڑا تھا۔ ہر سال بارش کے دنوں میں ویرو چھت پر ہوتی اور اس وقت تک نہاتی رہتی جب تک انگ انگ نہ بھیگ جاتا۔ جب تک جسم جواب نہ دے جاتا۔ مگر اس سال جب بارش آئی تو جسم پیاسا ہی رہ گیا۔ آج پڑوسنیں چھت پر تھیں اور ویرو خشک جسم اور باورے من کے ساتھ چھت کے نیچے۔

موہن سنگھ ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ ویرو جانتی تھی موسم کی پہلی بارش میں مرد کیا کیا کرتے ہیں اور اس کا میاں بھی دوسروں سے مختلف نہیں تھا۔ موہن سنگھ اس وقت دوسرے کسانوں کے ساتھ لال پری کے مزے لے رہا تھا۔ بارش کے آثار دیکھ کر جب موہن سنگھ کھیتوں سے چلنے لگا تو اس نے لکھن سے کہا تھا۔ ''میں شام کو گھر پہنچ جاؤں گا تو سارا کام نمٹا کر گھر آجانا۔''

موہن سنگھ چلا گیا مگر لکھن کا دل بھی آج کل کام میں کچھ زیادہ نہیں لگتا تھا۔ وہ جان گیا کہ ایسے موسم میں بھائی کہاں گیا ہے۔ پچھلے چند دنوں سے لکھن کو ویرو کے جوان جسم کا خیال بھی کچھ زیادہ ہی رہنے لگا تھا۔ وہ اکثر اسے پیار بھرے لہجے میں ''بھابی بھابی''

کہہ کر پکارتا تا کہ ویرو اس سے کسی طرح خوش رہے۔ کبھی کبھی لکھن کچھ اس سے بھی زیادہ ہمدردیاں جتاتا۔ وہ کہتا۔ ”تم فکر نہ کرو بھابی، میں بھائی سے کہہ سن کر تمہیں گھومنے پھرنے کی پوری آزادی دلا دوں گا مگر کبھی ہمیں بھی اپنوں کی نظروں سے دیکھ لیا کرو۔“ ویرو، لکھن کی ہمدردیوں کا مطلب خوب جانتی تھی۔ دیور کی آنکھوں کے شعلے اسے جلا جلا دیتے۔ لکھن کا دیکھنا ویرو کو ایسا لگتا جیسے وہ کپڑوں کے پار دیکھ رہا ہو۔ وہ اس سے دور ہی دور رہتی۔

آج موہن سنگھ جب لکھن سے کہہ کر چلا گیا تو لکھن کو موقع ہاتھ آیا۔ اس کے جاتے ہی وہ بھی گھر کی طرف چلا۔ ذرا ہی دور گیا تھا کہ راستے میں پانی نے آن لیا۔ اس کا سارا جسم بھیگ رہا تھا۔ اس کے باوجود جیسے بدن کے ایک ایک عضو میں آگ بھر گئی تھی۔ وہ کچھ اور تیز چلنے لگا۔ اب گھر سامنے نظر آ رہا تھا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے تالا کھولا اور اندر چلا گیا۔ ویرو رسوئی میں بیٹھی چولہا پھونک رہی تھی۔ وہ سمجھی دیور اور میاں آج جلدی گھر آ گئے ہیں۔ لکھن نے ایک نظر ویرو پر ڈالی اور بڑے میٹھے لہجے میں بولا۔

”کیوں بھابی کیا ہو رہا ہے؟“ ویرو نے جواب نہیں دیا۔ لکھن نے خاموشی پا کر ویرو کو پھر مخاطب کیا۔

”تم بھی کیا ہو بھابی! ہر وقت چولہا پھونکتی رہتی ہو، ذرا دیکھو، گاؤں کی عورتیں چھتوں پر بارش کے مزے لوٹ رہی ہیں اور تم رسوئی میں گھسی بیٹھی ہو۔“

ویرو کو تعجب ہو رہا تھا کہ دیور کو بھابی کا اتنا خیال کب سے ہونے لگا؟ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ لکھن پھر بولا۔

”مگر اس میں تمہارا بھی کیا قصور بھابی! گھر میں ہر طرف تو تالے پڑے ہیں۔ پھر تم کیا کر سکتی تھیں؟ ٹھہرو میں ابھی تمہارے لیے چھت کا تالا کھولے دیتا ہوں۔“

”لیکن تمہارا بھائی کہاں ہے؟“ ویرو نے پوچھا۔

”وہ بھی آ جائیں گے موسم رنگین دیکھ کر ذرا چسکی لگانے چلے گئے ہیں۔“ لکھن یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔ ویرو چپ ہو گئی۔ لکھن نے ویرو کو چپ دیکھا تو جلدی سے زینے کے پاس جا کر اوپر جانے کا دروازہ کھول دیا اور بولا۔

”بھابی تم جلدی سے چھت پر جا کر نہا لو ورنہ بارش کم ہو جائے گی۔ بھائی آ گئے تو میں تمہیں بھی نیچے بلا لوں گا۔“ ویرو کی آرزو پوری کرنے کے لیے چھت کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہ سوچا اور دوڑتی ہوئی چھت پر چلی گئی۔ پانی زوروں سے گر رہا تھا۔ پانی ویرو کے سلونے سلونے بدن کو چوم کر گرنے لگا۔ وہ جھومنے لگا۔ تیز پانی اسے گدگدانے لگا۔ وہ بار بار بچتی پانی بار بار چھیڑتا۔ آخر تنگ آ کر وہ پوری کی پوری بارش کی باہوں میں ڈوب گئی۔

سامنے اسے جگت کے گھر کا صحن نظر آ رہا تھا۔ اس نے دیکھا جگت اپنی گھوڑی باندھ رہا ہے اور بھیگا ہوا ہے۔ مگر اس سے پہلے کہ دونوں کی نگاہیں ملتیں نیچے سے لکھن کی آواز آئی۔ ”بھابی! جلدی سے نیچے آؤ۔“

لکھن نے بھیگے ہوئے کپڑے اتار دیے تھے۔ اب وہ صرف ایک چھوٹی سی نیکر پہنے تھا مگر چھت پر بارش سے ویرو کے کپڑے اس کے بدن سے ایسے چمٹ گئے تھے کہ جسم اور لباس کا فرق مٹ گیا تھا۔ لکھن کی آواز سن کر ویرو سمجھی موہن آ گیا ہے۔ وہ جلدی سے نیچے اتری اور بھیگے ہوئے کپڑے بدلنے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ لکھن نے دیکھا تو اسے ایسا

لگا جیسے ویرو چھت پر ہی لباس اتار آئی ہو۔ اس کے تن بدن میں پھر انگارے دہکنے لگے۔ اس نے چھت کے دروازے کو تالا لگایا اور رسوئی سے ہوتا ہوا ویرو کے کمرے میں گھس گیا۔ اس وقت دروازے کی طرف ویرو کی پیٹھ تھی۔ وہ چادر سے بال خشک کر رہی تھی۔ قدموں کی چاپ سنی تو مڑی مگر لکھن اتنی دیر میں چادر چھین کر اس کے منہ پر باندھ چکا تھا۔ ویرو نے ایک جھٹکا دیا اور پیچھے ہٹ گئی۔ اب لکھن اس کے سامنے تھا۔ لکھن جس کی آنکھوں میں اس وقت پھر وہی آگ تھی جو ویرو کو جلا جلا دیتی تھی۔ وہ آگ برابر بھڑکتی جا رہی تھی۔ ویرو نے لکھن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چادر کو اپنے منہ سے ہٹانے کے لیے ہاتھ بڑھائے مگر اسی وقت لکھن نے لپک کر ویرو کے ہاتھ پکڑ لیے اور بولا۔

”آج میری نہ ہوئی تو زندہ جلا دوں گا۔“

ویرو نے دیکھا کہ لکھن نے دوسرے ہاتھ سے زمین پر پڑی جلتی ہوئی لکڑی اٹھا لی ہے جو شاید وہ رسوئی سے نکال لایا تھا۔ لکھن کی حرکت پر ویرو غصے سے کانپنے لگی مگر منہ چادر سے بند تھا اور لکھن کے ہاتھ میں جلتی ہوئی لکڑی اس کے جسم سے بہت قریب تھی۔ ویرو کی آنکھوں میں خوف اور غصے کے ملے جلے جذبات دیکھ کر لکھن نے بڑے واہیات لہجے میں کہا۔

”ہائے ہائے، بھیگا بدن اور یہ غصہ، آج تو تیرا روپ اور غضب ہو گیا ہے۔“

ابھی لکھن بات ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ ویرو نے اس پر ہاتھ اٹھا دیا۔ مگر لکھن ہوشیار تھا اس نے ویرو کی کلائی مضبوطی سے تھام لی اور بولا۔

”آج زور نہیں چلنے دوں گا جانی، ترساتی کیوں ہے موقع سے فائدہ اٹھا کر دو جوان جسموں کی آگ کو ٹھنڈا ہو جانے دے۔“ یہ کہہ کر لکھن پھر ویرو کو اپنی طرف کھینچنے لگا۔ مگر ویرو نے لکھن کو زور سے دھکا دیا اور الگ ہو گئی۔ اسی وقت جگت، موہن سنگھ کے گھر کی دیوار پھاند کر صحن میں داخل ہوا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس وقت گھر میں ویرو کے علاوہ بھی کوئی اور ہو سکتا ہے۔ ابھی وہ کھڑا ہی تھا کہ کمرے کے اندر سے کسی مرد کی آواز سن کر چونک پڑا اندر کوئی کہہ رہا تھا۔

”اس سمے ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہیں ہے پیاری۔“

جگت فوراً لکھن کی آواز پہچان گیا۔ غصے اور حیرانی کے ملے جلے جذبات میں اس نے سوچا، تو آج دیور نے بھابی پر نیت خراب کر لی۔ مگر ویرو کی آواز کیوں نہیں آئی؟ کیا لکھن اس کی مرضی سے......؟؟ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ اسے پھر لکھن کی آواز سنائی دی۔

”ایک بار اپنی آنکھوں سے ہاں کہہ دے پھر منہ کھول دوں گا۔“

جگت نے جملہ سنا اور سمجھ گیا کہ لکھن نے ویرو کو بے بس کر رکھا ہے۔ اس نے سوچا اس وقت طاقت کی نہیں ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ وہ فوراً واپس پلٹا مگر اندر سے لکھن کی آواز نے اس کے قدم تھام لیے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”زیادہ بننے کی ضرورت نہیں ہے بھابی میں جانتا ہوں جگت تجھے خراب کر چکا ہے۔ پھر بھی اس میں تیرا قصور نہیں سمجھتا۔ آخر بوڑھے اور جوان کی نبھ بھی کیسے سکتی ہے؟ تین سال شادی کو ہو چکے مگر گھر میں پالنا نہیں بندھ سکا۔ پھر بھی مجھے تجھ سے ایک شکایت ضرور ہے، مجھ جیسا مرد جب گھر میں

تھاتو جگت کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

لکھن ابھی یہی بول پایا تھا کہ ویرو نے اس کے پیٹ پر ایک لات ایسی رسید کی وہ وہیں گر گیا۔ ہاتھ سے جلتی ہوئی لکڑی چھوٹ گئی۔ ویرو نے جلدی جلدی منہ پر بندھی چادر کھولی اور لکھن کو دوبارہ اٹھتے دیکھ کر مدد کے لیے شور کرنے ہی والی تھی کہ دروازے پر زور سے دستک ہونے لگی۔ دستک سن کر لکھن وہیں بیٹھ گیا۔ ایک ہی لمحہ میں جیسے اس کا تمام زور ختم ہو گیا تھا۔ اب ویرو کی جگہ وہ بے بس نظر آنے لگا۔

ویرو نے کانپتے ہاتھوں سے کنڈی کھولی۔ لیکن باہر کوئی بھی نہ تھا۔ وہ سوچنے لگی پھر دروازے پر دستک کس نے دی؟ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس کی نظر دیوار پر پڑی جس کی جھری میں سے جگت کا سر اور آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ سمجھ گئی کہ دستک دینے والا جگت ہی تھا اور حقیقت تھی بھی یہی۔ جگت نے اپنے اوپر الزام سن کر دستک اس لیے دی تھی کہ جب دروازہ لکھن کھولنے آئے گا اسی وقت وہ سامنے آ کر اسے ڈھیر کر دے گا۔ اپنے اوپر لگائے ہوئے الزام کی سزا لکھن کو کم از کم وہ یہی دینا چاہتا تھا مگر جب دروازے پر ویرو نظر آئی تو وہ مایوس ہو گیا لیکن اس مایوسی میں بھی اسے ایک سکون ملا تھا ایسا ہی سکون جیسا گھبراہٹ کے ساتھ ویرو کے چہرے پر بھی تھا جو اس بات کی علامت تھی کہ ویرو کی عزت بچ گئی ہے۔

ویرو اور جگت کی نگاہیں ملیں تو ویرو نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ دونوں ابھی تک ایک دوسرے کو دیکھ ہی رہے تھے کہ دور سے موہن سنگھ جھومتا جھامتا گھر کی طرف آتا نظر آیا۔ دروازہ کھلا چھوڑ کر ویرو جلدی سے ہٹ گئی اور چولہے کے پاس جا کر رسوئی میں لگ گئی۔ موہن نے دروازہ کھلا دیکھا تو غصے سے بولا۔ "تالا کس نے کھولا؟"

"تمہارے بھائی نے۔" ویرو نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"وہ اتنی جلدی گھر کیسے آ گیا؟"

"اسی سے پوچھ لو۔" موہن سنگھ بیوی کا جملہ سن کر کمرے میں گیا تو لکھن دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑے چارپائی پر پڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ موہن کچھ پوچھے لکھن نے خود ہی صفائی پیش کی۔

"پیٹ میں بڑے زور کا درد ہو رہا تھا اس لیے چلا آیا۔ ابھی ابھی آیا ہوں۔"

ویرو یہ سن کر تلملائی تو بہت مگر بولی کچھ نہیں پھر بھی دل ہی دل میں کہنے لگی۔ "ابھی تو ایک ہی لات پڑی ہے دوسری بھی پڑ جاتی تو خون کی قے کرنے لگتا آیا تھا بھابی پر ہاتھ ڈالنے۔ لفنگا کم ذات کہیں کا۔"

لکھن کے جملے اب بھی ویرو کے دل میں طوفان جگائے ہوئے تھے اور دوسری طرف یہی طوفان جگت کے دل میں بھی تھا۔ انتقام لینے میں جو تاخیر ہو رہی تھی اس سے وہ بے چین تھا لکھن کے الفاظ اب بھی اس کے دماغ پر ہتھوڑے چلا رہے تھے لکھن کا جگت پر اتنا بڑا الزام لگا کر زندہ گھومنا جگت کے لیے بہت بڑی گالی تھی۔ لیکن جانے کیا بات تھی ویرو جب بھی جگت کے سامنے آتی وہ اپنا سارا غصہ بھول جاتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ اس کی آنکھوں میں اترا ہوا خون ویرو کے آتے ہی کہیں اور چھپ گیا۔ جگت اندر تک سے شریف اور سیدھا سادا ہو جاتا۔ اپنی اس کمزوری کو جگت پہچاننے لگا تھا۔ اسی لیے ویرو کے سامنے سب وہ سخت لہجے میں بات بھی نہیں کر پاتا تھا۔

اس وقت بھی اس کے ساتھ یہی سب کچھ ہوا اور وہ بے بس سا ہو کر کھویا کھویا گاؤں کی گلیوں میں نکل

گیا۔ بغیر کسی منزل کے چلتا گیا چلتا گیا۔ راستے میں ہنومان نے جگت کو اس طرح گھومتے دیکھا تو بھاگ کر قریب آیا اور جگت سے لپٹ گیا۔ جگت، ہنومان کی اس اچانک آمد سے چونک گیا تھا۔ وہ اسے بھی کھوئی کھوئی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ہنومان بولا۔ "یار! میں تجھے ہی تلاش کر رہا تھا۔ موسم کی پہلی بارش ہوئی ہے۔ ایسی سلونی شام پیئے بغیر گزارنا ظلم ہے۔ چل گتے میں چلتے ہیں۔"

پیتے پیتے بھی ہنومان نے کئی مرتبہ جگت سے بات کرنی چاہی مگر آج جگت جانے کن خیالوں میں گم تھا چپ ہی رہا۔ پروائی اس کے دل کی آگ کو بھڑکا رہی تھی اور وہ خاموش تھا۔ ہنومان نے جگت کو اتنا چپ چپ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بس سمجھا تو اتنا کہ جگت آج کچھ پریشان ہے۔ یہ سوچ کر کہنے لگا۔ "جگے تو میرا جگری یار ہے تیرا چپ چپ رہنا مجھے پریشان کر رہا ہے جو بھی بات ہو مجھے بتا دے میں تیرے لیے جان بھی دینے کو تیار ہوں۔"

جگت نے ہنومان کی بات سنی تو مختصر سا جواب دیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے ہنومان۔" یہ کہہ کر جگت دیوار پر لگے ہوئے ایک پوسٹر کو غور سے دیکھنے لگا۔ ہنومان کی نظریں بھی جگت کی نظروں کا پیچھا کرتی ہوئی پوسٹر تک پہنچیں پوسٹر میں ایک جوان فوجی وردی پہنے بندوق ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ اس کے نیچے لکھا تھا۔

"فوج میں بھرتی کھلی ہوئی ہے۔"

ہنومان نے پوسٹر سے نظریں ہٹاتے ہوئے جگت سے پوچھا۔ "کیوں دیکھ رہا ہے ایسے؟ کیا فوجی بننے کا ارادہ کر لیا ہے؟ یاد ہے تجھے پولیس انسپکٹر نے بھی ایک دفعہ پولیس میں بھرتی ہونے کا مشورہ دیا تھا۔"

ہنومان نے یہ بات کہتے کہتے ایک مرتبہ پھر پوسٹر پر نظریں جما دیں اور بولا۔

"ویسے یہ وردی تجھ پر جچے گی بہت اور رعب دار لگے گا۔"

جگت ہنومان کی بات سن کر ہنس پڑا اور پوسٹر کو ایک نظر دیکھ کر ہنومان سے بولا۔ "مجھے وردی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے یار، مجھے تو یہ بندوق پسند آ رہی ہے۔ سب ہی کچھ چلانا سیکھ لیا مگر بندوق چلانا اب تک نہیں آیا۔" یہ کہتے کہتے جگت کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ وہ کھڑا ہو گیا اور پوسٹر کو گھورتے ہوئے مٹی کا پیالہ شراب سمیت پوسٹر پر کھینچ مارا۔ پھر ہنومان کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے بولا۔

"چل ہنومان، گھر چلیں۔"

ہنومان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ جگت کو بیٹھے بیٹھے یہ کیا ہو گیا ہے مگر پھر بھی وہ بولا کچھ نہیں۔ دونوں دوست ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے وہاں سے نکل گئے۔ راستے بھر جگت یہی سوچتا رہا کہ بندوق چلانا سیکھنے کے لیے کیا فوج میں بھرتی ہونا پڑے گا؟

گھر پہنچا تو ماں کھانا لیے انتظار کر رہی تھی۔ جگت نے ماں کو کھانا لیے بیٹھے دیکھا تو بولا۔ "میں اس وقت کھانا نہیں کھاؤں گا۔ ماں..... تو کھا لے۔"

دکھیاری ماں نے ایک نظر بیٹے کو دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ جگت سے وجہ پوچھے جگت چھت پر چلا گیا۔ ماں خاموش بیٹھی رہ گئی۔ اس نے کھانا اٹھایا اور رسوئی کے چھینکے میں رکھ کر خود بھی چارپائی پر جا کر بھوکی ہی پڑ گئی۔

جگت چھت پر پہنچا اور بغیر کپڑے بدلے ہی چارپائی پر لیٹ گیا۔ آسمان اتنی بارش ہو جانے کے بعد بھی ابر آلود تھا۔ بادل ہوا سے اٹکھیلیاں کر رہے

رتھے۔ تیز ہَوا چلتی تو بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہَوا سے بچنے کے لیے آسمان پر اِدھر اُدھر دوڑنے لگتے لیکن ہَوا ہر جگہ انہیں چھیڑنے پہنچ جاتی۔

جگت بہت دیر تک یہ آنکھ مچولی دیکھتا رہا۔ پھر آنکھیں موند کر چارپائی پر کروٹ لے لی۔ اب اندھیرا کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ برسات کی رات میں جھینگروں کی آواز سناٹے میں مزید اضافہ کررہی تھی کہ اتنے میں جگت کو برابر کے گھر کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک کر اٹھا اور اپنی چھت کی منڈیر کے پاس جاکر ویرو کے گھر میں جھانکا۔ باہر کا دروازہ لکھن نے کھولا تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں لوٹا اور دوسرے ہاتھ میں لالٹین اور ڈانگ لیے دروازے سے نکل رہا تھا۔ باہر جاتے جاتے اس نے ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا تو بڑا بھائی موہن سنگھ کمرے سے نکل کر لکھن کے پاس آیا اور اسے باہر بھیج کر اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔

جگت نے لکھن کو گھر سے باہر نکلتے دیکھا تو انتقام کا خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا اور پلک جھپکتے ہی جگت نے چارپائی کے پاس رکھی اپنی مخصوص ڈانگ اٹھائی اور سیڑھیاں اتر کر اپنے صحن سے ہوتا ہوا مانک کے اصطبل میں آ گیا اس نے گھوڑی کھولی اور بڑی آہستگی سے جگت اور مانک گھر سے نکل کر رات کی سیاہی میں گم ہوگئے۔

ویرو کی لات جب سے لکھن کے پیٹ پر پڑی تھی اس وقت سے وہ درد میں مبتلا تھا۔ بڑا بھائی موہن سنگھ اس کے برابر ہی سونے کے لیے لیٹا تھا۔ لکھن کے بار بار کراہنے سے موہن سنگھ کی نیند اڑ جاتی۔ آخر تنگ آ کر اس نے لکھن سے کہا "جا لکھنے، پیٹ میں درد ہے تو اٹھ کے جنگل ہو آ۔"

لکھن نے موہن سنگھ کا مشورہ سن تو لیا مگر برسات کی رات اسے اور ڈرائے دے رہی تھی۔

اس نے سوچا گاؤں سنسان پڑا ہوگا۔ اس وقت تو شاید آوارہ کتے بھی پانی سے بچنے کے لیے جہاں آڑ ملی ہوگی وہیں چھپ کر پڑ گئے ہوں گے اسے بستر پر پڑے ہوئے بھی باہر کے سناٹے سے ہول سا آنے لگا اور گھبرا کر اس نے چادر اپنے اوپر کھینچ لی۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ پھر ایک مرتبہ اس کے پیٹ میں بڑی زور کی ٹیس سی اٹھی اور پوری کوشش کے باوجود بھی لکھن کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ اس نے تکیہ اپنے پیٹ کے نیچے دبالیا اور پھر خاموش ہوکر لیٹ گیا مگر درد برابر بڑھے جارہا تھا۔ آخر پھر موہن سنگھ نے پہلے پیار سے اور پھر سختی سے لکھن کو ڈانٹا کہ جب اتنی ہی تکلیف ہے تو پھر کہنا کیوں نہیں مانتا؟ بھائی کی ڈانٹ سن کر ایک مرتبہ تو لکھن کا دل چاہا کہ بڑے بھائی کو سچ سچ بتادے کہ پیٹ میں ویرو نے لات ماری تھی تکلیف اس کی ہے اور کوئی بات نہیں۔ مگر چپ چاپ اٹھا اور یہ کہہ کر کہ "میں زیادہ دور نہیں جاؤں گا مجھے ڈر لگتا ہے۔" باہر جانے لگا۔ موہن سنگھ نے لکھن کو دیکھا اس نے ایک ہاتھ میں لوٹا اٹھا رکھا تھا موہن نے کہا۔ "لکھن، لالٹین اور ڈانگ بھی لے لے تاکہ کیچڑ میں پھسل وسل نہ جائے۔"

لکھن نے موہن سنگھ کی بات سنی اور چپ چاپ لالٹین اور ڈانگ اٹھا کر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ ابھی چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ گاؤں کا سناٹا دیکھ کر لرز گیا اور اس نے فیصلہ کرلیا کہ زیادہ دور نہیں جائے گا۔ بس سامنے پیڑوں کے پاس جو گرا ہوا مکان ہے اسی کی دیوار کے پاس بیٹھ جاؤں گا۔ وہ یہ سوچتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ یکایک تیز ہَوا کے ایک جھونکے سے

ہاتھ کی لالٹین گل ہوگئی۔ اس نے چاہا کہ واپس ہوجائے مگر پیٹ میں گڑبڑ اتنی تھی کہ واپس جانا اور دشوار لگنے لگا۔

بجھی ہوئی لالٹین اس نے قریب کے پیڑ کے نیچے رکھ دی تاکہ واپسی میں لے جاسکے۔

سنسان راستا، ہَوا کی سرسراہٹ اور پیڑوں کے شور مچاتے پتے ماحول کو اور خوفناک بنائے ہوئے تھے لکھن کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا پھر بھی وہ سامنے کے کھنڈر تک پہنچنے کے لیے تیز تیز قدم اٹھانے لگا کچے راستے کی مٹی نے بارش کے بعد کیچڑ کی صورت اختیار کرلی تھی۔ اونچے نیچے راستے پر تھوڑا تھوڑا پانی موجود تھا۔ لکھن کے تیز تیز چلنے سے ایک خاص قسم کی آواز پیدا ہورہی تھی۔ وہ جب بھی ایک پاؤں کیچڑ سے نکال کر دوسرا قدم لیتا اس کے قدم اور کیچڑ مل کر ایسی آواز پیدا کرتے جیسے انسان افسوس کے موقعوں پر اپنی زبان تالو سے ملا کر افسوس کی آواز پیدا کیا کرتے ہیں۔ "چہ چہ چہ" لکھن آگے بڑھتا گیا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اسی کھنڈر میں اس کی موت چھپی بیٹھی ہے۔ کھنڈر کی ایک دیوار سے چپکا ہوا جگا اپنی ڈانگ میں لگی ہوئی برچھی تولے لکھن کا منتظر تھا۔ اپنی گھوڑی مانک کو وہ اس کھنڈر کے دوسری طرف پیڑوں کے نیچے باندھ آیا تھا تاکہ لکھن کی نظر مانک پر نہ پڑے۔ جوں جوں لکھن کے قدموں کی چھپ چھپ قریب آرہی تھی جگت کی رگوں میں دوڑتا خون انتقام کے جلتے ہوئے زخموں کی تپش سے کھول کر جگت کے جسم کی شریانوں سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ لکھن نے کھنڈر کی پہلی دیوار کے پاس پڑے اینٹوں کے ڈھیر پر پاؤں رکھا اور جگت کی گرفت ڈانگ میں لگی برچھی پر اور سخت ہوگئی۔ اس نے سانس روک لیا کہ کہیں سانس کی آواز سن کر لکھن چوکنا نہ ہوجائے۔ رحم، ظلم، گناہ اور ثواب ان باتوں سے جگت اس وقت بے بہرہ تھا۔ اسے اگر کچھ یاد تھا تو صرف قتل، بدلہ اور انتقام۔ لکھن اینٹوں کے ڈھیرے سے اتر کر دیوار کے قریب آیا ہی تھا کہ جگت نے اپنے پاؤں سے اڑنگا لگا دیا۔ لکھن جگت کے پاؤں سے اُلجھ کر ایسے گرا کہ ہاتھ سے لوٹا اور لاٹھی دونوں چھوٹ گئے۔ وہ یہ سمجھ کر کہ ٹھوکر لگی ہے اندھیرے کو گالیاں دیتا ہوا اٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ کوئی کود کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ لکھن پھر الٹ گیا۔ اس نے دیکھا ایک شخص ہاتھ میں برچھی لیے اس کے سینے پر سوار ہے۔ لکھن کے ہوش اڑ گئے۔ وہ چیخنے کے لیے منہ کھول ہی رہا تھا کہ جگت نے تیزی سے اپنا ایک پاؤں لکھن کے منہ میں گھسیڑ دیا۔ اس کے جوتے نے لکھن کی زبان کے ٹکڑے اڑا دیے۔ وہ تڑپا مگر جگت نے ایک مرتبہ پھر پاؤں پر زور دے کر لکھن کا منہ ایسے کچلا جیسے وہ سانپ کا منہ ہو اور بولا۔

"سالے، حرامی پنچ تو نے اسی زبان سے کہا تھا نا کہ میں نے تیری بھابی کو خراب کیا ہے آج میں اس زبان کو اس قابل ہی نہ رکھوں گا کہ پھر کوئی لفظ اس سے نکل سکے۔ جوانی کا زور ویرو کو دکھانے گیا تھا، کتے۔"

لکھن نے جگن کی آواز سنتے ہی اس طرح ہاتھ جوڑے جیسے کہہ رہا ہو۔ "جگت اس مرتبہ چھوڑ دے پھر کبھی ایسی غلطی نہیں ہوگی۔"

مگر اتنی دیر میں جگت نے برچھی تول کر لکھن کے پیٹ میں پرودی...... لکھن تڑپا۔ دونوں ہاتھوں سے برچھی پکڑ لی۔ مگر برچھی اپنا کام کرچکی تھی۔ جگت نے ذرا سا زور لگایا اور برچھی کو ترچھا آڑا کرکے اوپر کھینچا تو برچھی پیٹ کو ناف سے سینے تک چیرتی ہوئی باہر

آ گئی۔ ساتھ ہی خون کا ایک فوارہ سا نکلا اور لکھن آن کی آن میں ٹھنڈا ہو گیا۔

جگت نے اپنا پیر لکھن کے منہ سے کھینچ کر باہر نکالا۔ کیچڑ اور اینٹوں کے درمیان پڑی لاش پر نفرت سے نظر ڈالی اور منہ پر تھوکتے ہوئے بولا۔ ”اب جگا اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک تیرے بھائیوں کا بھی حشر تجھ جیسا نہ کر دے۔“ یہ کہہ کر جگت نے اپنی خون آلود برچھی کو لکھن کے کپڑوں سے صاف کیا تیزی سے مانک کے پاس آیا اور اسے کھول کر اندھیرے میں گم ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک مانک کی ٹاپیں سنائی دیں پھر معدوم ہو گئیں۔ گھوڑی کے اٹھتے ہوئے ہر قدم کے ساتھ جگت اپنے گھر، گاؤں، سنگ، ساتھیوں، پیار اور انتقام سب کو پیچھے چھوڑے جا رہا تھا اور دور کہیں کتے رو رہے تھے۔

لکھن کے گھر سے نکلتے ہی بڑے بھائی موہن سنگھ نے صحن کا دروازہ بند کر دیا اور ویرو کے کمرے کے بند دروازے کو مڑ کر دیکھا۔ اسے خیال آیا کہ اس وقت تنہائی سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہے۔ ویرو اندر کمرے میں ابھی تک جاگ رہی تھی اور لکھن کی اس گھٹیا حرکت پر اب تک بے چین تھی۔ وہ جتنا سوچتی شکی میاں اور بدمعاش دیور کے لیے ہر لمحے اس کے دل میں نفرت بڑھتی جاتی۔ آج اسی جگت نے عین موقع پر آ کر اس کی عزت بچائی تھی جسے میاں اپنا دشمن جانتا تھا لیکن پھر بھی وہ یہ بات کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ کتنے کمینے ہیں یہ لوگ جو جگت پر بدکاری کا الزام لگاتے ہیں اور خود بدکاری کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے سوچا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ رہ کر زندگی کو برباد کرنے سے بہتر ہے کہ بغاوت کر کے اپنے من چاہے مرد کا گھر آباد کر لوں۔ ویرو کڑھ کڑھ کر جینے یا خودکشی کرنے کی قائل نہ تھی۔ اس نے سوچا جگت سے مل کر معلوم کروں کہ کیا وہ اسے اپنانے کے لیے تیار ہے؟ مگر یہ سوچتے ہی ویرو کو جگت کی ماں یاد آ گئی۔ وہ ویسے تو بہت چاہتی تھی اسے لیکن کیا بطور بہو بھی قبول کر لے گی۔ ماں نے ایک بار کہا تھا کہ جگت کے لیے لڑکی پسند کر لی گئی ہے۔ چندن کور نام ہے اس کا تو اب اسے وہ مقام کیسے مل سکتا ہے وہ چندن کور کا سہاگ کیسے چھین سکتی ہے؟ پھر جگت اس کا اتنا خیال کیوں کرتا ہے کیا پتا چندن کور جگت کو پسند نہ ہو......

ویرو کا دل اس کے دماغ پر ایسے ہی سوالات کے ہتھوڑے چلا رہا تھا کہ دروازے پر دستک کے ساتھ میاں کی آواز آئی۔ ”ذرا جلدی سے دروازہ کھولنا۔“

ویرو چونک گئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ موہن سنگھ کی آنکھوں میں شرارت نظر آ رہی تھی۔

”لکھن ذرا باہر گیا ہے۔ میں نے سوچا موقع ہے کتنے دن ہو گئے تمہارے بدن کا قرب نہیں ملا۔“ یہ کہہ کر موہن نے ویرو کا ہاتھ پکڑ لیا مگر ویرو نے فوراً ہاتھ چھڑایا اور دور ہٹ گئی۔

”یہ وقت روٹھنے اور منانے کا نہیں ہے جانی۔ وہ الو کا پٹھا ابھی واپس آ جائے گا۔“ موہن سنگھ نے بالکل بازاری لہجے میں کہا۔

ویرو کو بہت غصہ آیا کہ اس نے سوچا صاف صاف کہہ دوں کہ ”تجھ سے روٹھنا اور منا کیسا؟ تجھ میں رکھا ہی کیا ہے ابھی بس دو منٹ میں......! لیکن بوڑھے کھوسٹ میاں کو طعنہ دینے سے کیا حاصل؟ یہ سوچ کر بات بدلتے ہوئے بولی؟ ”گھر میں جوان جہان دیور ہیں ان کی شادیاں کرنے کی فکر کرو۔ میں اکیلی گھر کا کام کرتے کرتے تھک جاتی ہوں۔“

موہن نے ویرو کی پیٹھ سہلائی اور پیلے پیلے دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ”ارے وہ تو جیل میں ہیں ان کی ابھی سے کیا فکر ہے۔ تنہائی ملی ہے تو اپنی بات

کریں......!“

اب ویرو بھلا کیا بات کرتی۔ اس وقت بھی رہ رہ کر اسے لکھن کی وہی گھٹیا حرکت یاد آنے لگی۔ بار بار بات اس کے ہونٹوں تک آ کر لوٹ جاتی۔

اتنے میں تیز ہَوا کی سرسراہٹ کے ساتھ باہر سے ایسی آواز آئی جیسے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا ہو۔ موہن کا سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ اس نے گالی دیتے ہوئے کہا۔ ”ہوں...... بے وقوف اتنی جلدی آ گیا یہیں کہیں قریب ہی بیٹھ گیا ہو گا ڈرپوک۔“

ویرو کو چھوڑ کر وہ پیر پٹختا ہوا دروازہ کھولنے چلا گیا۔ مگر دروازے پر کوئی بھی نہ تھا۔ اس نے لالٹین اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور دور تک گھپ اندھیرا دیکھ کر اس کا بدن خوف سے کانپ گیا۔ اتنے میں ہَوا کا ایک اور جھونکا آیا اس سے دروازے پھر زور سے ٹکرائے۔ پہلے وہ چونکا مگر پھر خود ہی اس کی سمجھ میں آ گیا کہ دروازے پر کسی نے دستک نہیں دی تھی بلکہ تیز ہَوا سے دروازے آپس میں ٹکرا کر شور مچا رہے تھے۔ اب اسے احساس ہوا کہ لکھن کو کیوں اکیلا جانے دیا۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا بادل گرجے، بجلی چمکی اور بارش پھر ٹوٹ پڑی۔ پانی سے بچنے کے موہن جلدی سے کمرے میں چلا گیا۔

کافی وقت گزرنے کے باوجود نہ بارش تھمی اور نہ لکھن واپس آیا تو موہن کو فکر ہوئی۔ اس نے ویرو کو بلایا۔ ہاتھ میں لالٹین تھامی اور سر پر ٹاٹ کا ٹکڑا ڈال کر دونوں باہر نکلے۔ قریب میں رہنے والے رشتہ داروں کو جگایا اور کہا۔

”لکھن آدھے گھنٹے سے گیا ہوا ہے اب تک واپس نہیں آیا۔“ یہ سن کر سب پریشان ہو گئے۔ ہر ایک جانتا تھا کہ لکھن بڑا ڈرپوک ہے۔ وہ نہ زیادہ دور گیا ہو گا اور نہ اتنی دیر تک رات کو باہر رہ سکتا ہے۔ ذرا سی دیر میں سارے مرد لالٹینیں، بیڑیاں اور ہتھیار لے کر لکھن کی تلاش میں چل پڑے۔

موسلا دھار بارش جاری تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ کبھی کبھی جب بجلی چمکتی تو دور تک اجالا ہو جاتا۔ ہَوا کے زور دار تھپیڑے آگے بڑھنے والوں کے قدم اکھاڑ دیتے تھے۔ مینڈکوں کی ٹرٹر سے فضا اور خوفناک معلوم ہو رہی تھی۔ ایسے میں ایک مرتبہ پھر بجلی چمکی اور اس کی روشنی میں کسی نے پیڑ کے پاس ایک لالٹین پڑی دیکھی۔ دوسرے ہی لمحہ کئی بیڑیوں کی روشنیاں وہاں پڑیں اور موہن نے کہا۔ ”ہاں، لکھن یہی لالٹین لے کر گھر سے نکلا تھا۔“ یہ کہہ کر موہن ایسے کانپنے لگا جیسے اسے لرزہ چڑھ گیا ہو۔ ”تب تو وہ بھی یہیں کہیں ہو گا۔“ سب آگے بڑھے۔ موہن کے پاؤں اب لڑکھڑانے لگے تھے ذرا آگے جا کر کسی نے بیڑی کی روشنی پھینکی تو ایک پیر نظر آیا۔

”وہ دیکھو معلوم ہوتا ہے کیڑے نے کاٹ لیا ہے۔“ لوگوں نے قریب جا کر دیکھا تو لکھن نہ تھا، لکھن کی لاش تھی۔ لاش کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ منہ کھلا ہوا تھا اور پیٹ چیر دیا گیا تھا۔ قریب ہی گوشت کے لوتھڑے پڑے تھے اور خون بارش کے پانی کے ساتھ دور تک پھیل گیا تھا۔ منظر ایسا تھا کہ مضبوط سے مضبوط دل کا آدمی بھی دہل کر رہ جائے۔

”ہائے میرا بھائی۔“ موہن سنگھ کی چیخ گونجی اور وہ وہیں بیٹھ گیا۔ پھر زور زور سے روتے ہوئے بولا۔

”میرے لکھن کو جگے نے مار ڈالا۔“ اس بھیانک اندھیرے میں موہن کی چیخوں سے آدھا گاؤں جاگ گیا۔ جگت کے ماں باپ بھی اٹھ گئے تھے۔ سوہن سنگھ نے دروازہ کھول کر لالٹین کی لو اونچی کر کے باہر دیکھا تو آنگن میں گھوڑی نہیں تھی۔ دل دھڑک کر سینے میں رک گیا۔ سوہن سنگھ فوراً چھت پر گئے

وہاں بھی جگت نہیں تھا۔ دو گھڑی میں سارا معاملہ ان کی سمجھ میں آ گیا۔ جگت کو گھر میں نہ پا کر اس کی ماں کا چہرہ بھی اتر گیا۔ اسے پورا گھر گھومتا ہوا نظر آیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔

برابر والے گھر سے رونے کی آوازوں کے درمیان سوہن سنگھ نے کچھ لوگوں کے قدموں کی چاپ قریب آتے سن کر کھڑکی کھولی فوجدار اور چار پانچ سپاہی سامنے کھڑے تھے۔

"کہاں ہے تمہارا بیٹا؟" تحکمانہ لہجے میں سوال کیا گیا۔ سوہن سنگھ نے اپنے آپ کو سنبھالا لیکن اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتے فوجدار کے اشارے پر تین چار سپاہی گھر میں داخل ہو کر تلاشی لینے لگے۔

"جگت تو شام سے گھر پر نہیں ہے۔ وہ تو اپنے نانا سے ملنے گیا ہے۔" سوہن سنگھ نے فوجدار سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

فوجدار بولا۔ "موہن سنگھ کے بھائی کو قتل کر دیا گیا ہے معلوم ہوا ہے اس گھر سے تمہاری کئی پشتوں کی دشمنی چل رہی ہے نا؟"

اتنے میں سپاہیوں نے باہر آ کر اطلاع دی۔ "گھر میں بڑھیا اکیلی ہے اور کوئی نہیں۔"

"سوہن سنگھ۔" فوجدار نے پوچھا۔ "لڑکا گھوڑی لے کر گیا ہے۔"

سوہن سنگھ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لکھن کی لاش کے قریب ہی کیچڑ میں گھوڑی کے قدموں کے نشان ملے ہیں۔" فوجدار بولا۔ پھر اس نے مڑ کر حکم دیا۔

"چار آدمی جیپ لے کر دھرم پور تک تعاقب کرو دوسرے سپاہیوں سے کہہ دو کہ پورے گاؤں کو چھان ڈالیں اور ہاں اس ہنومان کی بھی اچھی طرح خبر لے لینا۔ میں یہیں بیٹھا ہوں۔ جلدی اطلاع دینا۔"

سپاہیوں کے چلے جانے کے بعد فوجدار نے جگت کے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارا بیٹا میری نوکری کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ سنہا صاحب صبح ہی غصہ میں پھنکتے ہوئے آن دھمکیں گے۔ اس روز تو سنہا صاحب نے تمہارے بیٹے کو بچہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا لیکن یہ بچہ تو اب ہمارے ہی سروں پر اپلے تھاپنے لگا ہے۔"

اسی طرح آدھا گھنٹہ گزر گیا سارا گاؤں جاگ رہا تھا۔ بارش رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔

جیپ کی آواز سن کر سب چونکے۔ فوجدار کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "معلوم ہوتا ہے پکڑا گیا آخر بچہ ہے نا، پولیس سے کہاں تک بھاگتا؟"

فوجدار کی بات سن کر سوہن سنگھ کا دل ایک مرتبہ پھر زور سے دھڑکا لیکن واپس آنے والے سپاہیوں کے چہرے پر کامیابی کے آثار نہ تھے۔

"صاحب، ہم روپالی ندی تک گئے لیکن ندی میں تو بڑا زبردست طوفان آیا ہوا ہے کوئی بھی اسے پار نہیں کر سکتا۔ راستے میں ایک گاڑی والے نے یہ ضرور بتایا کہ اس نے ایک گھڑسوار کو ندی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے۔"

فوجدار نے تعجب سے کہا۔ "تو کیا اس لڑکے نے ایسے طوفان میں اپنی گھوڑی ندی میں اتار دی ہو گی؟ شاید قانون سے بچنے کے لیے اپنی جان خود خطرے میں ڈال دینا آسان لگا ہو گا۔ نادان کہیں کا۔" ایسی باتوں سے سوہن سنگھ کو سوگوار کر کے فوجدار چلا گیا۔ سامنے والے گھر میں تڑپا دینے والے انداز میں بین اب تک جاری تھے اور اس گھر میں ماں باپ کا دل خاموشی سے رو رہا تھا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی مگر جگت کے نانا حسب عادت جاگ رہے تھے۔ موسلا دھار بارش اور بادل کے گرجنے کی آوازوں کے درمیان اچانک انہوں نے دروازے پر زور سے دستک ہوتی سنی۔ پہلے تو انہوں نے یہ سوچ کر توجہ نہ کی کہ تیز ہوا کے تھپیڑوں سے دروازے شور کر رہے ہوں گے ورنہ دروازہ کھٹکھٹانے والا آواز ضرور دیتا لیکن جب دروازہ برابر کھٹکھٹایا جاتا رہا تو ان کو اٹھنا پڑا۔ ہاتھ میں لالٹین لیے وہ دروازے میں آئے اور کنڈی کھولی تو سامنے گھوڑی نظر آئی۔ "ارے مانک۔" بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا پھر گھوڑی کو کسی سوار کے بغیر دیکھ کر نانا کو تعجب بھی ہوا۔ انہوں نے دیکھا گھوڑی کی زین کے ساتھ جگت کی ڈانگ بھی بندھی ہوئی ہے۔

نانا نے بڑھ کر گھوڑی کے بھیگے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "مانک اکیلی کیوں آئی، یہ ڈانگ تو جگت کی ہے۔ اسے کہاں چھوڑا ہے؟ چل، مجھے بھی وہاں لے چل۔"

نانا اس سے ایسے باتیں کر رہے تھے جیسے گھوڑی سب کچھ سمجھتی ہے۔ گھوڑی نے بھی ایک دو بار گردن ہلائی لیکن جب وہ اس پر سوار ہونے لگے تو وہ جلدی سے اپنی جگہ سے ہٹ کر گھر میں گھس گئی۔ نانا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ انہوں نے سوچا بغیر کسی وجہ کے گھوڑی ایسا نہیں کر سکتی۔ ضرور کوئی خاص بات ہو گئی ہے۔ اندر آ کر انہوں نے فوراً گھوڑی کی پیٹھ پر سے زین اتاری ڈانگ کو گھر میں چھپایا اور گھوڑی کو صحن میں باندھ دیا۔

اتنے میں باہر سے کسی نے پکارا۔ "بابا جاگ رہے ہو کیا؟" آواز چوکیدار کی تھی وہ کھلے دروازے میں داخل ہو چکا تھا۔

"کیا بات ہے؟" نانا بولے۔

چوکیدار نے کہا۔ "گھوڑی کسی سوار کے بغیر آتی دیکھ کر میں پیچھے پیچھے چلا آیا خیر تو ہے؟"

"مجھے بھی اس بات پر تعجب ہو رہا ہے۔" نانا نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے مانک بٹی کے گھر سے بھاگ آئی ہے۔"

"لیکن بابا ندی میں تو سخت طوفان ہے۔ گھوڑی اکیلی تو آ ہی نہیں سکتی۔" چوکیدار بولا۔

نانا چونک گئے کہیں جگت ندی پار کرتے ہوئے ڈوب تو نہیں گیا؟ لیکن وہ ایسے موسم میں یہاں آنے کے لیے نکلا کیوں؟ اگر کوئی غیر معمولی واقعہ ہوتا تو گھوڑی مجھے وہاں ضرور لے جاتی مگر مانک تو اس وقت سکون سے کھڑی تھکان اتار رہی ہے معاملہ واقعی پیچیدہ ہے۔

پوری رات نانا واقعات کے تانے بانے بننے کی کوشش میں پہلو بدلتے رہے۔ علی الصبح گاؤں کا پولیس افسر اور رتیا کے تین چار پولیس والے جگت کی تلاش میں نانا کے ہاں آئے۔ تب نانا کو تمام واقعات کا علم ہوا۔ انہیں یہ سن کر اطمینان ہوا کہ جگت، لکھن کو قتل کر کے فرار ہو گیا ہے۔ پولیس نے گھر کی تلاشی لی اور پولیس کو نانا کی اس بات کا یقین کرنا پڑا کہ گھوڑی کسی سوار کے بغیر دھرم پور آئی تھی کیونکہ چوکیدار گواہ تھا۔

پولیس افسر نے جاتے ہوئے نانا سے کہا۔ "اس کا مطلب ہے اب ہمیں آپ کے نواسے کی تلاش کرنا پڑے گی۔ طوفان میں بہت سے لوگوں کے بہہ جانے کی بھی اطلاع ملی ہے۔"

پولیس افسر سے یہ بات سن کر نانا کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ کچھ بولے نہیں۔ ویسے ان کا دل کہہ رہا تھا کہ میرا جگت اس طرح آسانی سے مرنے والا نہیں ہے۔ ابھی تو اسے اور تین دشمنوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔

مگر دوپہر تک پورے گاؤں میں یہ بات پھیل گئی کہ لکھن کو قتل کرنے کے بعد فرار ہوتے ہوئے جگت

ندی میں ڈوب گیا اور اب پولیس اس کی لاش تلاش کر رہی ہے۔ سوہن سنگھ کے ہاں آنے والے بھی اس بات کا تذکرہ کرتے اور جوان بیٹے کی اس ناگہانی موت پر افسوس کر کے چلے جاتے۔

لکھن کی موت کے بعد جب ویرو بھی خاموش خاموش رہنے لگی تو وہ لوگ یہ سمجھے کہ دیور کی موت کے دکھ نے اسے گم صم کر دیا ہے۔ حالانکہ بات یہ نہ تھی سب کا خیال تھا کہ جگت نے پرانی دشمنی کی بنا پر لکھن کو قتل کیا ہے لیکن ویرو اس خیال سے بھی متفق نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جگت کو معلوم ہو گیا تھا کہ لکھن نے ویرو کی عزت پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی اس لیے اس نے اسی رات لکھن کا کام تمام کر دیا۔ یہ بات وہ کسی سے کہہ نہ سکتی تھی۔ دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی کہ جگت کو اتنی چھوٹی عمر میں گھر بار چھوڑنا پڑا۔ اب آخر وہ کیا کرے گا؟ اس کے ماں باپ کا کیا ہوگا؟ لیکن جب اس نے سنا کہ جگت ندی میں ڈوب گیا تو اس کی آنکھوں کے بند بھی ٹوٹ گئے۔ آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ مگر اس کا دل اس بات کو مانتا نہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس نے جگت کو جو تعویذ دیا ہے وہ اس کی حفاظت کرے گا۔

جگت کے گھر میں اداسی نے ڈیرے ڈال دیے تھے کئی رشتہ دار اظہار ہمدردی کے لیے آئے اور ایک دن اچانک جگت کے نانا کو آتا دیکھ کر وہ سب حیران رہ گئے۔ جس گھوڑی پر جگت فرار ہوا تھا۔ اسی پر سوار ہو کر مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے جگت کے نانا چلے آرہے تھے۔ گاؤں کے لوگ یہ دیکھ کر حیرانی سے ٹھٹک گئے کہ جگت جس گھوڑی کو لے کر نکلا تو وہ اب اس کے نانا کے ساتھ تھی۔

سوہن سنگھ کے گھر میں سب کو چپ چپ دیکھ کر وہ ناراض ہونے لگے۔ آتے ہی انہوں نے کہا۔

"موت دشمن کے گھر ہوئی ہے سوگ یہاں کیسا؟ تم سارے کے سارے منہ لٹکائے کیوں بیٹھے ہو؟"

"آپ تو جانتے ہی ہیں کہ لکھن کے قتل کے سلسلے میں پولیس کو جگت پر شبہ ہے؟" کسی نے کہا۔

"شبہ......!" نانا زور سے ہنسے اور لوگ سمجھے کہ ابھی وہ پولیس کو گالیاں دینے لگیں گے۔ مگر انہوں نے قہقہہ ختم کر کے کہا۔ "پولیس کو تو شبہ ہے نا' لیکن مجھے تو یقین ہے میں تو سینہ ٹھونک کر کہتا ہوں کہ جگت کے علاوہ کوئی اور یہ کام کر ہی نہیں سکتا۔"

ذرا دیر کی خاموشی کے بعد پھر کسی نے کہا۔

"پولیس جگت کی لاش تلاش کر رہی ہے۔"

کہنے والے کی بات نانا نے اپنی گرج دار آواز سے کاٹ دی۔

"خبردار! ایسے الفاظ منہ سے نہ نکالنا۔ پولیس میرے نواسے کی عمر بھی کم نہیں کر سکتی۔"

پھر انہوں نے جگت کی ماں سے کہا۔

"بیٹی تو کیوں رونی صورت بنائے بیٹھی ہے۔ جا اندر جا کر سب کے لیے لسی لا۔"

باپ کے یہ الفاظ سن کر بیٹی کو یقین سا ہونے لگا کہ اس کا بیٹا جگت ضرور زندہ سلامت ہے۔ مگر لسی پلانے والی بات اس کے جی کو نہ لگی۔ پھر بھی وہ بے دلی سے اٹھ گئی تو نانا نے کہا۔

"اور ہاں آج لسی میں شکر ذرا زیادہ ڈالنا۔ برابر والے گھر میں جو بین ہو رہے ہیں ان کو سنتے ہوئے لسی پینے کا مزہ دگنا کرنے کے لیے میں خاص طور پر رتیا آیا ہوں۔" نانا کی یہ بات سن کر جگت کی ماں کا دل دہل گیا وہ سوچنے لگی انتقام کا جذبہ انسان کو کتنا بے درد بنا دیتا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جگت کے نانا کے الفاظ ایک ہفتے کے اندر اندر لوگوں کو سچ معلوم ہونے

لگے۔ کیونکہ ندی سے یوں تو کئی لاشیں ملیں لیکن ان میں جگت نہیں تھا۔ اب پولیس کو پھر سے جگت کو زندہ پکڑنے کے لیے ہوشیار رہنے کے احکام صادر کیے گئے۔

خان پور ضلع کے پولیس افسر سنہا کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ رتیا کے فوجدار کا اس نے ٹرانسفر کر دیا تھا۔ سنہا کا خیال تھا کہ اگر جگت زندہ ہے تو اپنے گھر والوں سے ملنے ضرور آئے گا۔ یہی سوچ کر اس نے جگت اور اس کے نانا کے گھر پر خفیہ پولیس کے آدمی لگا دیے تھے۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے۔ سنہا کی پریشانی بڑھتی گئی کیونکہ جگت کے اس طرح فرار ہو جانے سے پولیس کے نام کو بٹہ لگ رہا تھا۔ ایک دن رتیا سے ایک امید افزا پیغام آیا کہ پپلی وال پٹیل کے گھر ہونے والی چوری کے سلسلے میں پولیس نے ایک شخص کو چوری کے مال کے ساتھ گرفتار کر لیا ہے۔ مجرم کا نام حکم سنگھ ہے۔ مار پیٹ کی گئی تو اس نے اپنے دو اور ساتھیوں کے نام بھی بتائے ہیں۔ ایک نام ہنومان سنگھ اور دوسرا نام جگت کا ہے۔ یہ تینوں اس چوری میں شریک تھے۔ نشاندہی پر ہنومان کو گرفتار کر لیا گیا۔ پھر خود ہی بولا۔

"اس کا مطلب ہے یہ دونوں ملے ہوئے ہیں۔ تبھی اس روز ہنومان کو چھڑانے کے لیے جگت خود چل کر آیا تھا۔ میں اس وقت بے وقوف بن گیا مگر اب کے اسے سبق سکھاؤں گا۔" یہ سوچ کر سنہا فوراً رتیا پہنچنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

رتیا گاؤں کے تھانے میں سب ڈیوٹی پر حاضر تھے۔ مگر پھر بھی سکوت سا چھایا ہوا تھا کہ اس خاموشی کو توڑتی ہوئی ایک آواز سنائی دی۔

"جلدی بول...... کہاں ہے جگت؟"

ہنومان کے گالوں پر یکے بعد دیگرے زوردار دو تھپڑ رسید کرتے ہوئے سپرنٹنڈنٹ سنہا چیخا۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ چہرہ زیادہ غصہ کی وجہ سے مسخ سا ہو گیا تھا اور آواز ایسی تھی جیسے کوئی پٹھان سود کی وصولی کر رہا ہو۔ مگر ہنومان چپ تھا۔ اس کے دونوں طرف پولیس والے ڈنڈے ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔ ہنومان نے تھپڑ کھا کر جبڑے پر ایسے ہاتھ پھیرا جیسے اس نے سہنا کے تھپڑوں کی گرد جھاڑ دی ہو۔ سہنا سے ہنومان کی یہ خاموشی اب برداشت نہ ہوئی اور اس نے اپنی تمام تر قوت یکجا کر کے ایک زوردار مکا ہنومان کے پیٹ میں مارتے ہوئے کہا۔

"آج میں تجھ سے سارے راز اگلوا کر چھوڑوں گا۔"

"اوہ۔" ہنومان کے منہ سے صرف ایک لفظ نکل سکا۔ پھر وہ پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے دبائے دوہرا ہو کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر سنہا نے محسوس کیا کہ اس نے غلط جگہ پر زیادہ زور سے مکا مار دیا ہے۔ پھر بھی اس کو اس بات پر افسوس ہو رہا تھا کہ ہنومان سے اپنے سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے انتظار کرنا پڑے گا۔ اس وقت تک جب تک ہنومان ہوش میں نہ آجائے۔

کافی مار پیٹ کے باوجود جب ہنومان نے کچھ قبول نہ کیا تو سنہا نے اسے پیار سے پھسلانا چاہا۔

"دیکھو ہنومان! حکم سنگھ نے چوری کا اقرار کر لیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ تم اور جگت اس چوری میں شریک تھے۔ اگر تم جگت کا پتا بتا دو تو میں تمہیں اس جرم سے بری کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کل سے پہلے وہ تمہارے ساتھ گتے میں بھی تھا نا؟"

ہنومان، حکم کا نام سن کر غصہ آ گیا۔ وہ چیخا۔ "حکم سنگھ جھوٹ بکتا ہے پھر بھی اگر تم مجھے چوری کے جرم کی سزا کرانا چاہتے ہو تو میں آج تمہارے سامنے نہ ہوتا جگت کے پاس ہوتا۔"

’’یہ بات ہے؟‘‘ سنہا نے ہنومان کے بال پکڑ کر اس کا سر زور سے دیوار سے ٹکرایا اور غصہ سے پیر پٹختا وہاں سے چلا گیا۔ سنہا کے جانے کے بعد ہنومان نے اپنے سر میں چوٹ والی جگہ پر ہاتھ لگایا تو اس کا ہاتھ گرم گرم خون سے بھر گیا۔ اس نے ہاتھ کو سامنے لا کر گھورا اور غصہ سے دانت بھینچ کر بولا۔

’’حکم سنگھ غدار، یاد رکھیو، باہر نکل کر یہی ہاتھ تیرے خون سے نہ رنگے تو نام ہنومان نہیں۔‘‘

سنہا نے ہنومان کو چھ ماہ کی سزا کروا دی اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرنے والا ہر دن ہنومان کے انتقام کی آگ بھڑکاتا رہا۔

سنہا کے لیے جگت کی یہ پراسرار گمشدگی بڑی پریشان کن تھی۔ سارے علاقے کا کونا کونا پولیس نے چھان مارا لیکن جگت کا کہیں پتا نہ چلا سکا۔ سنہا کی اس امید پر بھی اس اوس پڑ گئی تھی کہ جگت ضرور کسی جگہ ڈاکہ ڈالے گا یا چوری کرے گا اور اس طرح سامنے آ جائے گا۔ مگر دن گزرتے جا رہے تھے اور سنہا کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بار بار یہی سوال اس کے سامنے آتا کہ آخر جگت کہاں گیا اور کیوں چھپ کر بیٹھا ہے؟ کافی سوچ بچار کے باوجود بھی سنہا اس معمہ کو حل نہ کر سکا۔ مگر ایک بات جو اس کی سمجھ میں آئی تھی وہ یہ کہ جگت بزدل یا بے وقوف نہیں ہے۔ لکھن کو اس نے پرانی عداوت کی بنا پر ہی مارا تھا پھر بھی اس کے دو دشمن ابھی جیل میں زندہ ہیں۔ جگت یقیناً ان کی تاک میں بھی ہوگا۔ لیکن پھر سنہا کو دوسرا خیال آیا کہ ابھی تو جگت کے ان دونوں دشمنوں کی سزائیں پوری ہونے میں پورے سات مہینے باقی ہیں تو کیا اس ساری مدت میں جگت مفرور ہی رہے گا؟ سنہا سوچتا رہا مگر اسے اس سوال کا جواب نہیں مل سکا۔ وہ جگت کے بارے میں جتنا سوچتا اتنا ہی معاملہ الجھا نظر آتا۔

اسے اب تک یاد تھا جب جگت پہلی مرتبہ تھانے آیا تھا اور ہنومان کی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش میں کامیاب ہو گیا تھا سنہا نے اس کی معصومت اور جیالے پن کو دیکھ کر اسے پولیس میں بھرتی ہونے کا مشورہ دیا تھا۔ کاش اسی وقت سنہا اس لڑکے کے باتوں کے پھیر میں نہ آیا ہوتا۔ اب وہی لڑکا ایک مفرور قاتل کی حیثیت سے پولیس کے نام کو بٹہ لگا رہا تھا اور پولیس مجبور تھی۔ وہ اسے کہاں ڈھونڈتی؟ کوئی بھی نہ جانتا تھا کہ وہ کہاں چھپ گیا ہے؟

☆......❀......☆

اس زمانے میں لاہور کا ملٹری کیمپ زوروں پر تھا۔ بھرتی ہو کر نئے نئے رنگروٹ آتے۔ وہ جس قسم کے ہوتے اسی قوم کی رجمنٹ میں ان کو بھیج دیا جاتا۔

کیپٹن ہربنس سنگھ سکھ رجمنٹ کا کیپٹن تھا۔ چار ماہ پیشتر سکھ رجمنٹ میں جو نئے رنگروٹ بھرتی ہو کر آئے تھے ان کی ٹریننگ کیپٹن ہربنس کے ذمہ تھی۔ چار ماہ کی سخت محنت اور جانفشانی کے بعد آج سکھ رجمنٹ کے اس دستے کو پہلی مرتبہ رائفل ٹریننگ کے لیے طلب کیا گیا تھا سارے جوان ملٹری کیمپ میں ایک طرف قطار میں کھڑے تھے ان میں زورآور سنگھ بھی تھا۔ آج زورآور سنگھ بہت خوش تھا اور قطار میں سب سے آگے کھڑا تھا۔ پچھلے چار ماہ کے دوران کی اس سخت زندگی سے وہ کبھی کبھی بے زار سا بھی ہوا مگر اس بے زاری کا کسی کو کبھی احساس نہ ہونے دیا۔ جب بھی اس کا دل یہاں سے گھبراتا وہ کیپٹن ہربنس سے صرف یہ ضرور پوچھتا۔

’’صاحب بندوق چلانا کب سکھایا جائے گا؟‘‘

اور کیپٹن ہمیشہ ہنس کر کہتا۔ ’’زورآور تو بہت بے صبرا ہے یار، مگر تیری رپورٹ اچھی ہے جلدی ہی ہاتھ میں رائفل بھی آ جائے گی۔‘‘

آج جب زورآور سنگھ نے پہلی مرتبہ بندوق کی لبلبی دبا کر گولی چلائی تو گولی کا دھماکہ جانے کتنی دیر تک اس کے کانوں میں گونجتا رہا اور پھر آواز ہوا میں تحلیل ہوتی گئی۔ دور بہت دور...... مگر اس آواز کے ساتھ ہی ساتھ زورآور سنگھ کا دل بھی میلوں دور ایک گاؤں میں جا پہنچا۔ اسے وہ رات یاد آئی جب اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر وہ گاؤں سے بھاگا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اس کی منزل کہاں ہے۔ اس وقت تو اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ راستے میں بہنے والی روپالی ندی میں بارش کی وجہ سے قیامت خیز طوفان آیا ہوا ہے۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا موسلا دھار بارش تھی اور راستے میں حارج طوفانی روپالی ندی اپنی زد میں آنے ولی ہر شے کو بہا کر لے جانے کو تیار تھی۔ یہ دیکھتے ہوئے وہ کنارے پر ہی رک گیا تھا مگر قدم پیچھے ہٹانے پر بھی موت کا سامنا تھا اور سامنے بڑھنے پر بھی۔ ندی کی طوفانی لہروں میں موت کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ مانک اپنے سوار کے حکم کا انتظار کر رہی تھی۔ کڑکتی بجلی اور موسلا دھار بارش میں آ کر اس نے فیصلہ کر ہی لیا اور گھوڑی کو ایڑ لگائی۔ ’’جے گرو نانک‘‘ کا نعرا لگا کر اس نے گھوڑی کو پانی میں اتار دیا۔

وہ جتنا آگے بڑھ رہا تھا پانی کے بہاؤ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا جیسے پانی کے تیز ریلے کہہ رہے ہوں کہ جگت واپس چلا جا۔ تجھے دوسرے کنارے کے بجائے ہم دوسرے جہاں میں بھیج سکتے ہیں۔

لیکن جگت نے اپنا ارادہ نہ بدلا اور اچانک اس کا ہاتھ گلے میں پڑے ویرو کے دیے ہوئے تعویذ سے ٹکرایا۔ دوسرے ہی لمحہ اس کے جسم میں ایک انجانی طاقت آ گئی۔ اس نے تعویذ کو اپنے جسم سے چپکا لیا اور تیز نظروں سے سامنے کے کنارے کو دیکھا۔ گھوڑی زور زور سے سانسیں لے رہی تھی۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے مگر آگے بڑھنے کے لیے برابر زور لگا رہی تھی۔ پانی بار بار اس کا راستہ روک رہا تھا۔ جگت مانک سے لپٹ گیا آدھا راستا طے کر لینے کے بعد جگت اور مانک کا حوصلہ پھر جواب دینے لگا۔ موت قریب سے قریب تر ہونے لگی۔ مگر جگت آخری سانس تک مقدر آزمانا چاہتا تھا۔ وہ پانی کے زوردار ریلوں میں تقریباً آدھا میل تک گھسٹتے رہے۔ اچانک جگت کا سر ایک پیڑ کی شاخ سے ٹکرا گیا۔ اس نے شاخ مضبوطی سے پکڑ لیا اور سہارا ملتے ہی ہوش بجا ہوئے تو دیکھا کہ سامنے والا کنارہ بالکل ہی قریب تھا۔ یہاں پانی کا دباؤ بھی کم تھا۔ مانک آسانی سے نکل کر سامنے کے کنارے پر کھڑی ہو چکی تھی۔

جب جگت نے زمین پر پاؤں رکھا تو ایسے لگا جیسے نئی زندگی مل گئی ہو۔ اس نے پیار سے مانک کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو مانک نے بھی اس کے شانوں میں گردن ڈال دی وہ گھوڑی پر سوار ہو کر آگے بڑھا ہر طرف پانی ہی پانی تھا اور اندھیرے میں کچھ سجھائی نہ دیتا تھا لیکن جگت کا رات ہی رات زیادہ سے زیادہ سفر طے کر کے دور نکل جانا ضروری تھا۔

دو تین فرلانگ ہی آگے جا کر اس نے عجیب سی آواز سنی اور ذرا غور کرنے پر اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ آواز ریلوے انجن کی ہے۔ یہ جانتے ہی اس نے مانک کی رفتار تیز کر دی۔ اب اسے یقین تھا کہ قدرت اس کی مدد کرنا چاہتی ہے۔ ذرا آگے جا کر ایک مال گاڑی کھڑی نظر آنے لگی جگت تیزی سے مانک کو اس کے قریب لایا۔

اندھیرے میں گھوڑی پر سفر کرنا خطرناک تھا۔ اس نے اپنی ڈانگ مانک کے ساتھ باندھ دی اور خود مال گاڑی کے ایک ڈبے میں سوار ہو گیا۔ فوراً ہی انجن

کی سیٹی سنائی دی۔ جگت نے مانک کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "مانک نانا کے ہاں پہنچ جانا۔"

مال گاڑی چل پڑی تھی۔ جگت نے مڑ کر دیکھا تو گھوڑی مخالف سمت میں تنہا ہی چلی جا رہی تھی۔ جگت نے سکون کا سانس لیا اسے مانک پر پیار آ گیا۔

سورج کی پہلی کرن نے اور لوگوں کی آوازوں نے جگت کو جگا دیا۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔ دیکھا تو گاڑی لاہور کے ریلوے یارڈ میں تھی۔ موقع غنیمت دیکھ کر فوراً وہ وہاں سے کھسک گیا۔

پولیس کی نگاہ سے چھپ کر وہ دو دن تک روزگار کی تلاش میں گھومتا رہا۔ اس سال پنجاب کے تمام دریاؤں میں سیلاب آ جانے سے تباہی مچ گئی تھی۔ سیکڑوں گاؤں ڈوب گئے تھے۔ انسانوں اور جانوروں کی لاشوں کے ہر طرف ڈھیر تھے۔ بے گھر ہونے والے لوگوں کے لیے ریلیف کیمپ کھل چکے تھے۔ فنڈ جمع کیے گئے تھے لیکن جگت کے لیے کسی کیمپ میں آسرا لینا مناسب نہ تھا۔ اسے پتا تھا کہ پولیس اس کی تلاش میں وہاں بھی پہنچ جائے گی۔

وہ ابھی اسی فکر میں تھا کہ کیا کرے اسے ایک مرتبہ پھر وہی پوسٹر نظر آیا جس میں جوانوں کو فوج میں بھرتی ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ پوسٹر وہ گاؤں میں بھی دیکھ چکا تھا۔ جگت کو یہی ایک آسان اور محفوظ راستا نظر آیا اور وہ چھاؤنی کی طرف چل پڑا۔

فوجی چھاؤنی میں جب اس سے نام معلوم کیا گیا تو ایک دم سے زبان پر جگت سنگھ آیا مگر اسی لمحے اس نے زبان کو روک لیا اور بولا۔ "زور آور سنگھ"

اس نے بتایا کہ میرا گھر اور گھر کے تمام افراد سیلاب کی نذر ہو گئے ہیں اور اب دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ اسی لیے میں نے فوج میں بھرتی ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔

خاکی پتلون، خاکی قمیص اور سر پر پگڑی اس لباس میں وہ بالکل بدلا ہوا نظر آنے لگا۔ اب داڑھی اور مونچھ کے بال بھی اگنے لگے تھے۔ فوجی خوراک، ورزش اور چڑھتی جوانی نے اسے بدل کر رکھ دیا لیکن اندر سے وہ اب بھی جگت تھا۔ جس کے دل میں انتقام کی آگ اب بھی سلگ رہی تھی۔ اسے پولیس کی نظر سے چھپے رہنے کے علاوہ فوج سے صرف ایک دلچسپی اور تھی اور وہ یہ کہ یہاں بندوق چلانا آسانی سے سیکھ لے گا۔ آج اس نے پہلا دھماکا کیا تھا پہلی مرتبہ بندوق چلائی تھی اور یہ اس کی دیرینہ آرزو کی ابتدا تھی۔

"زور آور...... زور آور......!" اس کے دوست بڑی دیر سے اسے آوازیں دے رہے تھے۔ لیکن ماضی کی یاد کے راستے پر وہ اپنا نقلی نام بھی کھو چکا تھا۔ آخر بچن سنگھ نے جب قریب آ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تب وہ خیالوں کی دنیا سے نکلا۔ دوست جانتے تھے کہ یہ دورہ اس پر اکثر پڑتا رہتا ہے۔ اور وہ اکثر خیالات میں کھو جاتا تو اس کے ساتھی سوچ لیتے کہ اسے گھر کے لوگ یاد آ گئے ہیں۔ اس وقت بھی دوست یہی سمجھے اور بچن سنگھ اس کا دھیان بٹانے کے لیے بولا۔

"زور آور، یار ہم تجھے کب سے پکار رہے ہیں۔ آج تو نے پہلی بار بندوق چلائی ہے۔ اس لیے دوستوں کو پارٹی دینی ہوگی۔" بچن یہ بات کر ہی رہا تھا کہ ہشیار سنگھ اور کرپال بھی آ گئے۔ "یار تُو تو ہم سے بھی آگے نکل گیا۔"

یہ کہہ کر چاروں دوست "جے گرو نانک" کہتے ہوئے ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

چار ماہ اور گزر گئے۔ زور آور اب حوالدار بن گیا تھا۔ دوستوں کا خیال تھا کہ وہ بہت جلد میجر بھی بن

جائے گا۔ وہ سب کا لاڈلا تھا اس لیے کہ نشانے کا بہت سچا تھا۔ ایک مرتبہ کرنل خوشونت نے کہا۔ "زور آور اگر تم اسی طرح محنت سے تعلیم لیتے رہے تو پانچ سال میں میرے مقام تک پہنچ جاؤ گے۔"

لیکن زور آور کرنل یا جنرل بننا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے تو صرف تین دشمنوں کے چہرے تھے جن کو ختم کر کے وہ باپ دادا کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ وہ زور آور سے دوبارہ جگت بن کر دشمن پر ٹوٹ پڑنا چاہتا تھا۔ اس کے پاس وقت بھی کم رہ گیا تھا۔ بس ایک مہینہ...... آٹھ مہینے کے انتظار کے بعد یہ آخری مہینہ تھا۔ رام اور شیام کی سزا پوری ہونے ہی والی تھی۔

ہر اتوار کے روز فوج کے جوان اپنے رشتہ داروں اور احباب کو خطوط لکھتے اور جواب آنے پر شوق سے خود پڑھتے اور دوستوں کو بھی سناتے۔ کیمپ میں آنے اور جانے والے خط سنسر بھی کیے جاتے۔ ایک زور آور ہی ایسا تھا جس نے اتنے عرصے میں کبھی کوئی خط نہ لکھا۔ کئی بار اس کا جی چاہتا کہ وہ ماں باپ کو خط لکھ کر ان کی خیریت معلوم کرے لیکن پھر خیال آتا کہ سنسر کی وجہ سے اس کی اصلیت ظاہر ہوگئی تو؟ آخر کافی سوچ بچار کے بعد اس نے بچن سے ہنومان کے نام خط لکھوایا۔ اس نے کہا۔ "بچن! دنیا میں میرا کوئی رشتہ دار تو ہے نہیں بس بچپن کا ایک دوست یاد آتا ہے۔ اسے خط لکھ کر اپنی فوجی ترقی کی خبر سنانے کو میرا جی چاہتا ہے۔"

بچن نے لکھا۔

"دوست ہنومان! تجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ میں فوج میں ملازم ہوگیا ہوں۔ شاید اب تک تو مجھے بھول گیا ہو لیکن بچپن میں جب میں اپنے ماموں کے گھر سے تیرے گاؤں آتا تو ہم ساتھ ہی کھیلتے تھے۔ گاؤں کے کنوئیں پر جاتے اور بھوت پریت کی باتیں کرتے رہتے۔ یاد آ گیا تجھے؟ ہاں تو میں یہاں حوالدار بن گیا ہوں اور تھوڑے عرصے میں شاید میجر بھی بن جاؤں۔ وہاں موجود دوستوں کے بارے میں لکھنا تیرا جواب ملنے پر میں چھٹی لے کر تھوڑے دن کے لیے آؤں گا۔ خط کا جواب جلد دینا تیرا یار زور آور سنگھ۔ جے گرو نانک۔"

خط پوسٹ کر دیا گیا۔

ہنومان چھ ماہ کی سزا بھگت کر جیل سے رہا ہو چکا تھا۔ جب وہ جیل میں تھا اس دوران اس کی بوڑھی ماں بیٹے کا نام لیتے لیتے مر گئی اور گاؤں کے چار آدمی اس کی آخری رسوم ادا کر آئے۔ جب ہنومان کی ماں مرنے لگی تھی اس وقت سنہا نے جیل میں پیغام بھیجا تھا کہ اگر ماں کا منہ دیکھنا ہو تو ایک روز کی چھٹی مل سکتی ہے لیکن اس شرط پر جگت کا پتا بتا دو۔"

پیغام سن کر ہنومان کی آنکھوں میں پہلی بار آنسو بھر آئے اور اس نے تلخی سے کہا۔ "اپنے سنہا صاحب سے کہہ دو کہ میرے پاس جگت کا پتا نہیں ہے اور اگر ہوتا تب بھی میں یہ سودا منظور نہ کرتا۔"

ماں مر گئی اور وہ اپنی ماں کی آخری رسوم میں بھی شریک نہ ہو سکا لیکن اس کے بعد حکم سنگھ سے انتقام لینے کا جذبہ اور شدت اختیار کر گیا۔ اس نے جیل سے رہائی کے بعد سب سے پہلے حکم کو تلاش کیا لیکن حکم سنگھ، ہنومان سے ڈر کر کسی رشتہ دار کے ہاں دوسرے گاؤں جا چکا تھا۔

سنہا صاحب نے پولیس کو حکم دے رکھا تھا کہ جیل سے چھوٹنے کے بعد بھی ہنومان کی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھی جائے۔ پوسٹ آفس کے حکام سے بھی کہہ دیا گیا تھا کہ جگت کے والد کا خط آئے تو پہلے پولیس کو اطلاع دی جائے۔

سنہا' رتیا گاؤں کے راؤنڈ پر آیا ہوا تھا اور اس وقت رتیا تھانے کے لان میں فوجدار کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ پوسٹ مین چوکی کی ڈاک دینے کے لیے آیا ڈاکیے کو سامنے دیکھ کر سنہا کو کچھ خیال آیا۔

"کیوں بھئی سوہن سنگھ کی بھی کبھی چٹھی آتی ہے یا نہیں؟" سنہا نے پوسٹ مین سے پوچھا۔

"نہیں صاحب! آتی تو آپ کو نہ بتاتا؟" ڈاکیہ بولا۔ پھر ذرا رک رک کر اس نے کہا۔

"لیکن صاحب آج ایک عجیب بات ہوئی ہے کہ ہنومان کے نام ایک خط آیا ہے جس پر مہر فوج کی ہے مجھے تو یاد نہیں آتا کہ ہنومان کے نام اس سے پہلے کبھی کوئی خط آیا ہو۔"

یہ سن کر سنہا اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے خط ڈاکیے سے لیا اور اندر کمرے میں چلا گیا۔ جاتے جاتے پوسٹ مین سے کہا۔ "ذرا ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔"

اندر جا کر اس نے خط کھولا تو مضمون پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ خط جگت کا ہی ہے۔ بہر حال وہ کچھ بولا نہیں اور خط نہایت صفائی سے دوبارہ بند کر کے پوسٹ مین کو واپس دیتے ہوئے کہا۔

"جاؤ ہنومان کو دے دو بھلا اس میں کیا ہو گا۔"

مگر پوسٹ میں کے جانے کے بعد اس نے فوجدار سے کہا۔

"فوراً کسی کو ہنومان پر نگاہ رکھنے کے لیے بھیج دو' اگر ہنومان خط لے کر جگت کے گھر جائے تو سمجھ لینا کہ لکھن کا قاتل دو دن میں گرفتار ہو جائے گا۔"

ادھر اپنے گھر کے دروازے پر پوسٹ مین کو دیکھ کر ہنومان نے ہنس کر کہا۔ "عبدل چاچا! آج اس گھر پر کیسے آئے۔ میرے گھر تو پولیس وارنٹ لے کر آتی ہے ڈاک تو کبھی نہیں آتی۔"

"ہاں بھائی' مگر میں آج تمہارا خط لے کر آیا ہوں۔" پوسٹ مین عبدل نے ایک لفافہ ہنومان کے ہاتھ میں دیا۔

"چاچا غلطی تو نہیں ہو رہی؟ اچھی طرح دیکھ لیا ہے کسی اور کا تو نہیں ہے؟ مجھے تو نہ خط لکھنا اور نہ پڑھنا مجھے کون خط لکھے گا؟"

"مگر یہ خط تیرا ہی ہے بیٹے اس گاؤں میں ہنومان سنگھ کون ہے؟" عبدل نے کہا اور چلا گیا۔

ہنومان نے لفافے کو ہاتھ میں لے کر تعجب سے دیکھا۔ پھر اِدھر اُدھر سے پلٹ کر دیکھا اور اس کے باوجود کہ پڑھنا نہ آتا تھا اس نے لفافہ کھولا مگر مکوڑے ایسے حروف دیکھ کر خود ہنسنے لگا۔ پھر یہ سوچتے ہوئے کہ خط کس کا ہو سکتا ہے اسے اچانک جگت یاد آ گیا۔ اس کے علاوہ مجھے کون خط لکھ سکتا لیکن یہ خط اگر اس کا ہے تو پھر اسے پڑھوانے کے لیے کس کے پاس جانا چاہیے۔ کاش میں نے پڑھنا لکھنا سیکھ لیا ہوتا۔

ہنومان اپنی بے چارگی پر سوچ بچار کے بعد یہ طے کر پایا کہ خط جگت کے والد کے پاس لے جایا جائے۔ وہ فوراً گھر سے نکلا' جلدی میں وہ یہ بھی دیکھنا بھول گیا کہ پولیس کا ایک آدمی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اِدھر وہ روانہ ہوا اُدھر سنہا کو اس بات کی اطلاع مل گئی۔

اور دوسری جانب لاہور کی فوجی چھاؤنی کی سکھ رجمنٹ میں اسی شام تار پہنچا کہ زور آور سنگھ نامی حوالدار پر نگاہ رکھی جائے۔ ہم ایک قاتل کی تلاش میں ہیں اور بہت جلد ضروری کاغذات لے کر وہاں پہنچ جائیں گے۔" تار پر ٹاپ سیکرٹ کی مہر تھی۔

ہنومان نے جگت کے گھر کے دروازے کو کھولا تو صحن میں سوہن سنگھ بیٹھے نظر آئے۔ ہنومان ان کو دیکھ

کر رک گیا۔ جگت کے والد بھی سوچ میں پڑ گئے کہ ہنومان کا استقبال کیا جائے یا نہیں؟ قتل کے بعد جگت کے فرار ہو جانے سے ان کو صدمہ ہوا تھا۔ لیکن وہ اس بات کو دنیا سے منہ چھپانے کا باعث خیال نہیں کرتے تھے۔ مگر جب لکھم چوری کے الزام میں گرفتار ہوا اور اس نے اپنے ساتھیوں میں ہنومان اور جگت کے نام بتائے تو ان کو بہت غصہ آیا۔ کیونکہ یہ خاندان کے نام پر بٹہ تھا۔ قتل' ڈاکہ وغیرہ تو ٹھیک ہے لیکن چوری چکاری راجپوت کو زیب نہیں دیتی۔ سوہن سنگھ کا خیال تھا کہ ہنومان کی صحبت میں رہ کر جگت نے یہ گھٹیا کام کر ڈالا لیکن ہنومان نے پولیس کے ہاتھوں بے پناہ مار پیٹ کے باوجود بھی جگت کا نام نہ لیا تو اس پر وہ ہنومان سے خوش تھے اور اس کے لیے دل میں جگہ بھی تھی۔ ہنومان نے جگت کے باپ کو چپ دیکھا تو بولا۔

"چاچا جی' یہ خط تو پڑھ دو۔ جانے مجھے کس نے لکھ دیا ہے؟" ہنومان نے خط سوہن سنگھ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

جگت کے والد نے ہنومان کو بیٹھنے کو کہا اور خط کھولا۔ جگت کی ماں یہ دیکھنے کو باہر آئی کہ کون آیا ہے مگر ہنومان کو دیکھ کر اس نے بھی منہ پھیر لیا۔ آٹھ ہی مہینے میں جگت کی ماں بدل گئی تھی۔ اس کی کمر' شانے سر اور آنکھیں ہر وقت جھکی رہنے لگی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ گزرے ہوئے دنوں کے زخم اور آنے والے دنوں کے ممکنہ واقعات کے اندیشون کا بوجھ نہ اٹھا سکتی۔ اب اسے بھگوان پر بھی پہلے جیسا یقین نہ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ لمبی سی سانس لے کر کہتی۔

"بھگوان! تو بیٹے دینے کے بعد اس طرح چھین کیوں لیتا ہے؟ آخر تو بھی تو مرد ہے نا۔ عورت کے ارمان اور ماں کی مامتا کی تجھے کیا پروا ہو سکتی ہے؟ تیری کوئی دیوی ہو تو جان سکتی تھی کہ جوان بیٹے کی جدائی کا غم کیا ہوتا ہے۔"

سوہن سنگھ پورا خط پڑھ کر بے چین ہو گئے۔ انہوں نے خط ایک بار پھر پڑھا۔ ہنومان قریب ہی بیٹھا ان کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا۔ ہنومان کا تجسس اور بڑھتا جا رہا تھا مگر سوہن سنگھ اس مرتبہ بھی خط ختم کر کے کچھ نہ بولے۔ ایسا لگتا تھا وہ کچھ سوچ رہے ہوں۔ پھر اچانک ان کا دھیان کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف گیا اور وہ تشویش سے بولے۔

"ہنومان کھڑکی بند کر دے۔" ہنومان نے اٹھ کر کھڑکی بند کر دی۔ اسے اب اپنا شبہ یقین میں بدلتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ خط ضرور جگت کا ہی ہے۔ اس کی بے قراری اور بڑھنے لگی وہ جلد سے جلد یہ جاننا چاہتا تھا کہ جگت نے کیا لکھا اور وہ خود کہاں ہے؟

ہنومان کی بے چینی دیکھ کر سوہن سنگھ نے دھیمی آواز میں اسے خط سنایا پھر وہ ہنومان کی طرف دیکھنے لگے۔ مگر شاید ہنومان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا تھا۔ وہ پیشانی پر اپنی انگلی رکھ کر بولا۔

"چاچا جی مجھے تو بالکل یاد نہیں آتا کہ بچپن میں میرا کوئی دوست زور آور تھا۔ یہ کہاں سے نکل آیا؟ چلو چھوڑو' جانے کس کا ہو گا خط۔ میں تو سمجھا تھا کہ جگت نے لکھا ہے۔"

"ارے عقل کے دشمن یہ اسی کا تو خط ہے۔" سوہن سنگھ مسکرانے لگا۔ سوہن سنگھ کی بات سن کر ہنومان خوشی سے اچھل پڑا اور زور سے بولا۔

"کس کا...... جگت کا؟"

سوہن سنگھ نے اس کے منہ پر تیزی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے پگلے آہستہ بول۔ کسی نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا۔" پھر خود ہی دھیمی دھیمی آواز میں بولے۔

"جگت فوج میں بھرتی ہو گیا۔ یہ خبر تو اچھی ہے مگر تجھے یہ خط لاتے کسی اور نے تو نہیں دیکھا۔" انہوں نے ہنومان سے پوچھا۔

ہنومان بولا۔

"نہیں، میں تو سیدھا یہیں آیا ہوں۔ اگر جگت نے مجھے یاد کر ہی لیا۔ چاچا جی! ایک بار پھر پڑھ کے سنا دو۔ پہلی دفعہ تو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا لکھا ہے۔" ہنومان نے جس پیار سے جگت کے خط کو سننے کی فرمائش کی تھی یہ محسوس کر کے سوہن سنگھ کو بھی ہنومان پر پیار سا آنے لگا۔ اس وقت وہ اس سے بھی جگت کی طرح سمجھنے لگے۔ پھر انہوں نے جگت کی ماں کی آواز دی۔

"جگت کی ماں ذرا یہاں تو آنا۔" جگت کی ماں آئی تو سوہن سنگھ نے اسے خط دکھاتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جاؤ خط آیا ہے ذرا غور سے سننا۔" وہ خط پڑھنے لگے۔ اس دفعہ پڑھتے پڑھتے ان کی آواز بھرا گئی۔ جگت کی ماں بھی زار و قطار رو رہی تھی۔ ہنومان کی آنکھوں میں بھی پانی تیر رہا تھا۔ مگر اس وقت بھی اسے تعجب اس بات پر تھا کہ گاؤں کی اس ان پڑھ بڑھیا کو کیسے پتا چل گیا کہ خط جگت کا ہے؟

تینوں تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ پورے آٹھ مہینے کے بعد بیٹے کی خیریت ملی تھی۔ ماں باپ دونوں کے دل خوشی سے بھرپور تھے۔ لیکن اپنی اس خوشی کا اظہار کرنے میں بیٹے کی جان کا خطرہ تھا۔ آخر ہنومان نے خاموشی توڑی۔ "چاچا جی تم ہی میری طرف سے جواب لکھ دو۔" اس نے کہا۔

"لکھ دو کہ میں بھی فوج میں بھرتی ہونے کے لیے تیرے پاس آ رہا ہوں۔"

"ہنومان اتنی بے قراری مت دکھا ہم لوگوں کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔" جگت کے باپ نے کہا۔ "تو جانتا ہے کہ گھر پر پولیس کی ہر وقت نگاہ رہتی ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ تجھے یہاں آتے کسی نے نہ دیکھ لیا ہو۔"

"کیا؟" ہنومان کو اب صحیح صورت حال کا احساس ہوا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا اور آہستہ سے کھول کر باہر کا جائزہ لیا۔ چند لمحوں بعد جب وہ کھڑکی بند کر کے واپس لوٹا تو چہرے پر فکر کے آثار نمایاں تھے۔ اسے یاد آیا کہ پہلی بار جب اس نے کھڑکی بند کی تھی تو ایک شخص قریب ہی کھڑا ہوا تھا لیکن اس نے توجہ نہیں کی۔ اس مرتبہ پھر اس شخص کو وہاں کھڑا پایا تو ہنومان کو یقین ہو گیا کہ اس کا تعاقب کیا گیا ہے۔ وہ سوہن سنگھ کے پاس آ کر بولا۔ "چاچا جی تمہاری بات ٹھیک ہے ایک شکاری باہر کھڑا ہے اگر کہو تو ابھی جا کر اس کی گردن دبا دوں؟ تا کہ......!"

"تجھے تو بات بے بات لڑائی کی سوجھتی ہے۔ کبھی دماغ بھی لڑا لیا کر۔" سوہن سنگھ ہنومان سے یہ کہہ کر خود کسی سوچ میں گم ہو گئے۔ جگت کی ماں اب تک خاموش تھی۔ اس نے آنچل سے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میری مانو تو بیٹے کو وہیں رہنے دو جہاں وہ ہے۔ اس کا منہ دیکھنے کو نہ ملے گا تو نہ سہی لیکن اب اسے اس بکھیڑے میں واپس لانے کی کوشش مت کرنا۔ اگر تم لوگوں نے اسے انتقام کی راہ پر نہ ڈالا ہوتا تو میرا بہادر بچہ ضرور کوئی بڑا افسر ہی بنتا۔ اب جب بھگوان نے راستا دکھا دیا ہے تو مجھ پر رحم کرو اور اسے اس راستے سے واپس نہ موڑنا۔" یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔

ہنومان کو اس وقت اپنی ماں یاد آ گئی۔ وہ بھی اس

کو اچھا آدمی بننے کا کہتے کہتے دنیا سے سدھار گئی تھی وہ سوچنے لگا۔ "سبھی ماؤں کو اپنے بیٹوں کو بڑا آدمی بنانے کا ارمان ہوتا ہے لیکن جوانی کے جوش میں اکثر بیٹے اپنی ماؤں کے ارمانوں کو کچل کر گزر جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟" یہ سوچ کر اس کا دل بھر آیا۔ اب اسے اپنی ماں اور شدت سے یاد آ رہی تھی۔

سوہن سنگھ اٹھ کر اندر گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر بولے۔ "خط میں نے آگ میں ڈال دیا ہے۔ ہنومان تو بھی بھول جا کہ تجھے کبھی کوئی خط ملا تھا۔"

ہنومان بے چینی سے بولا۔

"جگت کا پتا تو لکھ لیا ہوتا چاچا جی۔"

"وہ تو میرے دل پر نقش ہو گیا ہے ہنومان۔" سوہن سنگھ بولے۔ "اور ہاں، تجھ سے کوئی کچھ پوچھے تو بتانا مت۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو چاچا جی، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے جیل میں کم ظلم تو نہیں سہے ہیں لیکن مجال ہے ایک لفظ جو منہ سے نکالا ہو۔" سوہن سنگھ نے شدت جذبات میں ہنومان کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

"جگت نے لکھا ہے کہ دوستوں کا حال لکھنا، تو شاید اس کا مطلب نہ سمجھا ہو۔ اس نے رام اور شیام کی خبر پوچھی ہے۔" سوہن سنگھ کی بات سن کر ہنومان چونک پڑا۔

"کمال ہے اتنے پر اسرار انداز میں خط لکھا ہے۔"

ہنومان دل ہی دل میں بولا۔ "جگت بہادر ہی نہیں ہوشیار بھی بہت ہے۔ لکھن کے قتل سے پہلے اسی شام کو جگت نے فوج میں بھرتی ہونے کا پوسٹر دیکھ کر کتنے افسوس سے کہا تھا کہ مجھے بندوق چلانی نہیں آتی لیکن اب تو وہ سب کچھ سیکھ گیا ہوتا اور شاید چھٹی بھی اس لیے لے کر آنا چاہتا ہے کہ دشمنوں کو بندوق سے قتل کرے۔"

سوہن سنگھ سوچ رہے تھے کہ اگر ہنومان یہاں زیادہ دیر رہا تو پولیس کے شک کو تقویت پہنچے گی۔ اس لیے انہوں نے ہنومان کو فوراً ہی واپس بھیج دیا۔ پھر جگت کی ماں سے بولے۔ "میں کل تمہارے باپو کے پاس دھرم پور جا کر یہ خوشخبری سناؤں گا۔ ہولی کا تہوار سر پر ہے تم بھی ساتھ ہی چلی چلنا ہمارے جانے پر کسی کو شبہ بھی نہیں ہو گا۔"

میاں کی بات سن کر جگت کی ماں بولی۔

"میں اس وقت تک گھر سے باہر نہیں نکلوں گی جب تک جگت کا منہ نہیں دیکھ لیتی۔ تم باپ ہو تم کیا جانو کہ ماں کے دل میں تو روز ہی ہولی جلتی ہے۔"

☆......❀......☆

دوسری طرف برابر کے گھر میں رام اور شیام جیل سے چھوٹ کر آ چکے تھے۔ دونوں کو سزا تو نو مہینے کی ہوئی تھی مگر جیل میں چال چلن کی اچھی رپورٹ تھی جس کی وجہ سے دونوں کو سزا پوری ہونے سے ایک مہینے پہلے ہی چھوڑ دیا گیا تھا ہولی کا تہوار آ رہا تھا۔ ویرو اس تہوار کو اپنے میکے میں گزارنا چاہتی تھی مگر رام اور شیام اس پر مصر تھے کہ ویرو یہ تہوار سسرال میں ہی گزارے تا کہ ہولی پر دیور اور بھابی رنگ کھیل سکیں۔ ہنسی مذاق ہو سکے، جب گھر میں بھابی ہی نہ ہو گی تو بھلا ہولی کیا ہولی لگے گی؟ ویرو بھی جانتی تھی کہ دیور ہولی کے تہوار پر اس سے کیسے مذاق کریں گے۔ کیسے کیسے ایسے پریشان کیا جائے گا۔ اس لیے وہ رکنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے بہانہ یہی بنایا کہ مجھے میکے گئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں پھر اس مرتبہ گھر میں جوان موت ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے ہولی کی خوشی ہمیں نہیں کرنی چاہیے۔ رہا تہوار پر پکوان وغیرہ کا

سلسلہ تو اس کے لیے رام اور شیام کی چاچی موجود ہے وہ تہوار پر سارا کام سنبھال لے گی۔

چاچی لکھن کے مرنے کی خبر سن کر اپنے بیٹے کے ساتھ یہاں تعزیت کرنے آئی تھی مگر پھر بیوہ چاچی کو موہن نے اصرار کر کے یہیں روک لیا اور واپس جانے نہیں دیا۔ اس کے بعد سے چاچی اسی گھر میں رہ رہی تھی۔ رام اور شیام جیل میں تھے لکھن کے بعد موہن سنگھ کو بھی کھیتوں میں کسی ہاتھ بٹانے والے کی ضرورت تھی۔ ادھر گھر میں کوئی بزرگ عورت رہے تو موہن کو ویرو کے سنبھل جانے کے آثار بھی نظر آتے تھے۔ چاچی کا لڑکا تھا تو جوان مگر کام دھندا کچھ نہ کرتا تھا۔ موہن نے ماں بیٹے کو آسرا دیا اور اس طرح اپنے دونوں مطلب پورے کر لیے۔ اس نے چاچی سے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ ویرو کے اوپر بھی نگاہ رکھے۔ چاچی بھتیجے کی باتیں سن کر اس نتیجہ پر پہنچی کہ جب تک موہن گھر میں رہتا ویرو چاچی سے کھنچی کھنچی رہتی لیکن موہن کے جانے کے بعد ویرو اپنا سارا پیار نچھاور کرتی رہتی۔ اس طرح اس نے دونوں فریق ہی اپنے قبضے میں کیے ہوئے تھے۔ چاچی کو اپنے گھر میں کبھی پیٹ بھر کھانے کو نہ مل پایا تھا مگر موہن سنگھ کے گھر میں رہ کر مزے تھے۔ یہاں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ وہ سب کچھ اپنی مرضی سے کرتی اور ویرو بھی کچھ نہ بولتی۔ اسے تو خود اپنے اس گھر سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ چاچی کا بیٹا بدھی سنگھ جوان ہونے کے بعد بھی عقل سے بالکل کورا تھا۔ پھر بھی چاچی اس کی تعریفیں کرتے نہ تھکتی۔ ویرو چاچی کو پسند تھی۔ وہ اکثر اس سے کہا کرتی۔

''بہو! تیری چھوٹی بہن کے لیے وہ دلہا بالکل تیار ہے۔ اپنے باپ سے جلدی بات کر لے۔''

اب جب ویرو نے میکے جانے کی بات نکالی تو چاچی نے بھی اسے اجازت دلانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ اس کا خیال تھا ویرو وہاں جا کر اس کے لڑکے کے لیے باپ سے ضرور بات کرے گی اس لیے اس کا جانا بہتر ہے۔ اس نے شوہر سے ویرو کو اجازت دلانے کے بعد کہا۔

''بہو! اپنے گھر خوش رہنا اور یہاں کے بارے میں بالکل فکر نہ کرنا۔ میں سب سنبھال لوں گی۔ ہاں پر میری والی بات نہ بھول جانا۔ بدھی سنگھ کی بات اپنی بہن کے لیے باپ سے پکی کر کے آنا۔''

ویرو نے بظاہر تو ہاں میں ہاں ملا دی مگر دل ہی دل میں چاچی اور بدھی سنگھ دونوں پر ہی اسے ہنسی آ گئی اسے بدھی سنگھ کا وہ جملہ یاد آ گیا جو اس نے ویرو کے جانے کی خبر سن کر کہا تھا۔

''بھابی ہمارے گاؤں میں جب عورت میکے جاتی ہے تو واپسی میں بچہ ساتھ لاتی ہے۔ تم بھی لاؤ گی نا؟ پھر وہ مجھے چاچا جی کہا کرے گا۔ ہے نا۔'' یہ کہہ کر وہ خود ہی ہنس پڑا تھا جیسے واقعی وہ بچے کو گود میں سنبھالنے میں شرما رہا ہو۔ ویرو نے سوچا ایسے احمق سے رشتہ کروا کر میں اپنی بہن کی قسمت کیسے پھوڑ دوں؟ مگر پھر بھی خاموش رہی۔ اسے ابھی چاچی سے بہت سے کام لینے تھے۔ وہ چاچی کے بڑھتے ہوئے مراسم سے ابھی سبکدوش بھی نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس لیے چاچی کی ہاں میں ہاں ملاتی رہتی۔ چاچی بھی اس سے خوش تھی۔ اس طرح ویرو کو اگر کوئی کام نکلوانا ہو تو تو وہ آسانی سے نکلوا لیتی۔ ویسے اس کا کام بھی اور کیا تھا سوائے اس کے کہ وہ جگت کی ماں سے مل لیا کرے تاکہ دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔ چاچی اسے کبھی کبھی جانے کی اجازت دے دیا کرتی۔

اب بھی ویرو جب میکے جانے کو تیار ہوئی تو پہلے اس نے جگت کی ماں سے ملنے کی اجازت چاہی

چاچی اس وعدے پر تیار ہو گئی کہ ویرو اپنے باپ سے چاچی کے بیٹے کے چھوٹی بہن کے رشتے کی بات کرے گی۔

ویرو جگت کی ماں کے پاس آئی تو جگت کی ماں کی حالت پہلے سے اور ابتر ہو چکی تھی۔ اس نے کہا۔

''ماں جی! تم نے تو رو رو کر آنکھیں سجا لی ہیں۔ بھگوان پر بھروسا رکھو۔ وہ تمہارے بیٹے کی حفاظت کرے گا۔ کوئی بری خبر تو نہیں آئی نا؟''

ویرو کے سوا جگت کی ماں کو اس انداز سے تسلی دینے والا اور کوئی نہ تھا۔ ماں جی بھی اس سے اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال لیا کرتی۔ ویرو کو اس طرح پوچھنے پر اس نے کہا۔

''بری خبر تو نہیں ہے...... لیکن......!''

ماں جی کو اس کے آگے چپ ہوتا دیکھ کر ویرو نے بے چینی سے پوچھا۔ ''کیا ان کی کوئی خبر آئی ہے؟''

ماں جی کو پتا تھا کہ ویرو کو جگت کی بڑی فکر رہتی ہے لیکن پھر بھی وہ اس سے صحیح حقیقت کیسے بیان کر سکتی تھی۔ کچھ بھی ہو ویرو تھی تو دشمن کے گھر والی مگر جواب کچھ نہ کچھ تو دینا ہی تھا اس لیے بولی۔

''تو نے کہا نا کہ بھگوان اس کی حفاظت کرے گا۔ بس اتنی ہی بات ہے آگے اس کی مرضی۔''

ویرو کو بھی بس خیریت ہی معلوم کرنی تھی۔ اس نے ماں جی کی بات سنتے ہی ایسے آنکھیں موند لیں جیسے یہ خبر سن کر اسے بہت سکون ملا ہو۔ اسے ڈر تھا یہ خوشی کہیں اس کی آنکھوں سے ظاہر نہ ہو جائے اس کے باوجود بھی وہ موتی اس کے گالوں پر ڈھلک ہی آئے وہ تیزی سے اٹھی، ماں جی کے قدموں کو چھوا اور جاتے جاتے بولی۔

''دو دن کے لیے میکے جا رہی ہوں۔ ملنے آئی تھی۔ اب چلتی ہوں۔''

ماں جی نے ویرو کو گلے لگاتے ہوئے دعا دی اور الوداع کہا۔

''ہولی ماما تیرے سہاگ کی حفاظت کرے۔''

☆......❁......☆

جس سال کا ذکر ہے وہ سال 1931ء تھا۔ اس سال ہندوجاتی نے روایتی چیزوں کے بجائے غیر ملکی مال سے ہولی کھیلی۔ چندر شیکھر آزاد اور بھگت سنگھ جیسے لوگ تشدد اور توڑ پھوڑ سے برطانوی حکومت کو بیزار کرنے کے لیے میدان میں آ گئے تھے۔ دوسری طرف تحریک آزادی کو کچلنے کے لیے فرنگیوں نے بھی ظلم و استبداد شروع کر دیے تھے۔ انہی حالات میں جب بھگت سنگھ اور اس کے دو ساتھیوں کو سزائے موت دی گئی تو لوگوں میں غم و غصہ اور بھڑک اٹھا۔

لاہور چھاؤنی کی سکھ رجمنٹ کے جوانوں میں بھی فرنگیوں کے اس فیصلے نے کھلبلی مچا دی۔ ابھی تک جس لباس کو وہ فخر سے پہنتے اور اکڑ کر چلتے تھے وہی لباس اب انہیں کھلنے لگا۔ ان کا خیال تھا کہ اس فوجی تربیت کا استعمال انہیں فرنگیوں کی طرف سے اپنے ہی بھائیوں کے خلاف کرنا ہوگا۔ مادر وطن کی آزادی کے متوالوں کے ہی سینوں میں انہیں گولیاں مارنی ہوں گی۔

یہ بات حکومت تک پہنچ کر خطرناک ہو گئی تھی اور اب فوج میں بغاوت روکنے کے لیے بھی حکومت کو چوکنا رہنا تھا۔

ہولی کی رات کو جگت اور اس کے تین دوست بھی ایسی ہی باتیں کر رہے تھے۔ جگت نے دوست بھی ایسے پسند کیے تھے جو اندرونی طور پر حکومت سے ہی نہیں پورے معاشرے سے غیر مطمئن اور آمادہ بغاوت تھے۔ ہشیار سنگھ باپ سے جھگڑ کر کے فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ بچن سنگھ محبت میں ناکام ہو کر

چھاؤنی آیا تھا اور کرپال کے باپ کی زمین زمیندار نے چھین لی تھی۔ ان چاروں کی دوستی، ہمت اور ذہانت پوری سکھ رجمنٹ میں مشہور تھی۔

جگت تو جس مقصد کے لیے فوج میں بھرتی ہوا تھا اور پورا ہو چکا تھا۔ نشانہ بازی میں اب وہ ماہر تھا مگر رام اور شیام کی رہائی تک اس نے اپنی اصلیت کو چھپائے رکھنا ضروری سمجھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہنومان کا جواب آتے ہی زورآور سے جگت بن جاؤں گا۔ اس کے بعد کیا ہوگا یہ بھی اس نے سوچ رکھا تھا۔ اسے چند ساتھیوں کی ضرورت تھی اور اگر اس کے یہ فوجی دوست اس کا ساتھ دینے پر تیار ہو جائیں تو پولیس، حکومت اور قانون کے خلاف وہ آسانی سے بغاوت کر سکتے تھے۔

اپنے دل کی یہ بات اس نے اب تک اپنے دوستوں سے نہیں کہی تھی لیکن آج جب سب دوست اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے تھے تو جگت نے بھی اپنے دل کی بات دوستوں سے کہہ ڈالی۔ اس کی تجویز سن کر دوستوں نے پوچھا۔

"لیکن فوج سے بھاگ کر ہم کریں گے کیا؟"

اس سوال نے سب کو گہری سوچ میں ڈال دیا مگر بچن نے جگت کی آنکھوں میں اس سوچ کے ساتھ ساتھ چمک دیکھ کر پوچھا۔

"تو ہی کچھ بول زورآور، تیرا دماغ ہم سب سے زیادہ تیز ہے کیونکہ میرا جی تو چاہتا ہے جس روز بھگت کو پھانسی دی جائے اسی روز گوروں کو چن چن کر ہم بھی گولیوں سے اڑا دیں۔"

بچن کی بات سن کر جگت نے کہا۔ "تمہارا اور میرا راستہ شاید الگ ہوگا دوستو! کیونکہ مجھے ابھی اپنا پرانا حساب چکانا ہے۔"

دوستوں نے زورآور کو آج تک اتنا سنجیدہ نہ دیکھا تھا۔ کرپال نے اس کی بات کو مذاق خیال کیا اور بولا۔

"تجھے کس کا حساب چکانا ہے؟ رشتہ دار تو سیلاب کی نذر ہو گئے کیا ان کا انتقام بھگوان سے لے گا؟"

"کرپال یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔" جگت کچھ اور سنجیدہ ہو کر بولا۔

"بھگوان سے میری دشمنی نہیں ہے بھگوان کا تو میں احسان مند ہوں کہ اگر اس رات سیلاب نہ آتا تو شاید آج جیل میں ہوتا۔"

"کیا؟" سب چونک گئے۔

"ہاں، آج میں تم دوستوں کو پوری حقیقت بتاتا ہوں۔ دوستو، تم لوگ جسے زورآور کہتے ہو وہ اصل میں جگت سنگھ ہے۔ جگت سنگھ جگا...... جس پر قتل کا الزام ہے۔ میں بے گھر بار کا آدمی نہیں ہوں۔ میرے ماں باپ، نانا، ماموں کھیت مکان سب کچھ ہے۔ کبھی میرے بڑے بھائی بھی تھے۔" جگت کی آواز سے درد عیاں تھا۔ اس نے کہا۔ "اگر آج بھائی زندہ ہوتے تو ہمارا گھر بھابیوں کی جھانجھروں اور بھتیجوں کے شور سے گونج رہا ہوگا۔ لیکن میرے دونوں بھائی باپ دادا کے انتقام کے قرض کی وصولی میں کام آ گئے۔ ایک بھائی کو دشمنوں نے چھپ کر گولی مار دی دوسرے اس سے بڑے بھائی کو پولیس نے اپنی گولی کا نشانہ بنا دیا اور میں آج تک ان دونوں کے زخموں کو دل سے لگائے زندہ ہوں۔"

جگت کی باتیں سن کر تینوں دوست رنجیدہ ہو گئے۔ پھر بچن بولا۔

"تو اب حساب چکانے میں کاہے کا انتظار ہے زورآور؟"

"زورآور نہیں جگت کہو، جگت۔" جگت نے یاد دلایا۔

"دشمن کتنے ہیں جگت؟"

"تین زندہ ہیں مگر ان میں سے دو ابھی جیل میں ہیں۔ انہی کی رہائی کا انتظار کر رہا ہوں۔ تھوڑے دن ابھی باقی ہیں۔" گفتگو ابھی یہیں پہنچی تھی کہ کوٹھڑی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ چاروں دوست فوراً چپ ہو گئے پھر جگت نے وہیں سے پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں گرو بخش۔" باہر سے آواز آئی۔

جگت نے نام سن کر دروازہ کھولا۔ آنے والا تیزی سے اندر داخل ہوا مگر وہاں دوسرے تین جوانوں کو بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس نے دروازے میں کھڑے کھڑے جگت کو اشارہ کر کے باہر بلایا اور پھر دونوں ایک کونے کی طرف چلے گئے۔ گرو بخش نے جگت کے کان میں سرگوشی کی۔ جس کے بعد جگت اور گرو بخش بڑی دیر تک وہیں کھڑے باتیں کرتے رہے اور جب گرو جانے کے لیے مڑا تو باقی تین دوستوں نے اسے کہتے سنا۔

"کوئی کام ہو تو ضرور بتانا زورآور......!"

☆......❁......☆

اگر ہولی کی رات کو گرو بخش نے جگت کو خبردار نہ کیا ہوتا تو شاید جگت کبھی "جگا ڈاکو" نہ بنتا۔ گرو بخش تھا تو سپاہی لیکن اندر سے وہ حکومت برطانیہ کا کٹر مخالف تھا۔ وہ فوج کو چھوڑ کر بھگت سنگھ کی ٹولی میں شامل ہونے کو تیار تھا۔ لیکن بھگت کا کہنا تھا کہ وہ فوج میں رہ کر ملک کی آزادی کے لیے زیادہ بہتر طریقہ سے خدمت انجام دے سکتا ہے۔ پارٹی نے اسے تین کام سونپے۔ ایک فوج کا گولہ باردو انقلابیوں کو بہم پہنچانا۔ دوسرے آمادہ بغاوت فوجیوں کو حکومت کے خلاف اکسانا اور تیسرے چھاؤنی میں آنے اور وہاں سے جانے والی تمام خفیہ اطلاعات کی جاسوسی کرنا۔

فوجی تربیت کے کیمپ کے اسٹور روم میں تھوڑا سا گولہ بارود ہر وقت رہتا تھا۔ مہینے میں ایک آدھ بار گرو بخش وہاں سے ایک دو دستی بم یا چند کارتوس پار کر لیتا اور باہر پہنچا دیتا۔

چھاؤنی کے کچن کی دیکھ بھال کے لیے ہر روز دو جوانوں کی ڈیوٹی لگتی تھی۔ جس روز گرو بخش کا ٹرن ہوتا وہ ترکاری کے پتوں اور دوسرے کچرے میں گولہ بارو چھپا دیتا اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق وہ مال انقلابیوں کے ہاتھ میں پہنچ جایا کرتا۔

گزشتہ ماہ کچن کی دیکھ بھال کا کام زورآور اور گرو بخش کے ذمہ آیا۔ گرو بخش ہر بار تو اپنے ساتھی کی نظر بچا کر اپنا کام کر لیا کرتا تھا مگر اس مرتبہ زورآور ڈیوٹی پر تھا اس نے یہ چالاکی پکڑ لی ان دونوں کے علاوہ وہاں کوئی اور نہ تھا۔ گرو بخش نے زورآور کی آنکھوں میں دیکھا تو محسوس کیا کہ یہ شخص ابھی کرنل کے پاس جا کر اس کا بھانڈا پھوڑ دے گا اور اس طرح اس کی جان کے ساتھ کچرے سے گولہ بارود تلاش کر کے لے جانے والے انقلابی بھی مارے جائیں گے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے فوراً فیصلہ کیا اور دوسرے ہی لمحہ وہ گوشت کاٹنے کی بڑی چھری لے کر زورآور کی جانب بڑھا لیکن زورآور وہیں کھڑا ہنستا رہا۔ اس کی یہ ادا دیکھ کر گرو بخش ذرا جھجکا وار کرنے سے پہلے اس نے زورآور سے پوچھا۔

"زورآور! تم نے جو کچھ دیکھا وہ تمہارے دل میں ہی رہے گا یا زبان پر آ جائے گا؟"

زورآور نے کوئی جواب نہ دیا وہ ہنستا ہی رہا۔ اب گرو بخش کو بہت غصہ آیا۔ وہ بولا۔ "بات ہنسنے کی نہیں ہے زورآور، زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

"کس کی موت۔" زورآور نہایت بے پروائی سے بولا۔ "تم نے یہ کیسے طے کر لیا کہ اس چھری سے میری موت ہو سکتی ہے۔ مجھے مار کر تم بھاگ نہیں سکتے

اور اگر تمہاری جان گئی تو حکومت مجھے اس کا انعام دے گی ایک غدار کا خاتمہ کرنے کا انعام۔"

"مجھے غدار کہتا ہے۔" گروبخش نہایت غصے سے چیخا اور زورآور پر لپکا۔ زورآور تیار تھا۔ اس نے گروبخش کا اٹھا ہوا ہاتھ پکڑ کر مروڑا اور پاؤں سے اڑنگا مار کر ایک پل میں اسے زمین پر گرا دیا۔ گروبخش کے ہاتھ سے چھری نکل گئی اس نے سوچا شاید زورآور یہی چھری اٹھا کر میرے جسم میں گھونپ دے گا لیکن زورآور نے اس کے برعکس ہاتھ کا سہارا دے کر گروبخش کو اٹھایا اور کہا۔

"زورآزمائی رہنے دو اگر تم چاہتے ہو کہ میرا منہ بند رہے تو تمہیں اپنا منہ کھولنا ہوگا۔"

گروبخش یہ بات سن کر نرم ہوگیا۔ "میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے خاموش رہنے کی قسم کھائی ہے۔"

بات یہیں تک پہنچی تھی کہ اتنے میں باورچی آ گیا اور دونوں کو دیکھ کر بولا۔

"یہ کیا ڈرامہ ہو رہا ہے یہاں؟ میری چھری کہاں ہے؟"

"میں ذرا چھری کا داؤ گروبخش کو بتا رہا تھا۔" زورآور نے بات بنائی۔ "چھری وہ پڑی ہے۔" باورچی کو اب بھی یقین نہیں آیا تھا اس نے کہا۔ "اگر یہ کھیل ہو رہا تھا تو تم دونوں ایک دوسرے کو ایسے کیوں گھور رہے تھے؟"

اب زورآور کو مذاق سوجھا وہ بولا۔ "تمہیں معلوم نہیں میں آنکھوں میں جھانک کر دل کا حال بتا سکتا ہوں۔ اس وقت معلوم کر رہا تھا کہ گروبخش کے دل میں کیا ہے۔ تمہیں دیکھنا ہے یہ کمال۔"

یہ سنتے ہی باورچی فوراً آنکھیں پھیلا کر زورآور کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"بتاؤ تو بھلا اس وقت میرے دل میں کیا ہے؟"

حرام رزق سے بچنے کی تاکید

صفوان بن امیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ عمرو بن قرۃ نے عرض کیا کہ "(یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) میں بڑا بدقسمت ہوں کیوں کہ میں دف بجانے کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے رزق حاصل نہیں کر سکتا، اس لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے اس کی اجازت دیجئے کہ میں فحش کلام کے بغیر گالیا کروں۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں تمہیں ہرگز ایسے بدتر اور ذلیل کام کی اجازت نہیں دوں گا، اے خدا کے دشمن تم جھوٹ کہتے ہو، اللہ تعالیٰ نے تو تمہیں حلال و طیب رزق عطاء کیا ہے، تم نے خود وہ رزق اختیار کیا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام کیا ہے، اس رزق کی جگہ جو اللہ تعالیٰ نے تم پر حلال کیا ہے۔"

(طبرانی)

اس نے کہا۔

"ہوں...... دل میں ہے کہ آج جو مرغیاں پکی ہیں ان میں سے ایک پتیلی بھر کر سالن کس طرح پار کیا جائے یہی سوچ رہے ہو نا؟" زورآور بولا۔

"دھت تیرے کی۔" باورچی جھینپ کر ہنسا اور فوراً وہاں سے باورچی خانے میں چلا گیا۔

گروبخش جواب تک خاموش تھا وہ بھی ہنسنے لگا اور بولا۔

"آج سے ہم دوست ہیں میری صرف اتنی التجا ہے کہ آج کے بعد کبھی مجھے غدار نہ کہنا۔ تم نہیں جانتے اس سرکار کی وفاداری اپنے ملک سے غداری ہے۔"

زورآور ان الفاظ سے گروبخش کی سب حقیقت سمجھ گیا اس نے گروبخش کی پیٹھ تھپتھپا کر کہا۔

"تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں دوست کہ حکومت کا نمک کھاتے ہوئے بھی اب تک اپنا خون سرد نہیں ہونے دیا۔" پھر اس نے کہا۔

"بھگت سنگھ کے چیلے معلوم ہوتے ہو۔"

گروبخش نے مرعوب ہوتے ہوئے چونک کر کہا۔ "زورآور تم تو واقعی دل کا حال معلوم کر سکتے ہو۔"

زورآور زور سے ہنسا۔ "ارے یار تم بھی کس چکر میں آ گئے۔ وہ تو باورچی کو بھگانے کی چال تھی۔ ٹھیک ہے اب باتیں بند تم اپنے کام پر نظر رکھو۔" یہ کہہ کر وہ جانے لگا لیکن گروبخش نے اسے روک لیا اور بولا۔

"ایک بات کہوں زورآور، معلوم ہوتا ہے تمہیں بھی حکومت سے نفرت ہے تو پھر تم ہمارے ساتھ کیوں نہیں مل جاتے؟"

زورآور نے ہنس کر کہا۔ "کیا مجھے بھی چیلا بنانا ہے؟" جواب دینے کی بجائے ایسا سوال کر کے جانے والے زورآور کو گروبخش نے پیار سے دیکھا۔ اس نے سوچا کہ اگر ایسے لوگ ہماری تحریک میں شامل ہو جائیں تو انقلاب بہت جلد آ سکتا ہے۔

☆......❁......☆

چھاؤنی کی ہر خفیہ اطلاع پر نگاہ رکھنے والے گروبخش کو سنہا کے "ٹاپ سیکرٹ" تار کا مضمون دیکھتے ہی سمجھ میں آ گیا کہ زورآور حکومت کا مخالف کس لیے ہے۔ اس نے تار کو دوسرے کاغذات میں ایسے دبا دیا کہ وہ کرنل کو کافی دیر سے ملے۔ اسے معلوم تھا کہ کرنل ایک روز کی چھٹی پر ہے۔ زورآور آسانی سے فرار ہو سکتا ہے۔ وہ فوراً جگت کے کمرے میں آیا۔

اور جب گروبخش نے جگت کو اس تار کی اطلاع دی تو جگت بھی چکرا گیا۔ اسے سب سے پہلے یہی خیال آیا کہ سنہا کو میرا پتا کہاں سے ملا ہوگا؟ پھر اسے خط لکھنے کی اپنی غلطی پر افسوس ہوا۔ اس نے سوچا خط لکھ کر میں نے بڑی بے وقوفی کی کیا ہنومان نے دغا کی ہوگی؟

لیکن یہ سب تو بعد میں سوچنے کی باتیں تھیں۔ اس وقت تو یہاں سے جلد از جلد فرار ہونے کی تدبیر کرنی ضروری تھی۔ اس نے تینوں دوستوں کو اپنی حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا اس وجہ سے ان کو مطلع کیے بغیر یہاں سے چلے جانا مناسب معلوم نہ ہوا۔ اسے اس بات کا سب سے زیادہ افسوس تھا کہ اسے اپنے پروگرام سے چند دن پہلے ہی یہاں سے فرار ہونا پڑ رہا ہے کیونکہ اگر راموا اور شیاموا اب تک رہا نہ ہوئے ہوں گے تو حساب چکانے کا موقع کیسے ملے گا؟ پولیس اور فوج دونوں سے آخر وہ کب تک بچ سکے گا؟

اس نے بچن، ہشیار اور کرپال سے کہا۔ "میرے پاس فرار ہونے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں ہے زندہ رہے تو دوبارہ ملیں گے۔"

جگت کی مشکل نے تینوں دوستوں کو فکر میں ڈال دیا۔ بچن نے کہا۔ "جگت اب تم اکیلے نہیں جا سکتے۔ ہم چاروں ساتھ ہی رہیں گے۔ جئیں گے تو مل کر اور مریں گے تو ساتھ ساتھ۔ تم یہ بتاؤ کہ اب کرنا کیا چاہیے؟ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔"

یاروں کی اس پیشکش سے جگت بہت متاثر ہوا۔ بات سن کر اس کا دل بھر آیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھ جیسے گناہ گار بندے کی بھگوان آخر اس قدر مدد کیوں کر رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ بھگوان میرے گناہوں کی سزا دینے کے لیے یہ کھیل، کھیل رہا ہو؟ یہ باتیں سوچ کر اس نے کہا۔

"دوستو، میں ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کا وعدہ کرتا ہوں اور مرتے دم تک اسے نبھاؤں گا۔ مگر میرا ارادہ سب سے پہلے اپنے دشمنوں کا صفایا کرنے اور اس کے بعد حکومت اور قانون سے بغاوت کر کے ڈاکہ گیری کرنے کا ہے۔ میں چھوٹا تھا تب سے میرے نانا کہا کرتے تھے کہ میں بڑا ہو کر "ڈاکو" بنوں گا۔" جگت کی زبان سے یہ بات سن کر اور اس کا عزم دیکھ کر تینوں دوست ایک ساتھ بولے۔

"ہمیں یہ بھی منظور ہے۔"

اس کے بعد وہ سب فرار ہونے کی تیاریاں

کرنے لگے۔ ہرایک نے ایک ایک بندوق اور زیادہ سے زیادہ کارتوس ساتھ لیے۔ فرار سے پہلے جگت جب گروبخش سے ملنے گیا تو اس نے پھر ایک مرتبہ جگت سے کہا۔ ''اگر تم انقلابیوں کے ساتھ ملنا چاہو تو میں ابھی تمہارے لیے روپوش ہونے کا بندوبست کرسکتا ہوں۔''

مگر جگت نے اس سے کہا۔ ''گروبخش ہم چاروں یہاں سے جارہے ہیں اور اب تک تمہارے جتھے میں شامل ہونے کا فیصلہ نہیں کیا۔ لڑنا ہم بھی چاہتے ہیں لیکن ہماری جنگ پولیس سے ہوگی اور اپنے طریقے سے۔ تم صرف اتنا کرو کہ آج کے دن کسی کو ہمارے فرار کا پتا نہ چلے۔ ہولی کی چھٹی ہم نے لے ہی رکھی ہے اس لیے جب تک ہمارے بارے میں معلوم نہ کیا جائے کسی کو کچھ بتانا مت۔''

گروبخش، جگت کی باتیں سن کر ذرا مایوس تو ہوا مگر اس نے کہا۔ ''زورآور جب بھی تمہارا ارادہ بدلے تو ہمارے لاہور کے خفیہ اڈے سے ضرور رابطہ قائم کرنا۔ میں تمہیں اس کا پتا دیتا ہوں۔ ہمارا کوڈ ورڈ ''طوفان'' ہے۔''

گرو کا پیار دیکھ کر جگت نے اسے گلے سے لگایا اور بولا۔

''گرو میرا اصلی نام جگت سنگھ ہے اب زورآور کو بھول جاؤ اور ہاں سنو ہم فوج کی ایک جیپ بھی ساتھ لے جارہے ہیں۔''

یہ کہہ کر جگت تیزی سے مڑا اور باہر نکل کر تینوں دوستوں کے پاس پہنچ گیا جو گاڑی اسٹارٹ کیے اس کا انتظار کررہے تھے۔ گروبخش نے کمرے ہی میں جیپ کے روانہ ہونے کی آواز سنی تو کھڑکی سے جھانکا۔ چاروں دوست ملٹری بیرکوں سے گزرتے ہوئے الوداعی سلام کرتے نظر آرہے تھے۔

قیامت کی نشانیاں

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے لوگو! کیا میں تمہیں قیامت کی نشانیاں نہ بتاؤں؟'' پس حضرت سلیمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے کھڑے ہوکر عرض کیا۔ ''میرے ماں باپ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر قربان یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں بتائیے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے نمازوں کو ضائع کرنا، خواہشات کی طرف مائل ہونا، مال داروں کی تعظیم کرنا۔''

(ابن مردویہ، درمنثور)

(حوالہ کتاب: مقالات ذوّاریہ، ترتیب، سید فضل الرحمٰن)

بیرکس کے بیچوں بیچ بڑی سڑک پر جیپ دوڑتی رہی۔ ان کی رفتار میں ذرا سی کمی آئی جب وہ اس موڑ پر پہنچے جہاں ملٹری کیمپ کی حدود ختم ہوتی تھی اور گروبخش نے سوچا کہ شاید ان کا ارادہ بدل گیا ہو اسے اپنا دل ڈوبتا سا لگنے لگا۔ مگر اتنی دیر میں جیپ تیز رفتاری سے مڑ گئی۔ گرو سوچنے لگا کہ یہ چاروں جس راستے پر گئے ہیں بھگوان کرے یہ راستا انہیں منزل تک لے جائے۔

جیپ گرو کی آنکھوں سے اوجھل ہوچکی تھی۔ اس نے چوبیس گھنٹے تک جگت اور ساتھیوں کے فرار کی بات پوشیدہ رکھی مگر دوسری رات ابھی آدھی ہی گزری تھی جب خان پور پولیس کا سپرنٹنڈنٹ سنہا معہ مسلح پولیس پارٹی کے سکھ رجمنٹ کی چھاؤنی پہنچا۔ اس نے اپنے مسلح سپاہیوں کو کرنل خوشونت کے دفتر کے باہر روکا اور کرنل کے اردلی کے ساتھ کرنل کے دفتر میں پہنچ کر اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

سپرنٹنڈنٹ سنہا بہت خوش تھا وہ جانتا تھا کہ جگت کی گرفتاری اس کی ترقی کا باعث بنے گی۔ عالم تخیل میں وہ بار بار دیکھتا کہ جگت کے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈالے وہ گاؤں سے گزر رہا ہے۔ گاؤں کے مرد عورتیں جگت کی گرفتاری کے بعد سنہا سے بہت مرعوب ہیں اور اس کے آگے پیچھے مسلح گارڈ چل رہے ہیں۔ سنہا ابھی نجانے کتنی دیر اور انہی خیالوں میں کھویا رہتا کہ دفتر کا دروازہ کھلا۔ اردلی نے کڑاکے دار فوجی سیلوٹ کیا اور کرنل خوشونت دفتر میں داخل ہوا۔ سنہا نے بھی مودب کھڑے ہوکر پہلے سیلوٹ کیا اور پھر اپنا تعارف کرایا۔

''میں پولیس سپرنٹنڈنٹ سنہا ہوں۔ میرا ٹیلی گرام آپ کو مل گیا ہوگا۔''

''ٹیلی گرام، کب بھیجا تھا آپ نے؟ میں نے تو آپ کا کوئی ٹیلی گرام نہیں دیکھا۔'' کرنل کا لہجہ سپاٹ تھا۔ سنہا نے کرنل کی باتیں سنیں لیکن اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں کرنل سے مخاطب ہوا۔

''کیا کہہ رہے ہیں کرنل صاحب؟ آپ کو میرا کوئی تار نہیں ملا؟ مگر یہ کیسے ممکن ہے میں نے تو تار کل دوپہر روانہ کیا تھا۔''

کرنل خوشونت، سنہا کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر متعجب بھی ہوا مگر پھر سنبھل کر بولا۔

''اچھا اچھا، آپ نے تار کل بھیجا تھا۔ میں کل شام سے چھٹی پر تھا۔ ہولی ہے نا۔ اس وقت بھی ہم کچھ دوست فلم کے آخری شو سے واپس آئے ہیں۔ اسی لیے آپ کو اتنا انتظار بھی کرنا پڑا۔ میں ابھی دیکھتا ہوں۔ تار آیا ہوگا تو انہیں کاغذات میں ہوگا۔'' یہ کہہ کر خوشونت اپنی میز پر رکھی ہوئی ڈاک کی ٹرے دیکھنے لگا۔ ذرا سے کاغذات الٹ پلٹ کرنے سے اسے تار کا ایک لفافہ ملا جو بند تھا۔ اس نے لفافہ ہاتھ میں لے کر سپرنٹنڈنٹ سنہا کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ''مل گیا مگر معلوم ہوتا ہے کسی نے اب تک اسے دیکھا ہی نہیں۔ بند کا بند پڑا ہے کوئی ضروری پیغام بھیجا تھا آپ نے؟'' بات کرتے کرتے اس نے لفافہ کھولا اور تار کا مضمون پڑھنے لگا۔ دو سطروں کا یہ مختصر سا تار خوشونت نے شاید دو دفعہ پڑھا ہوگا۔ پھر اس نے کرسی پر نظریں اٹھا کر ذرا غور سے سنہا کو دیکھتے ہوئے پوری فوجی شان سے کہا۔

''ہوں...... تو آپ کو ہمارے حوالدار زورآور پر شبہ ہے؟'' یہ بات خوشونت نے کچھ اس انداز سے کہی جیسے اسے اس بات کا یقین نہ ہو مگر سنہا جواب تک خاموش تھا ایک ساتھ پھٹ پڑا۔ اس کے لہجے میں ایک التجا کا پہلو تھا سنہا نے کہا۔

''کرنل صاحب ہم پورے آٹھ مہینے سے اس مجرم کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ پرسوں ایک خط اس کے دوست کے نام سکھ رجمنٹ سے پہنچا جس سے ہمیں پتا چلا کہ وہ یہاں ہے اس کا اصل نام بھی زورآور نہیں بلکہ جگت سنگھ ہے۔''

کرنل خوشونت نے سنہا کی باتیں سنیں اور ذرا سوچ کر اس کی بے قراری کی پروا کیے بغیر بولا۔

''مسٹر سنہا، آپ کے پاس اس کا فوٹو ہو تو لائیے میں شناخت کرکے بتادوں گا کہ آپ کا شبہ صحیح ہے یا نہیں؟'' کرنل کی بات سن کر سنہا نے کہا۔

''سر اس کا فوٹو تو میرے پاس نہیں ہے لیکن شاید اس کی ضرورت بھی نہیں۔ آپ مجھے اس کے سامنے لے جائیں پھر خود دیکھ لیجیے گا کہ قاتل کا چہرہ خود بولنے لگے گا کہ وہ قاتل کا چہرہ ہے۔''

کرنل خوشونت کی سمجھ میں سپرنٹنڈنٹ سنہا کی یہ بے کار سی دلیل بالکل نہ آئی۔ پھر بھی اس نے مجبوراً کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ اصرار کرتے ہیں تو آئیے لیکن مجھے یقین

نہیں آتا کہ زوراآور قاتل ہوسکتا ہے۔"

"کرنل صاحب ایک مرتبہ میں بھی اس کے چہرے کی معصومیت دیکھ کر آپ کی طرح دھوکا کھا چکا ہوں۔" ایسی ہی باتیں کرتے کرتے کرنل خوشونت اور سنہا بیرکوں سے گزرتے ہوئے جگت کی کوٹھڑی تک آئے۔ کرنل نے دروازے پر دستک دی مگر دستک کے دباؤ سے دروازہ خود بخود ہی کھل گیا۔ کرنل اور سنہا اندر داخل ہوئے مگر وہاں کوئی نہ تھا۔

پانچ ہی منٹ کے اندر اندر چھاؤنی میں الارم کی آواز گونجنے لگی۔ جوان بیرکوں سے نکل نکل کر دوڑتے ہوئے میدان میں آ آ کر قطار میں کھڑے ہونے لگے۔ چند ہی منٹ میں خوشونت نے قطار کے گرد گھوم کر جوانوں کا معائنہ کیا تو زوراآور اور اس کے تین اور دوست نظر نہ آئے کرنل کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے غصے اور مایوسی کے ملے جلے جذبات سے سر جھکا لیا اور مجبور نظروں سے سنہا کی طرف دیکھا۔ سنہا کا چہرہ بھی فق ہوگیا تھا۔ کرنل سے نظریں ملتے ہی اس نے اپنی نظریں جھکا لیں جگت اسے دوسری بار پھر چکمہ دے گیا تھا۔

خوشونت چلتا ہوا سنہا کے قریب پہنچ کر بولا۔

"آئی ایم سوری مسٹر سنہا لیکن اب وہ صرف آپ کا ہی مجرم نہیں فوج کا بھی مجرم ہے۔ چھاؤنی سے فرار ہوتے ہوئے وہ اپنے ساتھ تین اور جوانوں کو بھی لے گیا ہے۔ پھر بھی وہ ہم سے بچ کر کہاں جائیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں ملٹری انٹیلی جنس کو ابھی اس کی اطلاع بھجواتا ہوں۔"

مگر کرنل خوشونت کے یہ تمام جملے سنہا کے لیے بے معنی تھے۔ وہ تو اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ یہاں سے نکل کر جگت کہاں گیا ہوگا؟

ادھر سنہا کے ذہن میں یہ سوال گونج رہا تھا اور دوسری طرف جگت معہ اپنے تینوں ساتھیوں کے "رتیا" پہنچ چکا تھا۔

ہولی کی اجلی رات تھی۔ دن بھر رنگ کھیل کھیل کر تھکنے کے بعد اب لوگوں کو نیند کی گود میں آرام ملا تھا کہیں دور چلے جانے سے پہلے جگت ایک بار ماں کو منہ دکھانے کی خواہش کے لیے معہ دوستوں کے رتیا آیا تھا۔ دوستوں کو اس طرح جگت کے دشمن کا گھر دیکھنے کا موقع بھی ملا تھا۔ اب جگت کے دل میں دو پوشیدہ تمنائیں تھی۔ ایک تو ویرد کا حال معلوم کرنے اور دوسرے ہنومان کو دغا بازی کا مزہ چکھانے کی۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ اگر ہنومان نے پولیس کو واقعی میرا خط دکھا کر گرفتار کرانے کی کوشش کی ہے تو میں اسے ختم کر کے دم لوں گا۔ یہی سوچتا ہوا جگت اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور دروازے پر آہستہ آہستہ دستک دی۔ جگت کا دل ماں کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھا۔ جگت کی ماں نے یہ سوچ کر دوازہ کھولا کہ جگت کے باپو دھرم پور سے واپس لوٹے ہوں گے لیکن جب باہر دیکھا تو دروازے پر بہت ہی مانوس لیکن انجان سا ایک شخص کھڑا تھا۔ ماں کی آنکھیں جگت کے فوجی لباس سے ہوتی ہوئی اس کے چہرے تک آئیں اور وہیں رک گئیں۔ وہ کچھ بولنے ہی والی تھی کہ آنے والے نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔

الفاظ ماں کی زبان سے تو واپس لوٹ گئے لیکن آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ نکلے۔

اتنی دیر میں جگت نے اپنے تینوں دوستوں کو اندر بلا کر گھر کا دروازہ بند کردیا۔ پھر کمرے میں جا کر وہ اپنی ماں سے بچوں کی طرح لپٹ گیا۔ ماں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ جگت کا چہرہ آنسوؤں سے تر

ایک بادشاہ کی حکایت

ایک بادشاہ گھوڑے سے گر گیا، اس کی گردن کے جوڑ اپنی جگہ سے ہل گئے، ہاتھی کی طرح اس کی گردن بدن میں گھس گئی اس کا سر جب تک بدن گھمایا نہ جاتا نہ گھومتا تھا۔ یونانی طبیب کے علاوہ سارے طبیب اس کے معاملے میں حیران ہوگئے۔ اس نے (علاج کر کے) اس کا سر موڑ دیا اور بدن ٹھیک ہوگیا اور اگر وہ طبیب نہیں ہوتا تو یہ اپاہج ہوجاتا۔ جب بادشاہ تندرست ہوگیا تو وہ طبیب پھر دوبارہ کسی ضرورت سے اس کے پاس آیا۔ اس کم ظرف بادشاہ نے اس کی طرف نظر بھی نہ کی، عقل مند طبیب شرمندہ ہوگیا۔ چپکے سے یہ کہتے ہوئے چلا گیا کہ اگر میں کل اس کی گردن (علاج کر کے) صحیح نہ کرتا تو یہ منہ نہیں موڑ سکتا تھا۔ اس نے غلام کے ہاتھ ایک بیج بھیجا اور کہا اس کو بادشاہ کی گردن پر رکھ دینا۔ بادشاہ کو اس بیج کی بُو سے ایک چھینک آئی، اس کا سر اور گردن جیسی تھی ویسی ہی ہوگئی۔ طبیب کو بہت ڈھونڈا تاکہ اُس سے معافی چاہے اور وہ دوبارہ علاج کرے مگر وہ نہیں ملا۔

فائدہ: احسان کرنے والے کے شکر سے گردن نہ موڑو ورنہ تکلیف اور شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ (الحمد للہ تعالیٰ علی نعمه ظاهرة وباطنة)

(مرسلہ: ظفر سعید...... جھنگ صدر)

ہوگیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان آنسوؤں میں جدائی کی آگ کے ساتھ ساتھ محبت کی ٹھنڈک بھی ہے۔ جگت نے اپنے آنسو بڑی مشکل سے روک رکھے تھے۔ اس نے ماں کا دھیان بٹانے کے لیے جلدی سے سوال کیا۔

"ماں...... باپو اوپر ہیں کیا؟"

"نہیں بیٹے...... وہ تیرے نانا سے ملنے دھرم پور گئے ہیں۔ دروازے پر کھٹکا سن کر میں تو یہی سمجھی تھی کہ وہ واپس آ گئے۔"

"مجھے اس وردی میں دیکھ کر تم پہچان نہیں سکی نا ماں؟"

"بیٹا، تو چاہے کوئی بھی لباس پہن لے ماں تو پہچان ہی لے گی۔ اور میں تو ویسے بھی پچھلے دو دن سے تجھے ایسے ہی لباس میں دیکھ رہی ہوں۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں فوج میں بھرتی ہوگیا ہوں ماں؟" جگت کو تعجب ہوا۔

"کل ہنومان تیرے باپو سے تیرا بھیجا ہوا خط پڑھوانے آیا تھا۔"

"اور اس کے بعد اس نے وہ خط پولیس کے سپرد کردیا۔" جگت نے غصے سے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔

"نہیں، نہیں ہنومان کو دوش نہ دے۔ وہ خط تو اس گھر سے باہر ہی نہیں گیا۔ تیرے باپو نے تو اسی وقت خط چولہے میں ڈال دیا تھا اس کی راکھ بھی میں نے سنبھال کر رکھی ہے۔"

"تو پھر، پولیس کو پتا کیسے چلا؟" یہ کہہ کر جگت سوچ میں پڑ گیا۔

جگت کی بات سن کر ماں کا چہرہ اتر گیا۔ بیٹے سے ملنے کی خوشی آن کی آن میں گم ہونے لگی۔

جگت نے ماں سے دور بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں دیکھنے اور تمہیں اپنا چہرہ دکھانے آیا ہوں۔ دوبارہ ملاقات کب ہوگی بھگوان کو معلوم۔"

یہ سنتے ہی ماں نے جگت کو اپنے قریب کھینچ لیا جیسے بیٹے کو اس سے کوئی چھین رہا ہو۔ پھر بولی۔

"اگر تو بھگوان کو مانتا ہے تو میری ایک بات مان لے۔ اب ان راستوں پر مت جا۔ ۲۱ فوجی لباس

میں تجھے دیکھ کر میرا دل خوشی سے بھرا ہوا ہے۔ کتنا اچھا لگتا ہے۔ تو نہیں جانتا ہر ماں یہی چاہتی ہے کہ بیٹا اچھے آدمی کی حیثیت سے نام کرے پرانے راستوں کو بھول جا۔"

"اب بہت دیر ہوچکی ہے ماں، تجھے پتا ہے کہ اگر میں پولیس کے ہاتھ آ گیا تو مجھے پھانسی دے دی جائے گی۔ اور پھر اب میں اکیلا بھی نہیں میرے یہ تینوں دوست میرے ساتھ فوج چھوڑ کر آئے ہیں۔"

جگت کی بات سن کر ماں کو یاد آیا کہ گھر میں وہ اور جگت اکیلے نہیں ہیں۔ اس نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے اور باورچی خانے میں جا کر ایک پتیلی لے آئی۔

"تو اتنے دنوں کے بعد آیا اور میں تجھے کھانے کو پوچھنا ہی بھول گئی۔ لے یہ گاجر کا حلوہ ہے کھالے میں نے تیرے باپو کے لیے بنایا تھا۔ تجھے تو حلوہ بہت پسند ہے نا۔ بلکہ تم سب مل کر کھاؤ۔ اتنی دیر میں کچھ اور تیار کرتی ہوں میں۔"

ماں کی بات سن کر جگت بولا۔

"نہیں ماں ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے تیرے ہاتھ کا اتنا حلوہ کھانے سے ہی پیٹ بھر جائے گا۔"

چاروں دوستوں نے حلوہ کھایا، پانی پیا اور اتنی دیر میں ماں لسی بھی بنا لائی لگے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہوئے کہ اب چلنے کا وقت ہوگیا ہے۔ جگت نے چلتے چلتے پوچھ ہی لیا۔ "ماں ویرو کیسی ہے؟"

"وہ بے چاری ہمیشہ تیری خیریت پوچھتی رہتی ہے۔ ہولی منانے کے لیے میکے گئی ہے۔ اس کا میاں بھی ساتھ گیا ہے۔" ماں نے بغیر پوچھے موہن کی غیر حاضری کی اطلاع دے دی۔

"اس کا مطلب ہے کہ اس وقت برابر کے گھر میں کوئی نہیں۔" جگت نے سوال کیا۔

ماں اس سوال کا مطلب خوب جانتی تھی مگر نہ بیٹے سے جھوٹ بولنا چاہتی تھی اور نہ سچ بول کر اسے غلط راستے پر لے جانا چاہتی تھی اس لیے فوراً ہی منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں وہاں کی سب خبریں تھوڑی رکھتی ہوں۔"

ماں کے اس جواب سے جگت چوکنا ہوگیا اور سمجھ گیا کہ ماں ضرور کچھ چھپا رہی ہے اپنے شبہ کو دور کرنے کے لیے وہ یہ کہہ کر چھت پر چلا گیا۔

"میری چند چیزیں وہاں رکھی ہیں وہ ذرا لے لوں۔"

اوپر جا کر اس نے دیکھا تو مکان کی چھت پر تین آدمی سو رہے تھے۔ تین چارپائیاں دیکھ کر اس نے سوچا یعنی رام اور شیام واپس آ گئے لیکن یہ تیسرا کون ہوسکتا ہے؟ خیر جو بھی ہو ان کا رشتہ دار بھی میرا دشمن ہی ہوگا نا۔ نیچے تین دوست اور چھت پر تین دشمن۔ جلد ہی جگت نے کچھ فیصلہ کیا اور نیچے آ گیا۔ بچن، ہشیار اور کرپال وہاں سے جانے کے لیے بے قرار ہو رہے تھے۔ ان کو خدشہ تھا کہ باہر کھڑی ہوئی فوجی جیپ کوئی دیکھ نہ لے۔ صبح ہونے سے پہلے ان کا کافی دور نکل جانا ضروری تھا۔

جگت نے نیچے آتے ہی تینوں دوستوں کو نئی صورت حال سے آگاہ کردیا۔

"تم تینوں سامنے والے مکان کے پچھواڑے میں جا کر چھپ جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔"

دوست چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد جگت نے ماں کے قدم چھوئے۔ ماں نے اسے بازوؤں میں تھام کر اٹھایا اور سینے سے لگالیا۔ مگر جگت فوراً ماں سے الگ ہوگیا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ ماں کے آنسو اس

کے ارادے کو کمزور نہ کردیں۔ بیٹے کو جاتا دیکھ کر بوڑھی ماں کے پیر کانپنے لگے۔ اس نے دیکھا کہ جگت گھر سے باہر نکلا اور پھر اس نے دروازہ بھی بند کردیا۔ ماں کو چکر آ گئے وہ وہیں ڈھیر ہوگئی۔

ویرو کے گھر کے پچھلے حصے سے جگت اور اس کے ساتھی چھت پر چڑھ گئے۔ رام شیام اور بدھی سنگھ گہری نیند میں تھے۔ دن بھر خوب خوب ہولی کھیلے تھے۔ پڑوس کی عورتوں کو بھابی بھابی پکار کر ان پر خوب رنگ اڑائے تھے ان کے گالوں پر گلال لگایا تھا۔ اب شاید نیند میں بھی وہ اسی چھیڑ چھاڑ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بدھی نے آج شراب بھی ڈٹ کر پی تھی۔ چنانچہ نشے اور نیند نے اس پر دوہرا اثر کیا تھا۔

تینوں دشمنوں کو ابدی نیند سلا کر جلد از جلد یہاں سے روانہ ہونا تھا۔ جگت نے تینوں دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ تینوں دشمنوں پر ایک ساتھ فائر کرنا ہے۔ قانون سے بغاوت کرنے سے پہلے ہر ایک کے سر ایک ایک قتل کا الزام ضروری تھا تاکہ کوئی دغا نہ کرسکے۔ اسی وجہ سے اس وقت جگت نے اپنے دشمنوں کی موت غیروں کے ہاتھ سے بھی منظور کرلی تھی۔

بچن، ہشیار اور کرپال نے اپنی اپنی بندوقوں کی نالیاں دشمنوں کے سینوں پر رکھ دیں۔ جگت نے ہاتھ اونچا کر کے اشارہ کیا اور لبلبیاں دبا دی گئیں۔ دوسرے ہی لمحے گولیاں دشمنوں کے سینوں میں اتر گئیں اور ان کے منہ سے ایک حرف بھی نہ نکل سکا کہ آتمائیں پرواز کرچکی تھیں۔

چاروں دوست فوراً وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ بندوق کی آواز سن کر لوگ جاگ پڑے تھے۔ کھڑکیاں اور دروازے کھلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ویرو کے گھر میں سوئی ہوئی چچی کو تو پتا نہ چل

aanchal.com.pk
تازہ شمارہ شائع ہوگیا ھے
آج ھی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
آنچل
ملک کی مشہور معروف قلم کاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے مزین ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں جو آپ کی آسودگی کا باعث ہوسکتا ہے اور وہ ہے صرف اور صرف آنچل آج ہی ہاکر سے کہہ کر اپنی کاپی بک کرالیں۔
پرچہ نہ ملنے کی صورت میں دفتر سے رابطہ کریں۔ فون 35620771/2

سکا کہ گولیاں چلنے کی آوازیں کہاں سے آئی ہیں مگر وہ اتنی ڈر گئی کہ اس نے دروازے کو تالا لگا دیا اور خود ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئی۔ اس کے گاؤں میں جب بھی ڈاکو آتے تو وہ اور بدھی اسی طرح کونے میں دبک کر رات گزار دیا کرتے تھے۔ مگر اس وقت اس میں بیٹے کے پاس جانے کی ہمت نہ تھی۔ پھر اس کو اس بات کا بھی اطمینان تھا کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔

جگت اور اس کے ساتھی جیپ میں بیٹھ کر گاؤں سے باہر نکل گئے۔ راستے میں ہنومان کے گھر کے پاس رکے بھی لیکن وہاں تالا تھا چنانچہ ان کو ہنومان سے ملے بغیر آگے بڑھنا پڑا۔ ہنومان کے گھر کے سامنے جیپ رکی دیکھ کر کسی نے پوچھا۔

''ارے بھائی! یہ بندوق کے دھماکے کیسے تھے؟''

''بھئی ہم لوگ شکار کے لیے نکلے ہیں۔''

اور یہ بات گاؤں میں پھیل گئی۔ لوگ مطمئن ہو کر سو گئے۔ ہشیار جیپ چلانے کا ماہر تھا۔ جگت جب پہلی بار فرار ہو رہا تھا اس وقت روپالی ندی میں زبردست طوفان تھا لیکن آج اس میں پتھر تھے۔ ندی پار کر کے جب جیپ آگے نکلی تو ایک شخص یکا یک سامنے آ کر مرتے مرتے بچا مگر جیپ کا دھکا لگنے سے دس پندرہ فٹ دور جا گرا۔ اس نے وہیں سے گالی دے کر کہا۔

''تمہاری...... اندھے ہو کیا؟''

گالی سنتے ہی جیپ رک گئی۔ جگت نیچے اترا اور بجائے اس کے کہ گرنے والے کی خیریت معلوم کرتا اسے گدی سے پکڑ کر کھڑا کیا اور ایک زبردست مکا اس کے منہ پر جڑ دیا لیکن دوسرے ہی لمحے جب جگت کی نظر اس شخص پر گئی تو وہ چونک کر اچھل پڑا۔

''ارے ہنومان تو؟''

ہنومان نے جبڑا سہلاتے ہوئے مکا مارنے والے کو غور سے دیکھا اور بھاگ کر اس کے گلے لگ گیا۔ جگت نے کہا۔

''یار معاف کرنا...... پہچان نہیں سکا۔''

ہنومان نے زور سے ہنس کر کلیجے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''ہاں دوست اب تو فوج کا زور آور ہو گیا ہے۔''

''نہیں ہنومان یہ فوجی کا نہیں ڈاکو کا ہاتھ تھا۔'' جگت بولا۔

''ڈاکو؟'' ہنومان تعجب سے بولا۔

''ہاں ابھی ابھی دشمنوں کا صفایا کر کے آ رہا ہوں۔'' جگت نے کہا۔ ''چل بیٹھ جا جیپ میں ابھی ہمیں اور بہت سی باتیں کرنی ہیں۔''

ہنومان جیپ میں فوراً سوار ہو گیا۔ جگت نے ہشیار سے کہا۔

''تو نے اسے ٹکر مار کے بڑا اچھا کیا ہم جسے تلاش کر رہے تھے وہ ہنومان یہی ہے۔''

جگت کے تینوں دوستوں نے اب ہنومان کو غور سے دیکھا۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ جگت آگے چل کر ابھی اس کی ٹھکائی کرے گا اسی لیے ہشیار نے تو کہہ بھی دیا۔

''اس بوجھ کو ساتھ لینے کی کیا ضرورت ہے یہیں کیوں نہ ختم کر دیا جائے۔''

ہشیار کی بات سن کر ہنومان تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔ جگت نے فوراً وضاحت کی۔

''نہیں دوستو، یہ بات نہیں میں غلطی پر تھا۔ تمہیں بتانا بھول گیا میرے خط کے بارے میں پولیس کو اس نے نہیں بتایا تھا۔'' پھر مڑ کر ہنومان سے بولا۔ ''میں نے تجھے جو خط لکھا تھا اس سے پولیس والے سنہا کو میرا پتا مل گیا اس لیے ہمیں فوج سے فرار ہونا پڑا۔''

یہ سن کر ہنومان بہت رنجیدہ ہوا اور بولا۔ ''اور اس

کا شبہ تو نے مجھ پر کیا؟ کیا ہماری یاری اتنی ہی کمزور ہے؟''

''تو خفا مت ہو میرے یار۔'' جگت نے کہا۔

''تجھے کیا پتا کہ تیرے جانے کے بعد یہاں کیا کچھ ہوا؟'' ہنومان نے کہا۔ ''حکم سنگھ نے دغا کی۔ اس نے میرا اور تیرا نام پولیس کو بتا دیا۔ مجھے سزا ہو گئی۔ تیرا پتا معلوم کرنے کے لیے پولیس کے کتوں نے مجھ پر کیا کیا ظلم نہیں کیے۔ یہاں تک کہ میری مرتی ہوئی ماں کا منہ بھی آخری بار دیکھنے کی اجازت نہ دی لیکن میں نے پھر بھی یہی کہا کہ اگر مجھے جگت کا پتا معلوم ہوتا تب بھی میں نہ بتاتا اور تو نے میری دوستی کی یہ قدر کی؟''

یہ باتیں کرتے ہوئے ہنومان جیسے بے رحم شخص کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ جگت کا دل بھی بھر آیا وہ بولا۔

''مجھے معاف کر دے یار۔ تیرے الفاظ میرا کلیجہ چیرے دے رہے ہیں۔''

پھر اس نے موضوع بدلتے ہوئے ہنومان سے پوچھا۔ ''اس وقت تو کہاں سے آ رہا تھا۔''

ہنومان کا غصہ ابھی نہ اترا تھا۔ وہ طنزاً بولا۔

''پولیس کو تیری اطلاع دینے گیا تھا گرفتار کرانے کی غرض سے۔''

''بس، بس ہنومان...... اب حد ہو گئی۔'' جگت شدت جذبات سے چیخ پڑا۔ اس کے بعد تھوڑی دیر تک سب خاموش رہے مگر ذرا سی دیر بعد ہنومان خود ہی بولا۔

''میں دھرم پور گیا تھا تیرے باپو کو خبردار کرنے کے لیے۔''

''کس بات سے خبردار کرنے؟'' جگت چونکا۔

''رام اور شیام نے ان کا پتا کاٹنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ شام کو میرے سامنے بدھی سنگھ نے نشے میں سارا راز اگل دیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ آج ہی رات کام تمام کرنے کا پروگرام نہ ہو چنانچہ میں فوراً دھرم پور روانہ ہو گیا۔''

جگت نے ہنومان کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔

''بھگوان کتنا مہربان ہے مجھ پر کہ اس نے تجھ جیسے دوست دیے ہیں۔''

جگت نے پھر اپنے تینوں ساتھیوں کا بھی ہنومان سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری ٹولی کے ساتھی ہیں۔''

ہنومان جگت کی یہ بات سنتے ہی بگڑ گیا اور بولا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تو مجھے اس ٹولی سے الگ رکھنا چاہتا ہے لیکن سن لے کہ اب میں اس جیپ سے نہیں اتروں گا۔ تیری ٹولی میں شامل ہونے کی جو بھی فیس ہو بتا دے۔''

''بس ایک قتل۔'' بچن نے کہا۔

''بس، وہ تو اگر تم نہ بھی ملتے تو بھی میں ایک قتل کرنے والا تھا۔'' ہنومان نے یہ کہہ کر زوردار قہقہہ لگایا۔

''کس کا؟'' جگت بولا۔

''حکم سنگھ کا مجھ سے ڈر کر فرار ہو گیا تھا۔ مگر کئی دن کی تلاش کے بعد آج ہی اس کا پتا مل گیا ہے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر میں تمہاری فیس ادا کر دوں گا۔''

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دھرم پور آ گیا۔ سب خاموش ہو گئے۔ جگت نے نانا کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر جیپ کو ایک پیڑ کے نیچے رکوایا اور بولا۔ ''میں ابھی نانا اور باپو سے مل کر آتا ہوں تم لوگ خبردار رہنا۔''

ہنومان بھی جیپ سے اتر گیا اور کہنے لگا۔ ''میں بھی تیرے ساتھ چلتا ہوں جگت۔''

جگت نے نانا کے گھر کے دروازے کو دستک دی

اندر سے آواز آئی۔ ''کون ہے؟''

جگت نانا کی آواز تو پہچان گیا مگر اس نے ہنومان کو جواب دینے کا اشارہ کیا۔ ہنومان بولا۔

''میں ہوں...... ہنومان۔''

ہنومان کی آواز سن کر نانا اور سوہن سنگھ دونوں کو تعجب ہوا کہ ابھی ہنومان ایک گھنٹہ پہلے ہی تو گیا تھا اتنی جلدی واپس کیوں آ گیا؟ نانا نے دروازہ کھولا۔ ہنومان کے ساتھ جگت کو فوجی لباس میں دیکھ کر ان کی نظریں بھی دھوکا کھا گئیں۔ انہوں نے پیٹھ پھیر لی اور کہا۔

''پولیس کے آدمی کو لے کر آدھی رات کے وقت کیسے آنا ہوا ہنومان؟''

جگت نے ہنومان کو آنکھ ماری، ہنومان نے کہا۔

''نانا جی یہ پولیس کا آدمی نہیں فوج کا افسر ہے جگت فوج سے فرار ہو گیا ہے نا اسی کی تلاش میں یہ یہاں آیا ہے۔''

سوہن سنگھ جواب تک دور کھڑے تھے یہ سن کر حیران رہ گئے لیکن نانا خوش ہو کر بولے۔ ''ان کو تلاشی لینے دو جگت یہاں نہیں آیا۔''

اب ہنومان نے دھماکا کیا۔

''جگت یہاں آیا ہے میں نے اپنی آنکھوں سے اس گھر میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔''

ہنومان کی بات سن کر نانا کو بہت غصہ آیا۔ ان کا جی چاہا کہ وہ اس کا گلا گھونٹ دیں۔ غصے سے بولے۔

''کمینے دہری چال چل رہا ہے۔''

اب جگت نے محسوس کیا کہ زیادہ مذاق مہنگا پڑے گا۔ وہ فوراً نانا اور ہنومان کے درمیان آ گیا اور بولا۔

''نانا خفا مت ہو جگت واقعی آ گیا ہے یہ دیکھ تمہارے سامنے کھڑا ہے۔''

''کیا؟'' نانا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر نواسے کو گلے سے لگا لیا۔ ہنومان نے کھڑکی بند کر دی۔ سوہن سنگھ بھی دوڑ کر قریب آ گئے۔ جگت نے نانا سے الگ ہو کر ان کے پیر چھوئے اور کہا۔

''نانا' تین دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار کر آیا ہوں۔''

نانا نے جگت کو قدموں سے اٹھا کر پھر سینے سے لگایا۔ اس کی پیشانی کو چوما اور بولے۔

''شاباش بیٹے شاباش تو نے سارے دشمنوں کو نیست و نابود کر دیا ہے۔''

''نہیں نانا' بڑا ابھی باقی رہ گیا ہے۔ تین میں تیسرا تو اس کے چچا کا بیٹا تھا۔ بڑا گاؤں سے باہر گیا ہے۔'' جگت نے کہا تو نانا بے مزہ ہو کر بولے۔

''اس حرام زادے کو بھی آج ہی باہر جانا تھا؟ ارے اس شادی شدہ کو تو پہلے مارنا چاہیے ورنہ کہیں اس کے گھر بیٹا ہو گیا تو انتقام کا حساب باقی رہ جائے گا۔''

جگت کو یہ الفاظ بہت کھلے لیکن اپنے جذبات کو چھپانے کے لیے باپ کے قدموں میں جھک گیا۔ سوہن سنگھ نے صرف اتنا پوچھا۔

''اپنی ماں سے مل آئے بیٹا؟''

''ہاں باپو لیکن شاہدان کو قتل کے بارے میں پتا نہ ہو۔'' پھر جگت نے جانے کی اجازت طلب کی اس نے کہا۔

''اس وقت تو میں جا رہا ہوں میرے ساتھ فوج سے فرار ہونے والے تین ساتھی اور ہیں۔ ہنومان بھی ہمارے گروہ میں شامل ہو گیا ہے۔ آج سے ہم قانون کے باغی بن رہے ہیں۔'' اس جملے کے بعد جگت نے نانا کی آنکھوں میں پہلی بار آنسو دیکھے نانا

نے رندھی ہوئی آواز میں دعا دیتے ہوئے کہا۔

''جا بچے بھگوان تجھے فتح مند کرے۔ لیکن ایک بات میری ہمیشہ یاد رکھنا۔ غریب کو تنگ نہ کرنا اور امیر پر رحم نہ کرنا۔'' جگت اور ہنومان دروازے کے پاس پہنچے تو نانا نے کہا۔

''ٹھہرنا' گھوڑی اور ڈانگ بھی لیتے جانا۔'' پھر گھوڑی کی لگام جگت کے ہاتھ میں دیتے ہوئے نانا نے کہا۔

''آج سے مانک تیری ہے اور اس کی وفاداری پر بھروسا کرنا۔''

جب یہ باتیں ہوئیں رات کے دو بج رہے تھے۔ نانا اور باپو سے وداع ہو کر پانچوں دوست آن کی آن میں کہیں کے کہیں نکل گئے۔

سپرنٹنڈنٹ سنہا کو اس بات کا سخت صدمہ تھا کہ جگت اس کو چکمہ دینے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ کافی دیر تک تو حواس باختہ سا رہا۔ بالآخر جب سنبھلا تو اس نے خان پور پولیس کو اطلاع دی۔ مجرم فوج سے بھی فرار ہو گیا۔ مسلح پولیس دستے کو فوراً رتیا روانہ کیا جائے۔ مجرم کے ساتھ دوسرے تین فوجی بھی ہیں۔ یہ لوگ رائفلیں اور جیپ لے کر بھاگے ہیں۔ ہوشیار رہو میں دوپہر تک پہنچ رہا ہوں۔

ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ سنہا کو جب اطلاع ملی کہ جگت فوج میں ہے تو اسے پورا یقین تھا کہ اب جگت اس کی مٹھی میں ہے۔ اس نے اسی کامیابی کے یقین کے نشے میں جگت اور اس کے نانا کے گھروں سے پہرہ اٹھا لیا اس طرح جگت کو گھر جا کر کامیابی سے واپسی کا موقع بھی مل گیا اور ساتھ ہی ساتھ اس نے دشمنوں کو بھی ختم کر ڈالا۔

رتیا کے تھانیدار کو علی الصبح جگایا گیا رات کو وہ بندوق کی آوازیں سن کر بھی جاگا تھا اور ریوالور لے کر گھر سے نکلا بھی تھا لیکن راستے ہی میں چوکیدار نے بتا دیا تھا کہ چند فوجی آئے تھے اور شکار کر کے چلے گئے۔ یہ سن کر تھانے دار شکار کے شوقینوں کو گالیاں بکتا ہوا گھر جا کر پھر سو گیا تھا کیونکہ گاؤں کی سرحد کے قریب کچھ جانور پائے جاتے تھے چنانچہ وہاں کبھی کبھار شکاری شکار کھیلنے نکل آیا کرتے تھے لیکن بندوق سے گولیاں چلنے کی آوازیں اتنے قریب سے کبھی سنائی نہ دی تھیں۔ تھانے دار نے سوچا کہ شکاریوں نے گاؤں کے اندر داخل ہو کر شکار کیا ہو گا۔

لیکن جب علی الصبح خان پور سے آئے ہوئے پولیس دستے نے تھانیدار کو سنہا کا پیغام سنایا تو اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ اسے فوراً رات کے فوجی اور گولیاں چلنے کی آوازیں یاد آ گئیں۔ اس نے سوچا انہوں نے کس کو شکار بنایا؟ تھانے دار نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ پھر وہ کانپ گیا۔

''غضب ہو گیا۔'' دوسرے ہی لمحے وہ تیار ہو کر فوراً گھر سے نکلا۔

راستے میں جگہ جگہ گلیوں کی لالٹینیں دھیمے دھیمے جل رہی تھیں۔ گاؤں کا چوکیدار بھی یہ سوچ کر بیٹھا بیٹھا نیند کے جھونکے کھا رہا تھا کہ اب کاہے کی چوکیداری صبح ہو رہی ہے۔ تھانے دار نے اسے ایک لات رسید کی اور چلایا۔

''نمک حرام' سو رہا ہے۔''

چوکیدار نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ اس ناگہانی حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ تھانے دار نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''کیا تو نے رات کو شکار کے لیے آنے والے فوجیوں کو دیکھا تھا؟''

تھانے دار کے لہجے سے غصہ مترشح تھا۔ چوکیدار

پولیس پارٹی کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ تھانے دار اسے ایک لات اور لگا کر آگے بڑھ گیا اور سیدھا جگت کے گھر کے پاس آ کر رکا۔ آس پاس نگاہ دوڑائی لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ اس نے کان لگا کر جگت کے گھر سے کسی قسم کی آواز سننی چاہی لیکن وہاں بھی خاموشی تھی۔ تھانے دار دبے پاؤں گھر کے پیچھے تک گیا اور چکر لگا کر مایوس لوٹ آیا۔ اس نے خان پور سے آنے والے انسپکٹر کو دیکھا تو اس نے تھانے دار کو دروازے پر دستک دینے کا اشارہ کیا۔

تھانے دار نے دروازے پر دستک دی لیکن جواب نہیں ملا تو اس نے دروازے پر زور سے لات ماری۔ دروازہ آدھا کھل گیا۔ آنے والوں کو یہ باتیں پراسرار لگ رہی تھیں۔ پولیس پارٹی کو وہیں رکنے کا اشارہ کر کے تھانے دار اور انسپکٹر اندر داخل ہوئے تو صحن ہی میں جگت کی ماں بے ہوش پڑی نظر آئی۔ مگر انسپکٹر نے پہلے اندر جا کر کمرہ اور باورچی خانہ دیکھا پھر ریوالور ہاتھ میں لیے چھت پر بھی گیا لیکن مایوس واپس آ گیا۔ اب تھانے دار نے آواز دی۔

''اے بڑھیا اٹھ جا جلدی سے۔''

لیکن وہ اب بھی ویسی ہی پڑی تھی۔ اب دونوں نے گھبرا کر بڑھیا کو جھنجوڑا تو پیشانی کے ایک کونے میں خون جما ہوا نظر آیا۔ زمین پر بھی خون کا دھبہ پڑا تھا۔ انہوں نے بڑھیا کو اٹھا کر چارپائی پر لٹا دیا۔ تھانے دار اسے ہوش میں لانے کے لیے پانی لینے گیا تو ایک کونے میں اس نے چار پیالے دیکھے۔ پیالوں کے کنارے پر لسی کے جھاگ اب تک نظر آ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر جلدی سے پانی لے کر وہ واپس آیا۔

پانی ماں جی کے منہ پر ڈالا گیا تو اسے کچھ کچھ ہوش آیا۔ وہ کچھ بڑبڑائی، آنکھیں ذرا کھلیں لیکن فوراً ہی پھر بند ہو گئیں۔ اسی حالت میں برابر بیٹھے ہوئے انسپکٹر کے ہاتھ پر اس نے ہاتھ پھیرا اور ڈوبی ہوئی آواز میں بولی۔

''جگت، میں تجھے نہیں جانے دوں گی بیٹے۔''

بڑھیا کی بات سن کر یہ دونوں بھی ساری بات سمجھ گئے کہ رات کو جگت یہاں بھی ضرور آیا ہوگا اور اسی کے جانے کے غم سے بڑھیا بے ہوش ہو گئی ہوگی۔ وہ دونوں فوراً اٹھ گئے۔

''جگت آ کر چلا گیا انسپکٹر۔'' تھانے دار نے باہر آ کر کہا۔

''وہ اپنا وار کر گیا اور تم سوتے رہ گئے۔'' انسپکٹر نے خفا ہو کر کہا۔

تھانے دار شرمندہ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ انسپکٹر نے غصے سے کہا۔

''اب کھڑے کیوں ہو۔ سامنے والے گھر میں معلوم کرو کہ اندر کوئی زندہ بھی ہے یا نہیں؟''

انسپکٹر کا حکم سن کر تھانے دار نے اب موہن سنگھ کے گھر کے دروازے پر دستک دی مگر وہاں بھی اندر سے جواب نہ ملا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے مریل سی آواز میں پکارا۔

''موہن سنگھ گھر میں ہے؟ دروازہ کھولو۔''

چاچی اب تک کانپ رہی تھی۔ آدھی رات کو ہونے والے دھماکے اسے اب بھی ڈرائے ہوئے تھے۔ دستک سن کر اس نے سوچا کہ دروازہ کھولنے کے بجائے اوپر جا کر رام اور شیام کو جگائے کہ اتنے میں پھر تھانے دار کی آواز آئی۔

''میں تھانے دار ہوں، جلدی دروازہ کھولو۔''

(ان شاءاللہ باقی آئندہ ماہ)